متفرق

مقالات ومضامین

مولانا ندیم الواجدی
(مدیر ماہ نامہ ترجمانِ دیوبند)

نام کتاب: متفرق مقالات ومضامین
تالیف: مولانا ندیم الواجدی
صفحات: ۲۳۶

فہرست

مقدمہ

علم وقلم کا حسین امتزاج ''مولانا ندیم الواجدی''

فاروق اعظم قاسمی
ریسرچ اسکالر، جواہر لعل نہرو یونی ورسٹی، نئی دہلی

''دارالکتاب'' کا نام سنتے ہی ممکن ہے لوگوں کا ذہن ''دارالکتاب، ممبئ'' کی طرف منتقل ہو جائے لیکن یہاں دیوبند کے ''دارالکتاب'' کا تذکرہ ہو رہا ہے بلکہ اس کے مسند نشین، ممتاز صاحب علم وقلم اور ناشر کتب کے علمی، قلمی اور ادبی کارناموں کا مختصر خاکہ پیش کیا جا رہا ہے۔

محنت ولگن، عزم وارادہ اور جدوجہد جیسے الفاظ اور ''پدرم سلطان بود'' کا بے معنی نعرہ سن سن کر تو کان بوجھل ہو چکے ہیں۔ تصورات کو حقائق کا لباس پہنانے والے خال خال ہی نظر آتے ہیں تاہم قحط الرجال کے اس دور میں بھی ایسے اشخاص کمیاب تو ہیں نایاب نہیں۔

مولانا ندیم الواجدی نے اعلیٰ خاندان اور علمی گھرانے میں پیدا ہونے کے باوجود خوش فہمیوں میں مبتلا ہونے کے بجائے ہمیشہ خود اعتمادی کا دامن مضبوطی سے تھامے رکھا۔ مولانا کی تعلیمی زندگی نہ صرف یہ کہ زیادہ خوش حالی کی زندگی نہیں تھی بلکہ انہوں نے بہت سی دشواریوں سے گزر کر منزل مقصود تک رسائی حاصل کی ہے یہی وجہ ہے کہ دشواریوں کے بعد آسانیاں آئیں۔ فضل الٰہی سے آج وہ بہت سی نعمتوں سے بہرہ ور ہیں۔

مولانا موصوف نے طالب علمی کے دور سے ہی مضمون نگاری کی شروعات کر دی تھی اور فطری صلاحیت و استعداد کی بنا پر کم عمری ہی میں ان کی ایک شناخت قائم ہوگئی اور ملک و بیرون ملک کے وقیع رسائل و جرائد میں انتہائی اہتمام کے ساتھ مضامین بھی شائع ہونے لگے۔ ان کی اسی صلاحیت کی وجہ سے سید محبوب رضوی مرحوم، سید ازہر شاہ قیصر مرحوم اور مفتی ظفیر الدین مفتاحی کی علمی مجالس میں برابر دو نوجوان اور نو وارد قلم کاروں کا تذکرہ ہوتا، ان کی عمر کے ساتھ قلم کی تیز رفتاری کو دیکھ کر حال کے جھروکے سے روشن مستقبل کی پیشین گوئی کی جاتی اور کہا جاتا کہ: ''اگر یہ دونوں اسی طرح لکھتے رہے تو مستقبل کے نامور قلم کار و مصنفین میں ان کا شمار ہوگا۔'' ان دونوں نوجوانوں میں ایک مولانا ندیم الواجدی ہیں اور دوسرے مولانا

بدرالحسن قاسمی۔ الحمدللہ! ان بزرگوں کے حسین خواب کی تعبیر دو معتبر اسلامی قلم کاروں کی شکل میں آج ہمارے سامنے موجود ہے۔

یوں تو مولانا واجدی نے ہر فن کو محنت سے حاصل کیا اور برتا لیکن عربی زبان و ادب سے ان کا تعلق گہرا ہے۔ کتابی شکل میں اب تک ان کے جو علمی نقوش سامنے آئے ہیں، ان میں بیشتر کا تعلق عربی زبان ہی سے ہے، تاہم اردو زبان و ادب میں بھی کافی مہارت رکھتے ہیں اور مختلف موضوعات پر ان کے قلم سے نکلے ہوئے مقالات کا ایک بڑا ذخیرہ ملکی و غیر ملکی رسائل واخبارات میں پھیلا ہوا ہے اور اپنی خاموش زبان سے کتابی دنیا میں پناہ لے کر درازیٔ عمر کی دعا مانگ رہا ہے۔

سر دست اردو کے حوالے سے ان کے قلم نے جو گل افشانیاں کی ہیں وہ زیر قلم ہیں۔ یہ تو پہلے ہی آچکا ہے کہ قلم ندیم صاحب کا بچپن ہی سے ندیم رہا ہے، تاہم پندرہ روزہ ''مرکز'' دیوبند سے تحریر میں مہمیز لگی۔ انہوں نے پوری تندہی کے ساتھ اس کی ترتیب و تدوین اور اشاعت میں کام کیا اور ساتھ ہی اپنے اعلیٰ ذوق اور عمدہ انتخاب کا مظاہرہ بھی۔ پھر اسی محنت و مشق نے انہیں امام غزالیؒ کی شہرۂ آفاق اور بین الاقوامی حیثیت کی حامل کتاب ''احیاء العلوم'' کے اردو ترجمے کا حوصلہ بخشا اور 1980 سے 1987 تک سات سال کی طویل مدت میں زبردست تگ و دو اور شب و روز کی عرق ریزی کے بعد اپنی نوعیت کا یہ عالمی کام ان کے ہاتھوں انجام پایا اور ان کے اس علمی، قلمی اور تحقیقی کام کو پوری دنیا میں پسندیدگی کی نظر سے دیکھا اور سراہا گیا اور یہ بھی حقیقت ہے کہ مولانا کے اس علمی کام نے انہیں محقق و مصنف کے ساتھ ساتھ ناشر و تاجر بھی بنا دیا۔

شاید اس طویل علمی سفر کی تکان کی وجہ سے وہ اسلامی کتب کی نشر و اشاعت اور اس کی تجارت میں زیادہ مصروف ہو گئے۔ پھر وہ تقریباً ربع صدی تک اپنے اشاعتی ادارے ''دار الکتاب'' کے استحکام اور اس کو وسعت دینے میں لگے رہے اور آج ماشاء اللہ ملکی سطح پر یہ ادارہ امتیازی حیثیت اور نمایاں مقام رکھتا ہے اور دینی و اسلامی کتابوں کی اشاعت اور ساتھ ہی عربی و اردو زبانوں کی توسیع و ترویج میں پوری طرح مشغول ہے۔ وہ تو اچھا ہوا کہ بیس پچیس سال کی

طویل خاموشی اور آرام کے بعد ''مرغ نے دی اذاں اور سویرا ہوا'' اور مولانا ندیم الواجدی نے 2000 میں ماہ نامہ ''ترجمانِ دیوبند'' کا اجرا کر کے گویا قلم کا دوسرا صور پھونکا اور ان کے قلم کاری کی نشاۃ ثانیہ ہوئی۔

مولانا واجدی اب بہت سی دشواریوں کو زیر کر کے بہت آگے بڑھ چکے ہیں اور ان کا وقفہ استراحت ختم ہو چکا ہے۔ معاش کے حوالے سے ماشاء اللہ اب وہ انتہائی آسودہ حال ہیں اس لیے ان کا اشہب قلم ایک بار پھر پورے طور پر رواں دواں اور جوان دکھائی دینے لگا ہے اور یہی نہیں بلکہ بہت سی رنگینیوں کو لے کر نمودار ہوا ہے۔ ان کے علمی سفر کا مرحلہ پہلے سے کہیں زیادہ جاذب نظر، زیادہ تیز رفتار اور زیادہ پر وقار نظر آ رہا ہے۔ ویسے تو مولانا پہلے ہی سے زود نویس تھے لیکن اب زیادہ نویس بھی ہو گئے ہیں۔ اسی کا اثر ہے کہ گزشتہ ایک ڈیڑھ سال سے فی ہفتہ ان کے چار مضامین بڑی پابندی کے ساتھ شائع ہو رہے ہیں۔ اس پر ''ترجمان دیوبند'' کی ترتیب علیحدہ اور مختلف کتابوں پر مقدمات و پیش لفظ وغیرہ مستزاد ہیں۔

ان کی زیادہ نویسی کا اندازہ اردو صحافت میں ایک نئے اسلوب کی پیدائش ہے، بسا اوقات اخبار کے ادارتی صفحے کے پورے خطے پر مولانا واجدی کے علم و تحقیق کے ساتھ حروف و الفاظ کی وسعت اور حکمرانی ہوتی ہے اور قابل ذکر بات یہ ہے کہ ان کے اسلوب کی اقتدا بھی ہونے لگی ہے۔ کاروبار اور دیگر ذمے داریوں کے ساتھ اس قدر جد و جہد سے مولانا ندیم الواجدی کا مقصد غالباً ماضی کی قضا اور گزشتہ ایام کا تدارک ہے۔

جہاں تک ان کے اسلوب کا تعلق ہے تو اس سے ان کے قارئین کرام بہتر طریقے پر واقف ہیں کہ تحریر عالمانہ پختگی، محققانہ رنگ اور ادبی چاشنی لیے ہوئے ہوتی ہے۔ جس موضوع پر وہ قلم اٹھاتے ہیں اس کا احاطہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں، ان کی تحریر میں جہاں علمی، دینی اور اصلاحی پہلو غالب ہوتا ہے وہیں ان میں ادب و تحقیق کی چاندنی بھی بکھری نظر آتی ہے۔ مولانا موصوف کی اسی فنی مہارت کا نتیجہ ہے کہ محمد طفیل مرحوم کا مشہورِ عالم اردو رسالہ ''نقوش'' لاہور نے جب پہلی مرتبہ بلکہ آخری مرتبہ بھی ہزار ہزار صفحات پر مشتمل تیرہ جلدوں میں سیرت رسول کے خصوصی نمبر شائع کرنے کا ارادہ کیا تو انتہائی کہنہ مشق اور فن کے ماہر قلم کاروں کا

انتخاب عمل میں آیا جن میں ایک نام مولانا ندیم الواجدی کا بھی تھا۔اسی طرح ماہ نامہ ''الرشید'' ساہیوال، لاہور کے ہزاروں صفحات پر مشتمل ''دارالعلوم دیوبند نمبر'' میں بھی ان کا مضمون شامل ہے۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب کہ وہ اپنی عمر کی پچیسویں ہی بہار میں تھے۔

گزشتہ ایک دہائی سے ان کا رسالہ ''ترجمان دیوبند'' پابندی سے شائع ہورہا ہے۔ اب تک اس کا کوئی خصوصی شمارہ تو منظر عام پر نہیں آیا، البتہ گاہے گاہے خصوصی ضمیمے شائع ہوتے رہے ہیں۔ جیسے مولانا محمد نعیم صاحبؒ اور مولانا سیّد محمد انظر شاہ صاحب کشمیریؒ وغیرہ۔ تقریباً تین سالوں سے وہ ترجمان کا خاص نمبر ''مشاہیر دارالعلوم'' کی اشاعت کے خواہاں اور اس سلسلے میں کوشاں بھی ہیں، لیکن قلم کار حضرات کی جانب سے بروقت تعاون ناگزیر ہوتا ہے۔ راقم الحروف امید کرتا ہے کہ خود مولانا بھی اس طرف خاص توجہ دیں گے اور قلم کار حضرات سے بھی تعاون کی اپیل ہے۔

بہت کم لوگ اس راز سے واقف ہیں کہ مولانا ندیم الواجدی ایک اچھے کہانی کار اور عمدہ شاعر بھی ہیں۔ ایک زمانے تک وہ دیوبند کی شعری نشستوں اور مشاعروں میں شرکت کر کے داد وتحسین وصول کر چکے ہیں اور بہت سے رسائل واخبارات نے ان کے کلام کو شائع بھی کیا ہے۔ ان شاء اللہ عنقریب اس کے نقوش بھی سامنے آئیں گے۔ مولانا ایک عالم دین اور محقق ومصنف ہونے کے ساتھ ساتھ کئی تعلیمی اداروں، ملّی تنظیموں کے سربراہ اور روح رواں بھی ہیں۔ ان کے اعلیٰ ذوق ہی کا ثمرہ کہنا چاہیے کہ ہزاروں مطبوعات پر مشتمل ان کے خلوص ومحنت اور علم وقلم کا تاج محل ''دارالکتاب'' دیوبند جیسے شہر اور دارالعلوم کی عرفانی چھاؤں میں اپنی عمر کی تین دہائیاں مکمل کررہا ہے اور ایک عرصے سے کتابوں کے اجلے علوم سے جہالت کی تاریکیوں کا قلع قمع کر کے علم کی روشنی بکھیر رہا ہے۔ گویا آگرہ کا تاج محل اور شاہ جہاں جس طرح ایک دوسرے کا جزلاینفک بن گئے ہیں، اسی طرح دیوبند، دارالکتاب اور مولانا ندیم الواجدی کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جاسکتا۔ خدا ان کے علم وقلم میں مزید خلوص وبرکت عطا فرمائے۔ آمین!

رمضان کا مہینہ، ایک قابل غور پہلو

رمضان کا مہینہ کس قدر بابرکت ہے، اس کا اندازہ کرنا ہو تو سرکار دو عالم صلے اللہ علیہ وسلم کا یہ خطبہ ملاحظہ کیجیے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے شعبان کی آخری تاریخ کو ارشاد فرمایا: حضرت سلمان فارسیؓ روایت کرتے ہیں کہ شعبان کے آخری دن سرکار دو عالم صلے اللہ علیہ وسلم منبر پر تشریف لائے اور ارشاد فرمایا کہ اے لوگو! تمہارے اوپر ایک عظیم اور بابرکت مہینہ سایہ فگن ہونے والا ہے، اس مہینے کی ایک رات ہزار مہینوں سے افضل ہے، اللہ تعالیٰ نے اس مہینے کے روزے فرض کیے ہیں اور اس کی راتوں میں قیام کو نفلی عبادت قرار دیا ہے، جو شخص اس مہینے میں نفلی عبادت کے ذریعے تقرب الٰہی کا طلب گار ہوگا اس کو رمضان کے علاوہ دوسرے دنوں کے فرض کے برابر ثواب ملے گا اور جو شخص اس مہینے میں فرض عبادت ادا کرے گا اس کو دوسرے دنوں کی ستر فرض عبادتوں کا ثواب ملے گا، یہ صبر کا مہینہ ہے اور صبر کا ثواب جنت ہے۔ یہ ہمدردی اور غم خواری کا مہینہ ہے، یہ ایسا مہینہ ہے جس میں مومن کا رزق بڑھا دیا جاتا ہے، جو شخص اس مہینے میں کسی کو روزہ افطار کرائے گا اس کا یہ عمل اس کے گناہوں کی مغفرت کا سبب اور دوزخ کی آگ سے آزادی کا ذریعہ ہوگا اور اس کو روزے دار کے ثواب میں کمی کیے بغیر روزے دار کے برابر ثواب دیا جائے گا، صحابہ کرامؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ! ہم میں سے ہر شخص کے اندر افطار کرانے کی گنجائش نہیں ہوتی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اس کو بھی یہ ثواب عطا فرمائے گا جو کسی روزہ دار کو ایک کھجور، پانی کے ایک گھونٹ یا تھوڑی سی لسّی سے افطار کرادے، یہ ایسا مہینہ ہے جس کا ابتدائی حصہ رحمت، درمیانی حصہ مغفرت اور آخری حصہ دوزخ سے نجات ہے، جو شخص اس مہینے میں اپنے غلام (خادم، ملازم) کے کام میں کمی کرے گا، اللہ اس کی مغفرت فرمائے گا اور اسے دوزخ سے آزادی عطا کرے گا۔ (البیھقی) حدیث لمبی ہے، ہم نے یہاں مختصر نقل کی ہے، یہ ایک جامع خطبہ ہے اور اس میں گویا رمضان کی تمام خصوصیات بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ اس مہینے میں کیے جانے والے تمام اعمال کا خلاصہ آ گیا ہے تو غلط نہ ہوگا۔ جہاں تک رمضان کے روزوں کی فضیلت کا معاملہ ہے

ہر مسلمان اس سے اچھی طرح واقف ہے، لیکن اس حدیث میں رمضان کی کچھ اور خصوصیتوں پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے، سب سے پہلے تو اس مہینے کو رمضان کا مہینہ کہہ کر اس کی عبادتوں کا ذکر کیا گیا ہے اور بتلایا گیا ہے کہ کس طرح کی عبادتوں پر کس طرح کا اجر ہے، پھر اسے ماہ صبر قرار دیا گیا ہے، صبر صرف یہی نہیں ہے کہ انسان بھوک پیاس کے باوجود کھانے پینے سے رکا رہے بلکہ صبر یہ بھی ہے کہ دوسروں کی اذیتوں کو خندہ پیشانی سے برداشت کرے، طبیعت کے تقاضے کے باوجود کوئی ایسا کام نہ کرے جس سے کسی کو تکلیف پہنچے، کان، آنکھ، زبان تمام اعضاء کو ایسے کاموں سے روکے جن میں اگر چہ بڑا مزہ ہے، بڑی لذت ہے مگر وہ اللہ کو پسند نہیں ہیں۔ یہی صبر ہے اور اسی پر جنت کا وعدہ کیا گیا ہے، اس مہینے کو ہمدردی اور غم خواری کا مہینہ بھی قرار دیا گیا ہے اور اس میں مومن کے رزق میں برکت بھی دے دی جاتی ہے۔ حدیث شریف میں مواسات کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جس کے معنی ہیں ایک دوسرے کے ساتھ ہمدردی سے پیش آنا اور دوسرے کی غم خواری کرنا ہم مواسات کس طرح کریں، مذکورہ بالا حدیث میں اس کی دو مثالیں اور دو کیفیتیں بھی بیان کر دی گئی ہیں، ایک تو یہ کہ ہم خود ہی روزہ افطار نہ کریں بلکہ ہو سکے تو دوسروں کو بھی افطار کرادیں، اس کی ہمت نہ ہو تو لسی کے چند گھونٹ ہی پلادیں، یہ بھی ممکن نہ ہو تو پانی سے افطار کرادیں، حدیث کا یہ مطلب نہیں ہے کہ خود تو طرح طرح کی نعمتوں سے روزہ افطار کریں اور جو لوگ ضرورت مند ہیں ان کو ایک کھجور کھلا کر اور ایک گلاس پانی پلا کر یہ سوچیں کہ ہم نے روزہ افطار کرا کے بڑا ثواب کما لیا ہے۔ دوسرا سبق یہ دیا گیا ہے کہ اپنے ماتحتوں سے ملازموں اور نوکروں سے عام دنوں کے مقابلے میں کام کم لیں آخر وہ بھی روزے سے ہیں، روزے کی حالت میں ہمتیں جواب دے جاتی ہیں، بھوک پیاس کے احساس کے ساتھ کام سے طبیعت اچاٹ ہو جاتی ہے، اگر ان کے ساتھ ہمدردی کی جائے اور ان کی مفوضہ ذمہ داریوں میں تخفیف کر دی جائے تو یہ بڑے اجر و ثواب کا کام ہے۔ مومن کے رزق میں اضافے کی مصلحت بھی یہی ہو سکتی ہے کہ وہ خود بھی کھائے، اپنے اہل وعیال کے لیے بھی دستر خوان کو وسعت دے اور ضرورت مند رشتہ داروں دوستوں اور پڑوسیوں کا بھی خیال

رکھے۔ چنانچہ ایک روایت میں ہے کہ تمہارے پاس رمضان کا مہینہ آچکا ہے تم اس کے لیے نیت پہلے ہی درست کرلو، اس مہینے میں (اپنے اوراپنے اہل وعیال کے) نان نفقے میں فراخی کرو (کنز العمال)۔ ایک اور روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ رمضان کے مہینے میں نان نفقے کے متعلق وسعت سے کام لو کیوں کہ اس مہینے میں (اپنی ذات پر اور اہل وعیال پر) خرچ کرنا ایسا ہے جیسے اللہ کی راہ میں خرچ کرنا۔ **(الجامع الصغیر)**

رمضان کو مواسات، ہمدردی اور غم خواری کا مہینہ قرار دینا اپنے آپ میں ایک وسیع مفہوم رکھتا ہے۔ روایات میں ہے کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم رمضان کے مہینے میں قیدیوں کو چھوڑ دیا کرتے تھے اور ہر مانگنے والے کو دیا کرتے تھے۔ **(بیھقی شعب الایمان)**

حضرت عبد اللہ ابن عباس روایت کرتے ہیں کہ سرکار دو عالم صلے اللہ علیہ وسلم سب سے زیادہ سخی تھے اور رمضان المبارک میں جب حضرت جبرئیل علیہ السلام آپ سے ملاقات کرتے تھے تو آپ اور زیادہ سخی اور فیاض ہو جاتے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم بھلائی اور خیر کے کاموں میں تیز ہوا سے بھی زیادہ فیاضی اور سخاوت فرماتے تھے۔ (بخاری)

ہم میں سے بہت سے لوگ رمضان کے اس پہلو سے واقف ہی نہیں ہیں کہ یہ ہمدردی کا مہینہ ہے، ہم روزے بھی رکھتے ہیں، نمازیں بھی پڑھتے ہیں، تراویح کی نماز بھی مستعدی کے ساتھ ادا کرتے ہیں، قرآن کریم کی تلاوت بھی کرتے ہیں، لیکن اس مہینے کا جو پیغام ہے اسے سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے، یقیناً یہ تمام کام اجر وثواب کے ہیں اور ایک ایک عمل پر ہمیں ستر ستر گنا ثواب ملنے والا ہے، لیکن یہ ثواب تو صرف ہمیں ملے گا ہمارے ذریعے دوسروں کو اس ماہ مبارک میں کتنا فائدہ پہنچا، ہم نے رمضان کی مقدس ساعتوں میں کبھی اس سوال پر غور نہیں کیا؟ اس مہینے میں اللہ کی رحمتوں کی وجہ سے اور عبادتوں کے تسلسل کے باعث ہمارے دلوں میں نرمی پیدا ہو جاتی ہے، طبیعت خیر کے کاموں کی طرف مائل ہونے لگتی ہے، ہمیں اپنے دلوں کی اس نرمی اور خیر کی طرف طبیعتوں کے اس میلان سے اس ماہ مقدس میں

پورا فائدہ اٹھانا چاہیے، اور فائدہ اٹھانے کا طریقہ یہ ہے کہ ہم اپنے اردگرد نظر دوڑائیں ہمارے عزیز واقارب میں، اپنے حلقہ تعارف میں اور پاس پڑوس کے مکانوں میں کچھ ایسے لوگ ہوں گے جو اپنی کم آمدنی کے باعث اس مہینے کی ظاہری نعمتوں سے مستفید نہیں ہوسکتے ، کیا یہ اچھا لگتا ہے کہ ہمارے دستر خوان پر طرح طرح کی نعمتیں سجی ہوئی ہوں اور انواع واقسام کے کھانے رکھے ہوئے ہوں دوسری طرف ہمارے قریب کے کچھ لوگ نان جویں کو بھی محتاج ہوں یا روکھا سوکھا کھا کر پیٹ بھر رہے ہوں، عید سر پر ہے ہماری ذمہ داری ہے کہ عید کی مسرتوں میں ان لوگوں کو بھی شریک کرلیں جو اپنی تنگ دستی کے سبب اس دن بھی روز کی طرح نظر آنے والے ہیں اور رمضان کو ہمدردی اور غم خواری کا مہینہ بلاوجہ قرار نہیں دیا گیا، اس میں صاحب حیثیت مسلمانوں کے لیے ایک پیغام ہے کہ ضرورت مند انسانیت کے ساتھ ہمدردی اور غم خواری بھی اس ماہ مبارک کی ایسی ہی عبادت ہے جس پر ستر گنا اجر وثواب کا وعدہ کیا گیا ہے۔ کیا ہم یہ ثواب کمانے کے لیے تیار ہیں؟

روزہ میرے لیے ہے اور میں ہی اس کی جزا دوں گا

عربی کی جس عبارت کو اس مضمون کا عنوان بنایا گیا ہے وہ ایک طویل حدیث کا ٹکڑا ہے، روزے کی فضیلت اور اس کے زبردست اجر وثواب کے سلسلے میں اس حدیث کو بنیادی اہمیت حاصل ہے، یہ حدیث بخاری، مسلم، ترمذی، ابو داود، نسائی، ابن ماجہ اور موطا مالک سمیت حدیث کی تقریباً تمام اہم کتابوں میں موجود ہے، اس کے راوی ہیں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے جلیل القدر صحابی حضرت ابو ہریرہؓ، ہم یہاں بخاری ومسلم سے اس حدیث کا متن اور اس کے نیچے ترجمہ پیش کرر ہے ہیں: سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں، بنی آدم کے ہر اچھے عمل کا ثواب دس گنا سے لے کر سات سو گنا تک ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں مگر روزہ کہ وہ میرے ہی لیے ہے اور میں ہی اس اجر دوں گا (کیوں روزہ دار) اپنی خواہش نفس، اور اپنا کھانا میرے ہی لیے چھوڑتا ہے، روزہ دار کے لیے دو خوشیاں ہیں ایک تو روزہ کھولنے کے وقت اور دوسری خوشی اپنے ربّ سے ملاقات کے وقت ہوگی، یاد رکھو روزہ دار کے منھ کی بو اللہ کے نزدیک مشک کی خوشبو سے زیادہ لطیف اور پسندیدہ ہے، روزہ ڈھال ہے (کہ اس کی وجہ سے بندۂ مومن دنیا میں شیطان کے مکروفریب سے اور آخرت میں دوزخ کی آگ سے محفوظ رہتا ہے) تم میں سے جب بھی کوئی شخص روزہ سے ہو تو وہ نہ فحش گوئی کرے، اور نہ ہنگامہ مچائے، اور اگر کوئی شخص اسے برا کہے یا لڑنے جھگڑنے پر آمادہ ہو تو اس سے کہہ دے کہ میں روزہ سے ہوں۔ (صحیح البخاری:۶/ ۴۷۴، رقم:۱۷۷۱، وصحیح مسلم:۶/ ۱۸، رقم:۱۹۴۵)

اس حدیث کے کئی مضامین پہلے بھی گزر چکے ہیں، یہاں صرف ایک جزء پر بات کرنی ہے، حدیث شریف میں فرمایا گیا ہے کہ روزہ میرے ہی لیے ہے اور میں ہی اس کی جزا دوں گا سوال یہ ہے کہ تمام عبادتیں اللہ ہی کے لیے ہوتی ہیں قرآن کریم میں بھی ہے: آپ فرما دیجئے کہ میری نماز میری تمام عبادتیں میرا جینا اور میرا مرنا (سب) اللہ کے لیے ہے جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے (الانعام:۱۶۲) اس صورت میں یہ کیسے کہا جاسکتا ہے کہ صرف

روزہ اللہ کے لیے ہے، پھر ہمارا یہ بھی عقیدہ ہے کہ جزا وسزا کا تمام نظام اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے، وہی قیامت کے دن نیکوکاروں کو ان کی نیکی کا اور گنہ گاروں کو ان کے گناہ کا بدلہ دینے والا ہے، اس مضمون کی بے شمار آیات موجود ہیں، پھر آخر روزہ کو کیوں مستثنیٰ کیا گیا، اس کا مطلب یہ ہے کہ تمام عبادات میں صرف روزہ ہی ایک ایسی عبادت ہے جس کا ثواب اللہ خود دے گا۔ باقی عبادتوں کا ثواب دوسروں کے ذریعے ملنے والا ہے؟

شارحین حدیث نے اس سوال کے متعدد جوابات دئے ہیں، ہر جواب اپنے آپ میں مکمل جواب ہے، جو اشکال حدیث کے ان الفاظ کو پڑھ کر ذہن میں آتا ہے وہ ان جوابات سے بالکل ختم ہوجاتا ہے، ذیل میں یہ تمام جوابات حدیث کی کتابوں سے نقل کئے جاتے ہیں۔

(۱) روزہ ایک ایسی عبادت ہے جس میں ریا کا کوئی دخل نہیں ہے، یعنی اس کا علم صرف روزہ رکھنے والے کو ہوتا ہے یا اللہ تعالیٰ کو ہوتا ہے جو غیب کی تمام باتوں سے واقف ہے، کوئی دوسرا شخص روزے پر مطلع ہونے کا دعوی نہیں کرسکتا، اس کے برعکس دوسری عبادتیں لوگوں کی نظروں میں آجاتی ہیں، مثلاً آپ نماز پڑھ رہے ہیں، مسجد کے تمام حاضرین واقف ہیں کہ آپ نماز پڑھ رہے ہیں، حج کررہے ہیں، ہر دیکھنے والا جانتا ہے کہ آپ ارکان حج کی ادائیگی میں مشغول ہیں، زکوٰۃ ادا کررہے ہیں، آپ کتنی بھی خاموشی کے ساتھ یہ کام کریں کم از کم زکوٰۃ لینے والا تو اس سے واقف ہی ہے کہ آپ نے فریضہ زکوٰۃ ادا کیا ہے، یا کوئی چیز اسے صدقہ کی ہے، صرف روزہ ہی ایسی عبادت ہے جس سے روزہ دار کے علاوہ کوئی دوسرا واقف نہیں ہوتا، اور کیوں کہ کوئی دوسرا واقف نہیں ہوتا اس لیے اس میں نام ونمود کی طلب اور ریا کاری کا بھی کوئی خطرہ نہیں ہوتا، الّا یہ کہ ہم خود اپنے روزے کا اعلان کرتے پھریں، ایسی بے ریا عبادت کا حق ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کی نسبت اپنی طرف کریں۔

(۲) جیسا کہ حدیث میں ہے کہ نیکیوں کا ثواب دس سے سات سو گنا تک ہے، بلکہ بعض مقامات کے شرف کی بنا پر یہ اجر اور بھی بڑھ جاتا ہے، جیسے مسجد حرام میں ایک نماز کا

ثواب ایک لاکھ نمازوں کے برابر ہے، اس کے پیش نظر شارحین حدیث نے انا اجزی بہ کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ روزے کے ثواب کی مقدار اور اس کی وجہ سے ہونے والی تضعیفِ حسنات کو میں ہی جانتا ہوں جب کہ دوسری عبادات ایسی ہیں جن کی جزاء کا اللہ تعالیٰ کے بعض بندوں کو بھی علم ہے، گویا روزے کی جزا بھی باری تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے اور اس کی مقدار کا علم بھی اللہ ہی کو ہے۔

(۳) ایک جواب یہ بھی دیا گیا ہے کہ روزہ مجھے تمام عبادات میں سب سے زیادہ محبوب ہے، (۴) اللہ رب العزت کھانے پینے، اور نفسانی خواہشات سے مستغنی ہے، بندہ کم از کم روزہ کی حالت میں ان چیزوں سے پرہیز کرتا ہے، اس طرح وہ اللہ تعالیٰ سے خصوصی تقرب حاصل کرلیتا ہے، الصوم لی روزہ میرے لیے ہے فرما کر اسی ثواب کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے، (۵) اسی طرح کھانے پینے اور خواہشات سے استغناء فرشتوں کا وصف ہے جو خدا کی مقرب مخلوق ہے، مومن جب روزہ رکھتا ہے تو وہ ملائکہ کے مشابہ ہونے کی بنا پر اللہ تعالیٰ کا مقرب ہو جاتا ہے، (٦) روزہ ایک ایسی عبادت ہے جو باری تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے اور اس میں بندے کے لیے کسی قسم کی کوئی منفعت نہیں ہے، کوئی حظ نہیں ہے (۷) روزہ ایک ایسی عبادت ہے جو کسی غیر اللہ کے لیے نہ کی گئی ہے نہ کی جاتی ہے اس کے برعکس رکوع وسجود، اور طواف وغیرہ غیر اللہ کے لیے بھی ہوتے ہیں، (۸) روزہ کے علاوہ جتنی عبادتیں ہیں وہ قیامت کے دن گناہوں کا کفارہ بنیں گی اور ان کے ذریعے بندوں کے واجب الاداء حقوق چکائے جائیں گے، یہاں تک کہ جب یہ عبادتیں ختم ہو جائیں گی اور صرف روزہ باقی رہ جائے گا اس وقت روزہ کو بقیہ واجب الاداء حقوق کا کفارہ نہیں بنایا جائے گا بلکہ اللہ رب العزت اپنی جانب سے اصحاب حقوق کو بہتر جزاء عطا فرمائیں گے، روزہ کی جزاء کو ان حقوق کا کفارہ نہیں بنایا جائے گا، بلکہ اس کے عوض روزہ دار کو جنت میں داخل کردیا جائے گا، (۹) روزہ ایک ایسی مخفی عبادت ہے جس پر سوائے باری تعالیٰ کے کوئی مطلع نہیں ہوتا، یہاں تک کہ وہ فرشتوں سے بھی مخفی رہتا ہے، کراماً کاتبین بھی اسے نہیں لکھتے، (۱۰) اسی لیے حکیم الامت حضرت

تھانویؒ نے یہ توجیہ ارشاد فرمائی ہے کہ روزہ کی جزا بلا واسطہ ملائک ہم خود دیں گے جب کہ دوسری عبادات کی جزاء میں فرشتوں کا واسطہ ہوگا۔(۱۱) روزہ میں صبر کا عنصر زیادہ ہے، اس میں ترک لذات پر صبر ہے، ترک شہوات پر صبر ہے، اس عبادت کے دوران بندے کو جس قدر صبر اور آزمائش سے گزرنا پڑتا ہے اس سے زیادہ کسی اور عبادت میں نہیں گزرنا پڑتا اور صبر کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے خود ارشاد فرمایا ہے: صبر کرنے والوں کو بلا حساب اجر دیا جائے گا۔(الزمر:۱۰)

تفصیل کے لیے ملاحظہ کیجئے (فتح الباری:۴/ ۱۰۷،التعلیق الصبیح:۲/ ۱۷۳،نفحات التنقیح شرح مشکوۃ المصابیح:۳/ ۱۶۸، درس ترمذی:۲/ ۶۰۴) روزہ کی عبادت کا اس سے بڑھ اور کیا شرف ہوگا کہ اللہ نے اس کو اپنے لیے مخصوص کرلیا ہے، اور وہ خود ہی روز قیامت اس کی جزاء بھی دے گا، باقی اعمال کا اجر تو ہمیں معلوم ہے کہ ان کا اجر دس گنا بھی ہوسکتا ہے، اور سات گنا بھی، بلکہ ایک لاکھ گنا تک بھی ہے، لیکن تنہا روزہ ایک ایسی عبادت ہے جس کا اجر نا معلوم ہے، اگر معلوم ہے تو یہ کہ جو اجر روزہ داروں کو ملنے والا ہے وہ بے حساب ہے، نہ اسے کسی ترازو سے تولا جا سکتا ہے، نہ کسی پیمانے سے ناپا جا سکتا ہے، اور نہ اسے شمار کیا جا سکتا ہے، اللہ ہی جانتا ہے اس اجر کے بارے میں بھی اور اس کی کمیت اور کیفیت کے بارے میں بھی۔

روزہ کا فاسد ہونا

روزہ کن چیزوں سے فاسد ہوتا ہے:

بہت سی صورتیں ایسی ہیں جن سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے، بعض صورتوں میں قضا واجب ہوتی ہے اور بعض صورتوں میں قضا اور کفارہ دونوں واجب ہوتے ہیں، قضا کا مفہوم یہ ہے کہ رمضان گزرنے کے بعد ایک روزے کے بدلے میں ایک روزہ قضا کی نیت سے رکھا جائے۔ قضا روزوں کا مسلسل رکھنا ضروری نہیں ہے، اختیار ہے جب چاہے رکھے لیکن بہتر یہ ہے قضا روزوں کی ادائیگی میں جلدی کرے، کیوں کہ موت کا کوئی بھروسہ نہیں ہے، جتنی جلدی ادائیگی ہو جائے اتنا ہی بہتر ہے، قضا روزوں میں ترتیب بھی ضروری نہیں ہے اور نہ لگاتار رکھنے ضروری ہیں (علم الفقہ :۲۴۴ جواہر الفقہ :۱/۱۸۳) فوت شدہ روزے کی قضا کے لیے دن تاریخ متعین کرنا تو ضروری نہیں ہے بلکہ جتنے روزے قضا ہوئے ہوں اتنے روزے رکھ لینے چاہئیں، البتہ اگر کئی سالوں کے روزے باقی ہوں تو ادا کرتے ہوئے سال کا تعین کر لینا ضروری ہے (بہشتی زیور:۳/۷) اگر کسی وجہ سے سال گذشتہ کے رمضان کے روزے نہیں رکھے جا سکے تھے کہ دوسرا رمضان آ گیا تو اب دوسرے رمضان کے فرض روزے پہلے ادا کرنے چاہئیں، قضا بعد میں رکھے جائیں۔ (شرح البدایہ:۲/۴۰۲)

روزہ فاسد ہوگا صرف قضا واجب ہوگی:

ذیل میں کچھ ایسے مسائل درج ہیں جن میں روزہ تو فاسد ہو جاتا ہے مگر اس کی قضا کی جاتی ہے۔

(۱) ہر وہ چیز جس کو غذاءً، دواءً یا کسی فائدے کے لیے استعمال نہ کیا جاتا ہو جیسے پتھر مٹی وغیرہ اس کے کھانے سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے لیکن صرف قضا واجب ہوتی ہے۔

(۲) روزے کی حالت میں اگربتی، لوبان وغیرہ کا دھواں جان بوجھ کر ناک میں داخل کرنے سے روزہ فاسد ہو جاتا ہے، صرف قضا واجب ہوگی (فتاویٰ شامی:۳/۳۶۶)

(۳) روزہ یاد تھا مگر وضو کرتے ہوئے یا غسل کرتے ہوئے ویسے ہی پانی ناک میں ڈالتے ہوئے بلا قصد و اختیار پانی حلق میں چلا گیا تو اس سے روزہ ٹوٹ جائے گا، اسی لیے غسل اور وضو کرتے ہوئے روزے کی حالت میں غرغرہ سے منع کیا گیا ہے کیوں کہ اس میں

پانی کے حلق میں چلے جانے کا اندیشہ ہے، اگر غرغرہ کررہا تھا کہ پانی حلق میں نیچے تک داخل ہوگیا تو اس سے بھی روزہ ٹوٹ جائے گا (فتاوی عالمگیری:۱/۲۰۲)

(۴) سحری کا وقت سمجھ کر صبح صادق کے بعد کھانے پینے سے روزہ فاسد ہوجائے گا (فتاوی شامی:۳/۳۷۵) اسی طرح اگر کسی شخص نے غروب آفتاب سے پہلے اس غلط فہمی میں مبتلا ہوکر کہ آفتاب غروب ہوچکا ہے کچھ کھا پی لیا تو اس سے بھی روزہ ٹوٹ جائے گا (فتاوی دارالعلوم:۶/۴۳۶)

(۵) اگر کسی شخص کے دانتوں میں گوشت کا ریشہ یا روٹی وغیرہ کا ریزہ لگا ہوا ہو اور وہ چنے کی مقدار سے بڑا ہو اس نے وہ ریزہ یا ریشہ دانتوں سے نکالے بغیر نگل لیا تو روزہ ٹوٹ جائے گا اور اگر کسی نے منہ سے باہر نکالا پھر نگلا تو اب وہ ریزہ یا ریشہ چنے کے برابر ہو یا نہ ہو ہر حالت میں روزہ فاسد ہوجائے گا (**کتاب الفقه علی المذاهب الاربعه**:۱/۳۳۹)

(۶) دانتوں سے نکل کر اتنا خون یا پیپ حلق کے اندر چلی جائے جو تھوک کے برابر یا اس سے زیادہ ہو اور برابر یا زیادہ ہونے کی پہچان یہ ہے کہ تھوک میں اس کی آمیزش صاف نظر آجائے اور منہ میں اس کا ذائقہ محسوس ہونے لگے تو اس سے بھی روزہ ٹوٹ جائے گا (فتاوی رحیمیہ:۳/۱۰۸) اگر روزے کی حالت میں مسوڑھوں کا خون یا پیپ وغیرہ حلق کے اندر چلی گئی تو اس سے بھی روزہ ٹوٹ جائے گا، چاہے سونے کی حالت میں حلق کے اندر گئی ہو یا بیداری کی حالت میں (فتاوی دارالعلوم:۶/۴۱۴) روزے کی حالت میں داڑھ دانت نہ نکلوائے تو بہتر ہے، لیکن اگر درد کی شدت کے باعث نکلوانے کی ضرورت پیش آجائے تو یہ احتیاط کرنی چاہیے کہ خون حلق کے اندر نہ جائے، کیوں کہ اگر تھوک کے برابر یا زیادہ مقدار میں خون حلق کے اندر چلا گیا یا خون کا ذائقہ حلق کے اندر محسوس ہوا تو روزہ فاسد ہوجائے گا۔ (احسن الفتاوی: ۲/۱۰۷)

(۷) ناک میں دوا یا تیل ڈالنے سے روزہ ٹوٹ جائے گا، خواہ کسی مجبوری ہی کی وجہ سے کیوں نہ ڈالے (فتاوی عالمگیری:۱/۲۰۴) البتہ کان کے متعلق پہلے تو یہی فتوی دیا جاتا تھا

کہ اگر کان میں دوا یا تیل وغیرہ ڈالا جائے تو اس سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے لیکن اب جدید طبی تحقیق کی وجہ سے بہت سے علماء یہ فتوی دینے لگے ہیں کہ کان میں دوا وغیرہ ڈالنے سے روزہ نہیں ٹوٹتا الا یہ کہ کسی شخص کے کان کا پردہ پھٹا ہوا ہو (ملاحظہ کیجئے: ماہ نامہ البلاغ کراچی، دسمبر ۲۰۰۱،ص:۴۹) لیکن احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ جب تک دار العلوم دیو بند جیسے مستند ادارے اس طرح کا فتوی نہ دیں اس وقت تک پرانے فتوے پر ہی عمل کیا جائے کہ کان میں دوا وغیرہ ڈالنے سے بھی روزہ ٹوٹ جاتا ہے (فتاوی عالمگیری:۱/۲۰۴)

(۸) سانس کے ذریعے کوئی ایسی چیز کھینچنا کہ وہ جوف دماغ میں یقینی طور پر پہنچ جائے جیسے وکس، انہیلر، سنتھول، ٹنکچر بینزائن وغیرہ یا خشک سفوف وغیرہ ناک کے ذریعے کھینچنا، یا ایسی آکسیجن دینا جس میں ادویات کے اجزاء شامل ہوں (خیر الفتاوی:۴/ ۹۸) یہی حکم روزے کی حالت میں حقہ، بیڑی اور سگریٹ کا ہے، کیوں کہ ان میں بھی دھواں اندر کی طرف کھینچ کر باہر چھوڑا جاتا ہے، غالب امکان یہی ہے کہ اس طرح کرنے سے دھواں اندر ضرور جائے گا، اس سے بھی روزہ ٹوٹ جائے گا اور قضا واجب ہوگی، لیکن اگر کسی شخص نے مفید سمجھ کر اور بھوک کے تدارک کے طور پر سگریٹ وغیرہ پی تو نہ صرف قضا واجب ہوگی بلکہ کفارہ بھی دینا پڑے گا (فتاویٰ دار العلوم:۶/ ۴۱۹)

(۹) بیوی کے ساتھ بوس وکنار کرتے ہوئے یا خود لذتی کی وجہ سے انزال ہو جائے تو روزہ ٹوٹ جائے گا (فتاوی رحیمیہ:۷/۲۶۲، خیر الفتاوی:۴/ ۱۶،۲۶) یہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ صرف سوچنے یا خیال کرنے سے یا فحش تصاویر وغیرہ دیکھنے سے انزال ہونے کی صورت میں روزہ فاسد نہیں ہوتا۔

(۱۰) بیماری یا کسی دوسری مجبوری کی وجہ سے روزہ توڑا جا سکتا ہے، اس صورت میں صرف قضا واجب ہوگی، مثلاً کوئی شخص تیز بخار میں مبتلا تھا یا کسی شخص کو اس قدر پیاس محسوس ہوئی کہ معاملہ برداشت سے باہر ہو گیا تو روزہ توڑنے کی گنجائش ہے (فتاویٰ دار العلوم:۶/ ۴۲۶) اگر کسی بیمار نے روزہ رکھ لیا بعد میں کسی علامت سے تجربے سے یا کسی ماہر مسلمان ڈاکٹر

کے کہنے سے پتہ چلا کہ اگر روزہ رہا تو مرض بڑھ جائے گا تو اس صورت میں روزہ توڑا جا سکتا ہے، یہاں بھی قضا واجب ہوگی (فتاوی عالمگیری:۱/۲۰۷)(۲) کسی حاملہ کو حمل ضائع ہونے یا اسے نقصان پہنچنے کا ڈر ہو یا دودھ پلانے والی عورت کو بچے کی ہلاکت کا خوف ہو تو ایسی عورتیں بھی روزہ توڑ سکتی ہیں، ان پر بھی قضا واجب ہوگی۔(البحر الرائق:۲/۴۴۹)

(۱۱) مجبوری کی ایک شکل یہ بھی ہے کہ کسی شخص کو جان سے مارنے کی دھمکی دی جائے یا یہ کہا جائے کہ تمہارے ہاتھ پاؤں توڑ دیئے جائیں گے، یا کوئی بہت بڑا نقصان پہنچا دیا جائے گا ایسی صورت میں روزہ توڑا جا سکتا ہے اس کی بھی صرف قضا واجب ہوگی اور روزہ توڑنے کا کوئی گناہ نہ ہوگا (فتاوی عالمگیری:۱/۲۰۲)

(۱۲) اگر کوئی شخص رمضان کے مہینے میں بے ہوش رہا تو جس دن بے ہوشی طاری ہوئی اس دن کے علاوہ تمام دنوں کے روزوں کی قضا ضروری ہے، پہلے دن کا روزہ صحیح مانا جائے گا، پورے رمضان بے ہوش رہا تب بھی یہی حکم ہے ہوش میں آنے کے بعد تمام مہینے کے روزوں کی قضا ضروری ہے، البتہ پاگل کا حکم دوسرا ہے اگر کوئی شخص رمضان کے پورے مہینے جنون میں مبتلا رہا تو اس پر قضا واجب نہیں ہے، لیکن اگر کچھ دن صحیح رہا اور کچھ دن جنون میں گزرے تو تمام فوت شدہ روزوں کی قضا رکھنی ہوگی، جتنے روزے جنون کی وجہ سے گئے ہیں ان کی بھی قضا رکھی جائے گی۔(علم الفقه:۳/۴۳۷)

(۱۳) دل کا مریض اگر درد کی گولی زبان کے نیچے رکھ لے اور اس کا اثر تھوک میں شامل ہوکر حلق کے اندر چلا جائے تو روزہ ٹوٹ جائے گا لیکن اگر حلق کے اندر نہیں گیا تو روزہ نہیں ٹوٹے گا اگر چہ وہ دوا زبان کے مسامات میں جذب ہوکر درد کو زائل کر دے۔

(۱۴) آج کل رحم وغیرہ کی صفائی کے لیے عورت کی شرمگاہ میں آلات وغیرہ ڈالے جاتے ہیں، اگر وہ آلات خشک ہوں تو ان کے داخل کرنے سے روزہ نہیں ٹوٹے گا، لیکن اگر وہ تر ہوں یا ان پر دوا وغیرہ لگی ہوئی ہو تو اس سے روزہ ٹوٹ جائے گا (فتاوی عالمگیری:۱/۲۰۴) البتہ شرمگاہ میں دوا ڈالنے سے روزہ ٹوٹ جائے گا تاہم قضا واجب ہوگی۔(البحر الرائق :

۲۸۸/۲)

(۱۵) کسی شخص کوخود بہ خود قئے ہوئی غلطی سے وہ یہ سمجھا کہ اس قئے سے بھی روزہ ٹوٹ جاتا ہے، حالاں کہ اس سے روزہ نہیں ٹوٹتا، یہ سوچ کر اس نے کھانا پینا شروع کردیا تو اس روزے کی قضا واجب ہوگی۔ (فتاویٰ ہندیہ:۱/ ۲۰۶)

ایک قابل توجہ مسئلہ:

یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ اگر کسی شخص کا روزہ چھوٹ جائے یا فاسد ہو جائے تو قضا خود ہی کرے گا، کسی دوسرے شخص کے ذریعے قضا کرانا جائز نہیں ہے اس سلسلے میں شریعت کا یہ اصول ہے کہ عبادات بدنیہ مثلاً نماز، روزہ اگر فوت ہو جائیں تو اس میں نیابت کی گنجائش نہیں ہے، خود ہی قضا کرنی ضروری ہوگی، البتہ مالی عبادتوں میں جیسے زکوٰۃ اور صدقہ فطر وغیرہ دوسرا بھی ادا کرسکتا ہے (فتاویٰ شامی:۴/۱۳)

قضاء کے کچھ مسائل:

اگر کوئی مسافر دن ڈھلے مقیم ہو جائے، کسی عورت کا حیض ونفاس دن کے کسی بھی حصے میں بند ہو جائے، کوئی بیمار دن ڈھلے صحت یاب ہو جائے، کسی نے مجبوری کی وجہ سے روزہ توڑ ڈالا ہو اور دن ڈھلنے کے بعد اس کی مجبوری دور ہوگئی ہو تو ان سب کو چاہئے کہ وہ روزہ داروں کی طرح باقی دن گزاریں اور رمضان کے بعد اس دن کے روزے کی قضا کریں، البتہ اگر کوئی نابالغ بچہ دن میں بالغ ہوگیا ہو یا کوئی کافر دن میں اسلام لے آیا ہو تو ان دونوں پر قضا واجب نہیں ہوگی کیوں کہ ان پر یہ روزہ فرض ہی نہیں ہوا تھا۔

جن صورتوں میں قضا اور کفارہ دونوں واجب ہیں:

سب سے پہلے تو یہ سمجھ لینا چاہئے کہ رمضان کا روزہ ایک لازمی فرض ہے، اگر کسی شخص نے جس پر رمضان کے روزے فرض تھے جان بوجھ کر روزے کی حالت میں کوئی غذا کھالی یا پانی پی لیا، یا جماع کرلیا تو اس سے روزہ بھی فاسد ہو جائے گا، قضا بھی ضروری ہوگی اور کفارہ بھی دینا ہوگا، اس سلسلے میں اصل بات یہ ہے کہ بلا عذر رمضان کا روزہ چھوڑنے والا

شدید وعید کا مستحق ہے، ایک حدیث میں ہے کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر کوئی شخص جان بوجھ کر رمضان کا ایک روزہ چھوڑ دے تو پھر وہ پوری عمر بھی روزے رکھے تب بھی اس ایک روزے کا بدل نہیں ہو سکتا (بخاری: ۲/ ۲۸۶، ابو داود: ۱/ ۲۹۷، رقم الحدیث: ۲۳۹۶) اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ رمضان کے روزے کی کتنی اہمیت اور فضیلت ہے، ظاہر ہے جس کام کے کرنے پر ثواب زیادہ ہوگا اس کے نہ کرنے پر عذاب بھی اتنا ہی ہوگا، اور اگر رکھ کر توڑ دیا تو یہ انتہائی قابل مذمت ہے اس کی قیامت کے دن کتنی سزا ہوگی اور کیا ہوگی یہ تو اللہ ہی جانتا ہے، لیکن دنیا میں بھی اس کی سزا اتنی ہونی چاہئے کہ وہ خود بھی روزہ توڑنے کی جرأت نہ کر سکے اور دوسروں کو بھی جسارت نہ ہو، اسی لیے جان بوجھ کر روزہ توڑنے والوں کے لیے قضا بھی ہے اور کفارے کی سزا بھی ہے۔

کفارہ کیا ہے؟

روزے کا کفارہ یہ ہے کہ ایک روزے کے بدلے میں ایک غلام آزاد کرے اگر کسی شخص کے پاس اتنا پیسہ نہیں ہے کہ وہ غلام خرید کر آزاد کر سکے یا کسی ایسی جگہ رہتا ہو جہاں غلاموں کی خرید وفروخت نہ ہوتی ہو تو ایسے شخص کے لیے ساٹھ روزے رکھنا واجب ہے، اگر کسی وجہ سے ساٹھ روزے بھی نہ رکھ سکے تو ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلانا واجب ہے، ساٹھ روزوں میں شرط یہ ہے کہ ان میں تسلسل ہو، بیچ میں کوئی انقطاع نہ ہو، یعنی کوئی روزہ ناغہ نہ ہو، اگر ناغہ ہو گیا تو تمام ساٹھ کے ساٹھ روزے دوبارہ رکھنے ہوں گے، ہاں اگر کسی عورت کو حیض آجائے تو یہ ناغہ معاف ہوگا حیض کے ایام پورے ہونے کے بعد باقی روزے پورے کئے جائیں، اگر کوئی شخص کفارے کی تینوں صورتوں پر قادر ہو یعنی غلام بھی آزاد کر سکتا ہو، ساٹھ روزے بھی رکھ سکتا ہو اور ساٹھ مسکینوں کو کھانا بھی کھلا سکتا ہو تو جو صورت اس کے لیے زیادہ سخت ہو وہ اختیار کی جائے اس لیے کہ کفارے کا مقصد سزا اور تنبیہ ہے، صاحب ''البحر الرائق'' نے لکھا ہے کہ اگر بادشاہ پر کفارہ واجب ہو جائے تو اسے ساٹھ روزے رکھنے چاہئیں کیوں کہ اس کے لیے یہ عمل دشوار ہوگا، وہ غلام بھی آسانی کے ساتھ آزاد کر سکتا ہے اور ساٹھ

مسکینوں کو بھی سہولت سے کھانا کھلا سکتا ہے، مسکینوں کو کھانا کھلانے کے سلسلے میں یہ شرط ہے کہ ساٹھ مسکینوں کو دونوں وقت پیٹ بھر کر کھانا کھلایا جائے، چاہے ایک ہی دن دونوں وقت کھلا دیں، چاہے دو دن دو وقت کھلا کر ایک دن پورا کر دیں، ایک وقت میں جن محتاجوں کو کھانا کھلایا ہے دوسرے وقت بھی ان ہی کو کھلانا ہوگا یہ نہیں ہو سکتا کہ ایک وقت میں ساٹھ مسکینوں کو کھلایا اور دوسرے وقت میں دوسرے ساٹھ مسکینوں کو کھلا دیا ہاں یہ ممکن ہے کہ ساٹھ روز تک ایک ہی مسکین کو کھانا کھلائے، یا ساٹھ دن نئے مسکین کو کھانا کھلائے، جن محتاجوں کو کھانا کھلائے ان کا بھوکا ہونا بھی ضروری ہے، پیٹ بھروں کو کھلانے سے کفارہ ادا نہیں ہوگا، کھانے کے بجائے دو وقت کے کھانے کے بہ قدر ساٹھ مسکینوں کو صدقہ بھی دیا جا سکتا ہے، لیکن اگر ایک ہی شخص کو ایک ہی روز ساٹھ مسکینوں کے دو وقت کے کھانے کے بہ قدر صدقہ دے دیا تو یہ صورت بھی صحیح نہیں ہے، جماع کی سزا اور بھی سخت ہے، اگر جماع کے علاوہ کسی اور سبب سے کفارہ واجب ہوا اور ابھی وہ ادا نہیں کر پایا تھا کہ دوسرا واجب ہو گیا تو ان دونوں کے لیے ایک ہی کفارہ کافی ہے، خواہ دونوں کفارے دو رمضان کے ہوں، لیکن اگر جماع سبب بنا ہے تو ہر روزے کا کفارہ الگ ہوگا (**علم الفقہ:۲۴۴**)

رمضان کا روزہ نہ چھوڑیں، نہ توڑیں

رمضان کا روزہ ایک بڑا فرض بھی ہے، ایک اہم سعادت بھی ہے اور ایک عظیم نعمت بھی ہے، بڑے بدنصیب ہیں وہ لوگ جو رمضان کا روزہ چھوڑ دیتے ہیں یا رکھ کر توڑ دیتے ہیں ، اس طرح وہ فرض ترک کرنے کے گنہ گار تو ہوتے ہی ہیں، سعادت اور نعمت سے محروم رہنے کے سزاوار بھی ہو جاتے ہیں، بعض لوگوں کو دیکھا ہے کہ وہ معمولی معمولی بیماریوں کی وجہ سے یا تھوڑے بہت مشقت کے کام کی وجہ سے روزہ چھوڑ دیتے ہیں، رمضان کے بعد کم ہی لوگوں کو یہ روزہ رکھنے کی توفیق میسر آتی ہے، اور اگر کسی نے قضا بھی کر لیا تو جو اجر و ثواب رمضان کے روزے کا تھا وہ کہاں میسر ہوگا، اگر واقعی کوئی شرعی عذر ہے تو بے شک روزہ چھوڑ سکتے ہیں، لیکن جان بوجھ کر روزہ چھوڑنا سخت گناہ ہے اور رکھ کر توڑ دینا تو اس سے بھی بڑا گناہ ہے۔ کتنے

ہی لوگوں کو دیکھا ہے کہ وہ زندگی کے دوسرے معاملات میں تو بڑے بہادر اور جفاکش نظر آتے ہیں لیکن جہاں روزوں کی بات آئی کم ہمتی کا شکار ہو جاتے ہیں، ایسے لوگوں کو یہ غلط فہمی ہوتی ہے کہ وہ روزہ رکھ کر بھوک پیاس برداشت نہ کرسکیں گے اور بیمار پڑ جائیں گے، ان کا یہ خیال غلط ہوتا ہے، روزہ رکھ کر کوئی بیمار نہیں پڑتا، طب جدید تو یہ کہتی ہے کہ روزہ انسانی صحت کے لیے ضروری ہے، اور چند گھنٹے خالی پیٹ رہ کر بہت سے ایسے جسمانی فوائد حاصل کئے جاسکتے ہیں جو قیمتی سے قیمتی دواؤں سے حاصل نہیں ہوتے، ایسے لوگوں میں قوت ارادی کی کمی ہوتی ہے اور حوصلہ نہیں ہوتا، ایسے لوگوں کو بوڑھوں اور کم عمر بچوں سے سبق لینا چاہئے کہ وہ کس طرح روزہ رکھ رہے ہیں، بہت سے نوجوان تعلیم کا بہانہ بنا کر یا کھیلوں میں حصہ لینے کا عذر پیش کر کے روزہ ترک کر دیتے ہیں کہ پڑھائی سخت ہے، روزے میں نہیں ہو پائے گی، یا امتحان کی تیاری روزے میں نہیں ہو پائے گی، یہ صرف نفس کے بہانے ہیں، ان بہانوں سے روزہ معاف نہیں ہوسکتا، گرمی کے روزے تو بعض لوگوں کے لیے موت کے پیغام سے کم نہیں ہوتے، تصور ہی سے ان کی روح کانپ اٹھتی ہے، ان کا بس نہیں چلتا کہ وہ گرمی کے روزوں سے کس طرح پیچھا چھڑائیں، ان میں سے بعض افراد اس خیال سے رمضان کے روزے چھوڑ دیتے ہیں کہ سردی میں رکھ لیں گے، قضا تو آپ کر لیں گے، لیکن جان بوجھ کر روزے نہ رکھنے کا جو گناہ ہوگا اس کے بارے میں بھی سوچنا چاہئے، آج کل تو بڑی سہولتیں ہیں پنکھے، کولر، اے سی سب کچھ موجود ہے، اس وقت کا تصور کیجئے جب موسم بھی سخت ہوتا تھا اور موسم کی سختی سے بچاؤ کے وسائل بھی میسر نہیں تھے، لوگ سروں پر گیلے کپڑے رکھ کر، یا تربوز کے خول رکھ کر روزہ پورا کرتے تھے، اللہ کے نیک بندے تو حالت سفر میں بلکہ حالت جنگ میں بھی روزے نہیں ترک کرتے تھے، جب کہ شریعت نے سفر اور جنگ دونوں موقعوں پر روزہ نہ رکھنے کی سہولت دی ہے، لیکن وہ لوگ رخصت پر نہیں عزیمت پر عمل کر کے زیادہ سے زیادہ ثواب کما لینا چاہتے تھے، جب کہ آج کے لوگ روزہ چھوڑنے کے بہانے تلاش کرتے پھرتے ہیں۔

مال دار آدمی یہ سوچتے ہیں کہ ہم روزہ نہیں رکھتے بلکہ فدیہ دیے دیں گے ہمیں ثواب

مل جائے گا،غریبوں کا بھلا ہو جائے گا، یہ بڑی غلط فہمی ہے، ہٹے کٹے صحت مند لوگوں کے فدیہ دینے سے روزہ ادا نہیں ہوتا، یہ گنجائش تو انتہائی ضعیف لوگوں کے لیے ہے،غریبوں کے ساتھ اتنی ہی ہمدردی ہے تو انہیں فدیئے کے بجائے امداد کیوں نہیں دیتے، رمضان کی مبارک ساعتوں میں یوں بھی ایک کا ستر گنا ملنے والا ہے روزہ رکھئے اور پورے احساس ذمہ داری کے ساتھ رکھئے، احساس ذمہ داری کا مطلب یہ ہے کہ اسے عبادت سمجھ کر انجام دیجئے، اور یہ سوچئے کہ اللہ ہماری ہر حرکت پر نظر رکھے ہوئے ہے، جس طرح ہم نماز میں خدا کے حضور حاضر ہوتے ہیں اسی طرح روزے کی حالت میں بھی ہم باری تعالیٰ کی توجہات کا مرکز بنے ہوئے ہیں، اگر یہ احساس ذمہ داری ہوا تو ہمارے روزے صحیح معنی میں روزے ہوں گے، نہ ان میں گناہوں کی آمیزش ہوگی اور نہ روزوں کے درمیان ہم سے ایسی غلطیاں سرزد ہوں گی جو ہمارے روزوں کو مکروہ کر دیتی ہیں، بلکہ بعض اوقات ان غلطیوں کی وجہ سے ہمارا روزہ ٹوٹ بھی جاتا ہے۔

شریعت طاقت سے زیادہ کسی کو مکلّف نہیں کرتی، یہ ایک ایسا اصول ہے جو ہمیں تمام عبادات میں موجود ملتا ہے، روزہ رکھنے والوں کو بھی اگر واقعی کوئی عذر ہے تو روزہ چھوڑنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے، فقہاء نے شرعی مجبوریوں کی تفصیلات بیان کر دی ہیں، اگر ان میں سے کوئی مجبوری پیش آ گئی ہے تو شریعت نے روزہ چھوڑنے کی اجازت دی ہے، وہ شرعی اعذار حسب ذیل ہیں۔

(۱) بیماری (۲) سفر (۳) اکراہ (زبردستی) (۴) حمل (۵) ارضاع (دودھ پلانا)
(۶) نا قابل برداشت بھوک پیاس (۷) حیض ونفاس (۸) بڑھاپا۔

ان میں سے کچھ اعذار کی تفصیل گزر چکی ہے، کچھ ذیل میں بیان کئے جاتے ہیں۔

خواتین کا روزہ:

خواتین کا روزہ بھی ایسا ہی ہے جیسے مردوں کا روزہ، البتہ ان کے ساتھ جو مستقل اعذار ہیں ان کی بنا پر شریعت نے ان کے لیے کچھ سہولتیں رکھی ہیں، خواتین ان سہولتوں سے

فائدہ اٹھا سکتی ہیں، بعض صورتوں میں تو ان کے لیے روزہ رکھنا ہی جائز نہیں ہے، عورتیں اس کا بھی خیال رکھیں، ذیل میں عورتوں کے کچھ مخصوص مسائل درج ہیں۔

(۱) حیض کے دوران نماز پڑھنا اور روزہ رکھنا درست نہیں ہے ان دونوں عبادتوں میں فرق یہ ہے کہ ان ایام کی نماز بالکل معاف ہے، جب کہ روزہ معاف نہیں ہے، رمضان کے بعد ایام حیض کے روزوں کی قضا کرنی ہوگی۔ (فتاویٰ عالمگیری:۱/ ۲۰۷)

(۲) بچے کی پیدائش کے بعد جو خون آتا ہے اسے نفاس کہتے ہیں، نفاس والی عورت کے سلسلے میں بھی یہی حکم ہے کہ اس کی نماز تو معاف ہے، لیکن روزہ معاف نہیں ہے، پاک ہوکر فوت شدہ روزوں کی قضا رکھنی پڑے گی۔ (فتاویٰ شامی:۱/ ۴۹۶)

(۳) روزہ رکھنے کے بعد دن میں کسی وقت حیض آ گیا تو روزہ ٹوٹ جائے گا بعد میں قضا کرے گی۔ (فتاویٰ شامی:۱/ ۴۸۵)

(۴) اگر حائضہ عورت دن میں پاک ہوگئی تو اس کے لیے باقی تمام دن کھانا پینا درست نہیں ہے، روزہ داروں کی طرح رہنا واجب ہے، لیکن یہ روزہ نہیں ہوگا محض رمضان کے احترام کی وجہ سے اس کو کھانے پینے سے روکا گیا ہے۔ (بہشتی زیور:۲/ ۶۱)

(۵) جو عورت حمل سے ہو اگر اس کو یہ خوف ہو کہ روزہ رکھنے سے اس کی صحت کو نقصان پہنچے گا یا بچے کو نقصان ہوگا تو اس کے لیے روزہ نہ رکھنا جائز ہے، اگر کسی کو روزہ رکھنے کے بعد حمل کا احساس ہوا تب بھی روزہ توڑا جا سکتا ہے، دونوں صورتوں میں قضا ضروری ہے۔ (فتاویٰ عالمگیری:۱/ ۲۰۷)

(۶) اگر کوئی عورت بچے کو دودھ پلا رہی ہو خواہ بچہ اس کا ہو یا کسی دوسرے کا ہو، اجرت پر پلا رہی ہو یا بہ غیر اجرت کے اس کے لیے روزہ چھوڑنے کی اجازت ہے لیکن اسے یہ دیکھ لینا چاہئے کہ اس حالت میں روزہ رکھنے سے اس کی صحت متاثر ہوگی یا نہیں، اور اس کے روزے رکھنے سے بچے کے دودھ میں کمی واقع ہوگی یا نہیں، اگر تجربے سے یا ڈاکٹر کے مشورے سے یہ بات سامنے آئے کہ دودھ پلانے کی حالت میں دونوں کو یا کسی ایک کو نقصان ہے تو روزہ چھوڑا جا سکتا ہے، بعد میں قضا ہوگی۔ (فتاویٰ شامی:۳/ ۴۰۳)

آج رات کی تراویح

۴ رمضان المبارک

لَن تَنالُوا کے نصف سے وَالمُحصَنٰتُ کے ختم تک

آج رات کی تراویح کی ابتداء سورۃ نساء کی تلاوت سے ہورہی ہے، یہ سورت مختلف احکام پر مشتمل ہے، اس میں تین طرح کے معاملات کا بیان ہے، باہمی معاملات جیسے یتیموں اور بیویوں کے متعلق احکامات، مخالفین کے معاملات جیسے جہاد کے احکام منافقین کے احوال، مشرکین کے عقائد، دیانات جیسے نماز اور توبہ کے احکام، جنابت وطہارت وغیرہ کے مسائل۔ چنانچہ اس سلسلے کا پہلا حکم یہ دیا گیا ہے کہ یتیموں کا مال ان کو واپس دے دو اپنے برے مال کو ان اچھے مال سے نہ بدلو اور ان کے مال کو اپنے مال کے ساتھ ملا کر نہ کھاؤ کہ یہ بہت بڑا گناہ ہے، زمانہ جاہلیت میں ایک دستور یہ تھا کہ اگر کسی کے پاس کوئی یتیم لڑکی زیر کفالت ہوتی تو وہ اس کا مال ہڑپنے کے لیے اسے اپنی بیوی بنالیا کرتا تھا، بسا اوقات وہ پہلے سے ہی شادی شدہ ہوتا تھا، اسلام نے اس طریقے کو ختم کیا اور حکم دیا کہ اگر تمہیں یہ ڈر ہے کہ تم یتیموں کے ساتھ انصاف نہ کرسکو گے تو تم نکاح کر سکتے ،ہو جو عورتیں تمہیں پسند ہوں دو دو، تین تین، چار چار سے اور اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ تم ان کے ساتھ عدل نہ کرسکو گے تو پھر ایک ہی بیوی کرو یا وہ باندی رکھو جو تمہارے قبضے میں ہے، یہ طریقہ ناانصافی نہ کرنے کے زیادہ قریب ہے، مہر کے سلسلے میں فرمایا کہ بیویوں کو ان کا مہر خوش دلی کے ساتھ ادا کرو، البتہ اگر وہ اپنی خوشی سے خود چھوڑ دیں تو تم مزے سے کھا سکتے ہو۔

اسی سورت میں وراثت کے مسائل بھی ہیں، اس سے پہلے کچھ ہدایات ہیں مردوں کے لیے اس مال میں حصہ ہے جو ماں باپ اور اقارب نے چھوڑا ہے اور عورتوں کے لیے بھی اس مال میں حصہ ہے جو ماں، باپ اور رشتہ داروں نے چھوڑا ہے، خواہ وہ تھوڑا ہو یا زیادہ اور یہ حصہ قطعی طے شدہ ہے اور ترکہ تقسیم کرنے کے وقت اگر رشتہ دار، یتیم اور مسکین آئیں تو انہیں بھی کچھ دے دو اور ان سے اچھی بات کرو اور لوگوں کو ڈرنا چاہیے اس شخص کے ترکے کے

بارے میں اگر وہ پیچھے بے بس اولاد چھوڑ جائے۔

ان ہدایات کے بعد ترکے میں ورثاء کے شرعی حصوں کا بیان ہے۔ اس پارے کی آخری آیت میں ان عورتوں کا ذکر ہے جن سے نکاح نہیں کیا جاسکتا، فرمایا تم پر حرام کی گئیں تمہاری مائیں اور تمہاری بیٹیاں اور بہنیں اور پھوپھیاں اور خالائیں اور بھتیجیاں اور بھانجیاں اور تمہاری وہ مائیں جنہوں نے تمہیں دودھ پلایا ہے اور تمہاری دودھ شریک بہنیں اور تمہاری بیویوں کی مائیں اور تمہاری بیویوں کی وہ بیٹیاں جنہوں نے تمہاری گودوں میں پرورش پائی ہے جن سے تم نے صحبت کر لی ہو اور اگر صحبت نہ کی ہو تو پھر ان سے نکاح کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے اور تمہارے ان بیٹوں کی بیویاں جو صلبی ہوں اور یہ کہ تم ایک نکاح میں دو بہنیں جمع کرو، مگر جو پہلے ہو گیا سو ہو گیا اللہ تعالیٰ بخشنے والے اور رحم کرنے والے ہیں۔ اور جو عورتیں کسی کے نکاح میں ہوں وہ بھی حرام ہیں، البتہ جو عورتیں تمہاری مملوک ہوں یاد رہے یہ اس وقت کا حکم ہے جب جنگوں میں مردوں عورتوں اور بچوں کو گرفتار کر کے مملوک بنا لیا جاتا تھا، اسلام نے بہ تدریج اس رسم کو ختم کیا، آج غلامی کسی شکل میں بھی موجود نہیں ہے سورۃ نساء میں یہ بھی ارشاد فرمایا: مرد سربراہ ہیں عورتوں پر، اس لیے کہ اللہ نے بعض کو بعض پر برتری دی ہے اور اس لیے کہ مرد اپنا مال خرچ کرتے ہیں، عورتوں کے سلسلے میں ایک حکم یہ بھی ہے کہ جن عورتوں سے سرکشی کا اندیشہ ہو انہیں سمجھاؤ اور خواب گاہوں میں ان سے علیحدہ رہو اور ان کو بہ طور سزا کچھ مار بھی سکتے ہو، پھر اگر وہ تمہاری اطاعت گزار ہو جائیں پھر ان کو علیحدہ کرنے کے بہانے مت ڈھونڈو، یقین رکھو اللہ سب سے اعلا و اکبر ہیں اور اگر تمہیں میاں بیوی میں اختلاف کا اندیشہ ہو تو ایک حَکَم مرد کے رشتہ داروں میں سے مقرر کرو اور ایک عورت کے رشتہ داروں میں سے، وہ دونوں اصلاح کرنا چاہیں گے تو اللہ تعالیٰ ان کے درمیان موافقت کی صورت نکال دیں گے، فی الحقیقت اللہ تعالیٰ سب کچھ جانتے ہیں اور باخبر رہتے ہیں۔ والدین اور رشتہ داروں کے متعلق اللہ نے ارشاد فرمایا: اللہ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک مت ٹھہراؤ، والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کرو اور رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں، قریب اور دور کے

پڑوسیوں پاس بیٹھنے والوں، مسافروں اوران غلام باندیوں سے جوتمہاری ملکیت میں ہیں حسن سلوک کرو، آگے نماز اور طہارت کے کچھ احکام ہیں۔

اے ایمان والو! تم نشے کی حالت میں نماز کے قریب مت جایا کرو، یہاں تک کہ تم یہ سمجھنے لگو کہ کیا کہہ رہو اور نہ ناپاکی کی حالت میں نماز کے پاس جاؤ الا یہ کہ مسافر ہو، جب تک غسل نہ کرلو، اوراگر تم بیمار ہو، یا سفر میں ہو یا تم میں سے کوئی قضائے حاجت سے فارغ ہوا ہو یا تم بیویوں کے پاس گئے ہو اور تمہیں پانی نہ ملے تو تم پاک صاف مٹی سے تیمّم کرلیا کرو اور اپنے چہروں اور ہاتھوں پر پھیرلیا کرو، اس کے بعد اہل کتاب کی ضلالت وگم راہی کا کچھ ذکر ہے، پھر یہ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ یہ گناہ معاف نہیں کرتے کہ اس کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرایا جائے، اس کے علاوہ گناہ جس کے لیے چاہیں معاف کردیتے ہیں، کچھ آیتوں کے بعد مسلمانوں کو یہ تلقین فرمائی کہ اللہ تعالیٰ تمہیں حکم دیتے ہیں کہ تم امانتیں اہل امانت کے سپرد کرو اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو انصاف کے ساتھ فیصلہ کرو، اللہ تعالیٰ تمہیں بہترین نصیحتیں فرماتے ہیں، بلاشبہ اللہ تعالیٰ سب کچھ دیکھنے اور سننے والے ہیں، اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول کی اور اپنے حکام کی اطاعت کرو پھر اگر تمہارے درمیان کوئی اختلاف ہوجائے تو اللہ اور رسول اللہ کی طرف رجوع کرلیا کرو، اگر تم حقیقت میں اللہ پر اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے ہو، یہی بہتر بات ہے اور اسی کا اچھا انجام ہے، اس کے بعد ان منافقین کا ذکر ہے جو زبان سے تو ایمان کا دعوی کرتے ہیں مگر عمل میں شیطان کے متبع ہیں، فرمایا: کیا آپ نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو اس کتاب پر ایمان لانے کا دعوی تو کرتے ہیں جو آپ کی طرف نازل کی گئی ہے اور ان کتابوں پر بھی جو آپ سے پہلے نازل کی گئیں تھیں مگر چاہتے یہ ہیں کہ اپنا فیصلہ کرانے کے لیے شیطان کی طرف رجوع کریں، حالاں کہ انہیں یہ حکم دیا گیا ہے کہ وہ شیطان کو تسلیم نہ کریں، شیطان انہیں گم راہ کرکے گم راہی کی انتہا تک پہنچانا چاہتا ہے اور جب ان سے یہ کہا جاتا ہے کہ وہ اس حکم کی طرف آجائیں جو اللہ نے نازل کیا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف آجائیں تو آپ منافقین کو دیکھتے ہیں کہ وہ آپ سے دور بھاگتے ہیں۔

دو تین آیتوں کے بعد اس مضمون کو قطعیت کے ساتھ اس طرح بیان فرمایا کہ آپ کے رب کی قسم یہ لوگ اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتے جب تک آپ کو اپنے باہمی اختلافات میں فیصل تسلیم نہ کرلیں اور اس کے بعد آپ کے فیصلے سے اپنے دل میں کوئی تنگی محسوس نہ کریں بلکہ خوشی کے ساتھ اس کو قبول کرلیں، آگے یہ بھی فرمایا کہ جو لوگ اللہ ورسول کی اطاعت کریں گے وہ ان لوگوں کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ نے انعام فرمایا ہے یعنی انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین کے ساتھ اور کیسے اچھے ہیں یہ رفیق، کچھ آیات کے بعد ان منافقین کا ذکر ہے کہ آپ نے ان لوگوں کو بھی دیکھا ہے جن سے کہا گیا تھا کہ اپنے ہاتھ روکے رکھو، نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دیتے رہو، پھر جب ان پر جہاد ضروری قرار دیا گیا تو ان میں سے ایک فریق کا حال یہ ہے کہ وہ لوگوں سے اس طرح ڈرتے ہیں جیسے اللہ سے ڈرتے ہوں یا اس سے بھی زیادہ اور کہنے لگے کہ اے اللہ آپ نے ہم پر جنگ کا حکم کیوں نازل کردیا، کچھ دیر اس حکم کو ٹال دیتے، آپ فرما دیجئے کہ دنیا کا مال ومتاع مختصر ہے اور آخرت پرہیز گاروں کے لیے بہتر ہے، تم پر ذرہ برابر بھی ظلم نہیں کیا جائے گا، جہاں تک موت کا سوال ہے موت تمہیں ہر حال میں پالے گی خواہ تم کہیں بھی ہو، اگرچہ تم مضبوط قلعوں کے اندر رہو!

کچھ باتیں دیارِ حرم کے مسافروں سے!

حج کے دِن قریب آتے جارہے ہیں، جو مسلمان سفرِ حج کا اِرادہ کر چکے ہیں اُن کی تیاری آخری مرحلہ میں ہے، بہت جلد وہ اس بلدامین کی مقدس سرزمین پر اپنے قدم رکھیں گے جہاں بیت اللہ شریف واقع ہے، اس گھر کو اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لیے تعمیر کئے جانے والے پہلے گھر کا شرف حاصل ہے۔

''اللہ تعالیٰ کا پہلا گھر جو لوگوں کے لیے مقرر کیا گیا ہے وہی ہے جو مکہ مکرمہ میں ہے اور جو تمام لوگوں کے لیے ہدایت و برکت والا ہے۔'' (آل عمران:96)

اللہ رب العزت نے اپنے اس گھر کو اس قدر عزت وعظمت سے نوازا ہے کہ اس نے رہتی دُنیا تک اسے مسلمانوں کا قبلہ بنا دیا، دُنیا بھر میں جہاں کہیں بھی مسلمان ہیں وہ اسی کی طرف رُخ کر کے اپنی تمام نمازیں ادا کرتے ہیں اور قیامت تک اسی طرح ادا کرتے رہیں گے، صرف اتنا ہی نہیں بلکہ اِسلام کے پانچ ارکان میں سے ایک رکن یعنی حج کو بھی اس گھر کے ساتھ مربوط کیا گیا، خانۂ کعبہ کی تعمیر سے لے کر آج تک بندگانِ خدا ندائے ابراہیمی پر لبیک کہتے چلے آرہے ہیں اور آئندہ بھی اس پکار پر اسی طرح لبیک کہتے رہیں گے، بیت اللہ کی تعمیر مکمل ہونے کے بعد اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حکم دیا تھا کہ وہ لوگوں میں حج کا اعلان کریں:

''اور لوگوں میں حج کا اعلان کیجئے لوگ آپ کے پاس چلے آئیں گے پیدل بھی اور دبلی اونٹنیوں پر بھی جو کہ دور دراز راستوں سے پہنچی ہوں گی۔'' (الحج:27)

خوش قسمت ہیں وہ لوگ جنہوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی یہ آواز سنی اور اس پر لبیک کہا اور اس طرح انہیں اِسلام کا ایک اہم رکن ادا کرنے کی سعادت حاصل ہوئی، یہ رکن جسے شریعت کی اصطلاح میں ''حج'' کہا جاتا ہے زندگی میں صرف ایک مرتبہ فرض ہے اور ان لوگوں پر فرض ہے جو اس کی اِستطاعت رکھتے ہیں، اِستطاعت کا مفہوم یہ ہے کہ کسی شخص کے پاس مکہ مکرمہ تک جانے اور واپس آنے کا خرچ ہو اور واپسی تک اس کے اہل وعیال کی

ضروریات کے لیے بھی مصارف موجود ہوں:

''اور اللہ کے لیے لوگوں پر اس مکان کا حج کرنا ہے اس شخص کے ذمے جو کہ وہاں تک پہنچنے کی طاقت رکھے۔''(آل عمران:97)

حضرت عبداللہ ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: لوگو! اللہ نے تم پر حج فرض کیا ہے، یہ سن کر حضرت اقرع ابن حابسؓ کھڑے ہوئے اور عرض کیا یا رسول اللہ! ہر سال؟ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اگر میں ہاں کہہ دیتا تو ہر سال کے لیے فرض ہو جاتا اور اگر فرض ہو جاتا تو تم ادا نہ کر پاتے اور نہ اس کی اِستطاعت رکھتے، اس لیے حج ایک مرتبہ ہے جو ایک سے زیادہ مرتبہ حج کرے وہ نفل ہے۔ (مسند احمد:1 / 255،رقم الحدیث:2304۔سنن نسائی:5 / 110،رقم الحدیث:2619)

وہ شخص بڑا خوش نصیب ہے جسے اسلام کے اس اہم رکن کی ادائیگی کی سعادت حاصل ہو اور اس سے بھی زیادہ خوش نصیب وہ شخص ہے جو اس عبادت کو محض دنیوی نام ونمود کے لیے ادا نہ کرے بلکہ اس کا مقصد فرض کی ادائیگی کے ساتھ ساتھ حج کی برکتوں، سعادتوں اور رحمتوں کا حصول بھی ہو اور وہ اس فرض کی تکمیل اس طرح کرے کہ اس کا حج؛ حج مبرور بن جائے، جس کی بڑی فضیلت وارد ہے، حدیث شریف میں ہے کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اِرشاد فرمایا:

''الحج المبرور لیس له جزاء الاّ الجنة''(صحیح البخاری :2/ 629،رقم الحدیث:1683)

''حج مبرور کا ثواب صرف جنت ہے۔''

شارحین حدیث نے لکھا ہے کہ حج مبرور وہ ہے جس میں حاجی سے کوئی گناہ سرزد نہ ہو اور اس کے تمام کام سنت کے مطابق انجام پائیں، قرآن کریم کی اس آیت میں یہی مراد ہے:

''سو جو شخص ان میں حج مقرر کرے تو پھر نہ کوئی فحش بات ہے اور نہ کسی قسم

کا جھگڑا ہے حج میں۔‘‘(البقرۃ:197)

مسافرانِ دیارِ حرم پا بہ رکاب ہونے سے پہلے کچھ دیر ٹھہر کر سوچیں کہ انھوں نے اپنے حج کو حج مبرور بنانے کے لیے کیا کچھ تیاری کی ہے؟ سفر حج کے کچھ قانونی تقاضے ہیں وہ پورے کر لیے گئے ہوں گے، پاسپورٹ، ویزا ٹکٹ، کرنسی، احرام سب چیزیں ضروری ہیں، یقیناً ان ضروریات کی تکمیل کر لی گئی ہوں گی، بہ ظاہر تیاری پوری ہو چکی ہے اور اب اس سفر میں کسی طرح کی رکاوٹ کا کوئی امکان نہیں ہے مگر اس سے بڑھ کر تیاری روح کی تیاری ہے اور ان ضروریات کی تکمیل ہے جن کا تعلق دِل سے ہے، حج میں جانے سے پہلے ہمیں اس روحانی تیاری پر بھی اپنی توجہ مرکوز رکھنی چاہیے، ہم اس سفر کے دوران پیش آنے والی ہر ضرورت کی چیز فراہم کرنے میں لگے ہیں اور پوچھ پوچھ کر ضرورت کی تمام چیزیں مہیا کر رہے ہیں، ایسا نہ ہو کہ کوئی چیز رہ جائے اور راستہ میں یا حرمین شریفین میں قیام کے دوران پریشانی اُٹھانی پڑے، اگر ہمیں احساس نہیں تو حج سے متعلق ان اُمور کا نہیں جن پر اس اہم عبادت کی صحت اور مقبولیت کا دارومدار ہے اور جن کے بغیر یہ سفر محض مالی اخراجات کا ذریعہ اور جسمانی مشقت کا باعث ہے۔

اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کو حج کی سعادت حاصل کرنے کی توفیق دے، اگر آپ اس سعادت کے مستحق بن چکے ہیں تو جس طرح آپ قانونی تقاضوں کی تکمیل میں مصروف ہیں، اسی طرح روحانی تقاضوں کی تکمیل میں بھی کچھ وقت صرف کریں۔

مسلمان کی شان یہ ہے کہ اس کا ہر عمل اور اس کی ہر عبادت اللہ رب العزت کی خوشنودی اور اس کی رضا کے لیے ہوتی ہے، اگر آپ حج اس لیے کر رہے ہیں کہ آپ واپسی کے بعد ’’حاجی‘‘ کہلائیں گے اور لوگ آپ سے معانقے اور مصافحے کریں گے، دُعاؤں کی درخواست پیش کریں گے یا آپ اس لیے حج کر رہے ہیں کہ ان لوگوں کی تنقید سے محفوظ رہیں گے جو آپ کی مالی وسعت و اِستطاعت کے حوالہ سے حج نہ کرنے پر مطعون کرنے والے ہیں، اگر حج کے پیچھے یہ ارادے ہیں تو یاد رہے کہ اللہ کو آپ کے اس حج کی ضرورت نہیں ہے، ہوسکتا

ہے آپ کے ذمے سے فرضیت ساقط ہو جائے، لیکن ایسا حج ''حج مبرور'' نہیں بن سکتا، کیوں کہ حج کی پہلی شرط ہی یہ ہے کہ آپ کا حج محض اللہ کی رضا کے لیے ہو، قرآن کریم میں ہے:

''اور حج اور عمرہ کو اللہ کے لیے پورا کرو۔'' (البقرۃ:196)

یاد رہے کہ تمام اعمال کی صحت اور قبولیت کا دارومدار نیت کی دُرستگی پر ہے، اللہ تعالیٰ کا اِرشاد ہے:

''حالاں کہ ان لوگوں کو یہی حکم ہوا تھا کہ اللہ کی اس طرح عبادت کریں کہ عبادت اسی کے لیے خاص رکھیں۔'' (سورۃ البینۃ:5)

مشہور حدیث ہے:

''انما الاعمال بالنیات ولکل امرء مانوی.''

''تمام اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے اور ہر شخص کو اس کی نیت کے مطابق ہی اجر ملنے والا ہے۔'' (صحیح البخاری:1 / 3 / رقم الحدیث:1)

اِخلاصِ نیت کے بعد ضروری ہے کہ حج کے لیے نکلنے سے پہلے اپنے سابقہ اعمال پر نگاہ دوڑائی جائے، زندگی میں کتنے فرائض وواجبات چھوڑے ہیں، کتنے گناہوں کا اِرتکاب کیا ہے، پھر ان گناہوں میں وہ گناہ کتنے ہیں جن کا تعلق بندگانِ خدا سے ہے، غیبت، چغل خوری، حق تلفی، ظلم وزیادتی، نااِنصافی، بددیانتی، اذیت کوشی یہ سب وہ گناہ ہیں جو ہم کسی احساس کے بغیر ہر وقت کرتے رہتے ہیں یہاں تک کہ ہم ان گناہوں کے اس قدر عادی ہو چکے ہیں کہ یہ گناہ ہماری روزمرہ کی زندگی کا حصہ بن چکے ہیں، یوں تو ہر مسلمان کے لیے ان گناہوں سے توبہ کرنا اور آنے والی زندگی میں ان سے بچنے کا عہد کرنا ضروری ہے جیسا کہ قرآن کریم میں ہے: ''اور اے مومنو! تم سب اللہ سے توبہ کرو تاکہ تم سب فلاح پاؤ۔'' (النور:31)

لیکن حجاج کرام کے لیے تو روح کی پاکیزگی اس لیے بھی ضروری ہے کہ وہ اللہ کے گھر اس کے مہمان بن کر جا رہے ہیں، جیسے دُنیا میں مہمان صاف ستھرا ہو کر میزبان کے گھر پہنچتا ہے اسی طرح ان مہمانوں کے لیے بھی ضروری ہے کہ وہ تمام آلائشوں اور کدورتوں سے

پاک صاف ہوکر اللہ کے گھر میں قدم رکھیں اور اس تزکیہ وتطہیر کا واحد ذریعہ توبہ ہے، حدیث شریف میں ہے:

"التائب من الذنب کمن لا ذنب له" (سنن ابن ماجة :1 / 594، رقم الحدیث:1815)

"گناہوں سے توبہ کرنے والا ایسا ہے جیسے اس سے کوئی گناہ ہی سرزد نہ ہوا ہو۔"

یہ تو ان گناہوں کا حال ہوا جو اللہ تعالیٰ سے متعلق ہیں اور اللہ اپنے فضل وکرم سے ان گناہوں کو معاف کرنے پر قادر ہے، دیکھا جائے تو یہ بندے اور اس کے خالق کے درمیان کا معاملہ ہے، لیکن ان سے بڑھ کر وہ کوتاہیاں اور لغزشیں ہیں جن کا تعلق حقوق العباد سے ہے، ان تمام کوتاہیوں کے لیے متعلقہ لوگوں سے معافی مانگنا (اگر وہ زندہ ہوں) ضروری ہے اور زندہ نہ ہوں تو ان کے لیے زیادہ سے زیادہ اِیصالِ ثواب کرنا چاہیے تاکہ قیامت کے دن وہ اپنے نامہ اعمال میں آپ کے بھیجے ہوئے تحائف وہدایا دیکھ کر نرم پڑ جائیں، اس طرح کی معافی کا تعلق بھی ان کوتاہیوں سے ہے جو مالیات کے شعبہ سے نہ ہوں، مثلاً: کسی پر ظلم کیا ہو، اس کے سامنے یا پیٹھ پیچھے اسے برا کہا ہو، اس کی غیبت کی ہو، اس کو اذیت پہنچائی ہو، لیکن اگر کسی کو مالی نقصان پہنچایا ہو، اس کی زمین دبائی ہو، یا مکان غصب کیا ہو، یا کسی کو وراثت میں حصہ نہ دیا ہو، یہ تمام وہ گناہ ہیں جو متعلقہ لوگوں سے براہِ راست معاف کرانے ہوں گے یا ان کی معافی کی صورت یہ ہوگی کہ جو کچھ مالی واجبات کسی دوسرے کے ہیں وہ پورے طور پر ادا کئے جائیں الّا یہ کہ حق والے خود ہی اپنا حق چھوڑنے پر راضی ہو جائیں، بسا اوقات حق کی ادائیگی میں اس قدر تاخیر ہوتی ہے کہ حق دار لوگ دُنیا سے رُخصت ہو جاتے ہیں، ایسی صورت میں اس کے تمام ورثا سے رابطہ قائم کرنا ضروری ہے، اگر ایک بھی وارث ایسا باقی رہ گیا جس تک اس کا حصہ نہیں پہنچایا گیا یا اس سے معاف نہیں کرایا گیا تو اس کے ذمے یہ حق بہ دستور باقی رہے گا اور کوئی صورت اس سے براءت کی نہیں ہوگی۔

آج کل حج پر جانے والوں کی تعداد بہت زیادہ ہوتی ہے، ہندوستان سے بھی ہر

سال لاکھوں افراد حج کمیٹی کے ذریعہ اور پرائیویٹ ٹور آپریٹرز کے ذریعہ حج کرنے جاتے ہیں، اس کثرت تعداد کا سب سے خوش آئند پہلو یہ ہے اب مسلمانانِ ہند بھی خوش حالی کی طرف قدم بڑھا رہے ہیں اور ان میں مذہب کے تئیں جذبہ اور جوش بھی پیدا ہو رہا ہے، اس سلسلہ میں دیکھنے والی بات یہ ہے کہ مسافرانِ حرم میں سے کتنے لوگ یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان کا سفر ایسے مال سے ہو رہا ہے جس میں کسی حرام کی آمیزش نہیں ہے؟ کیوں کہ حج ایسے مال سے کرنا چاہئے جو بالکل جائز ذرائع سے حاصل کیا گیا ہو۔ رشوت، غصب، چوری، غبن یا ایسے ہی غیر شرعی اور غیر قانونی ذرائع سے حاصل کی جانے والی دولت کے ذریعہ حج قبول نہیں ہوسکتا۔ ایک روایت میں ہے:

”اذا خرج بالنفقة الخبيثة فوضع رجله في الغرز فنادى لبيك ناداه مناد من السماء لالبيك ولاسعديك زادك حرام ونفقتك حرام وحجك مازور، غير مبرور.“ (المعجم الكبير للطبراني :20/40،رقم الحديث:1299)

ترجمہ: ”جب کوئی حاجی مال حرام لے کر نکلتا ہے اور سواری پر اپنا پاؤں رکھتا ہے اور لبیک کہتا ہے تو آسمان سے ندا آتی ہے تیری لبیک قبول نہیں ہے اور نہ تیرا یہ سفر خیر وسعادت کا باعث ہے، تیرا زادِ راہ حرام ہے، تیرا مال حرام ہے، تیرا حج گناہوں سے بھرپور اور غیر مبرور ہے۔“

اسی طرح کی ایک روایت میں ہے:

”يطيل السفر اشعث اغبر يمد يديه الى السماء يقول: يارب يارب ومشربه حرام وملبسه حرام وغذى بالحرام فاني يستجاب لذلك.“(صحيح مسلم:1/100)

”ایک شخص طویل سفر کرتا ہے، پریشان حال پراگندہ بال اپنے ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا کر کہتا ہے اے اللہ، اے اللہ! حالاں کہ اس کا کھانا اور پینا اور لباس حرام ہوتا ہے ایسی

صورت میں اس کی دعا کیسے قبول ہوسکتی ہے؟!''

یہ نیکی اور خیر وسعادت کا سفر ہے، جس طرح ہم دنیوی اسفار کے لیے سفر کی نوعیت کے لحاظ سے مناسب زادِراہ لے کر چلتے ہیں، اسی طرح اس سفر کے لیے بھی مناسب زادِراہ کی ضرورت ہے اور زادِراہ کا اِنتخاب خود قرآن کریم نے کیا ہے، ایک مومن کے لیے اس سے بڑھ کر نہ کوئی متاعِ سفر ہوسکتا ہے اور نہ کوئی زادِراہ، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''اور زادِراہ لے کر چلو بلاشبہ تقویٰ سے بڑھ کر کوئی زادراہ نہیں ہے۔'' (البقرۃ: 197)

تقویٰ کے معنی یہ ہیں کہ دل میں اللہ کا خوف اور اس کی خشیت ہو، یہ خوف وخشیت ہی اِنسان کو ظاہر وباطن کے گناہوں سے محفوظ رکھتی ہے اور حج کے سفر میں یہی مطلوب بھی ہے، جیسا کہ قرآن کریم میں ہے:

''حج کے دوران نہ کوئی فحش اور گناہ ہے اور نہ کوئی جھگڑا۔'' (البقرۃ:197)

کہہ کر واضح کر دیا گیا کہ اس سفر کا اصل توشہ تقویٰ ہے، آج کل کے زمانہ میں سامانِ سفر کی زبردست تیاری کی جاتی ہے اور ایک ایک حاجی ضرورت سے زیادہ سامان اُٹھائے نظر آتا ہے، لیکن جو اصل زادِراہ ہے اسے حاصل کرنے کی فکر بہت کم لوگوں میں پائی جاتی ہے، حالاں کہ وہی مقصودِ حقیقی ہے، اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ حج کی جان اور رُوح تقویٰ اور خوفِ اِلٰہی ہے، گھر سے باہر قدم رکھنے سے لے کر واپس آنے تک حاجی کے ہر عمل میں تقوے کی یہ کیفیت برقرار رہنی چاہیے، بعد میں بھی حج کی سعادت حاصل ہونے پر مغرور نہ ہو، اللہ کا خوف اس وقت بھی غالب رہے، گناہوں سے بچے، ایسا نہ ہو کہ گناہ نیکیوں کو ضائع کر دیں اور ان کے اثرات کو ختم کر دیں، حدیث شریف میں ہے کہ انسان حج کے بعد گناہوں سے اس طرح پاک صاف ہو جاتا ہے جیسے وہ آج ہی ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا ہو۔ (صحیح البخاری:5/ 400، 1424)

قبولیت حج کی علامت ہی یہ ہے کہ حاجی کا دِل دُنیا کی محبت سے فارغ اور آخرت کی

طرف راغب ہو جاتا ہے، اس کے گناہ معاف ہو جاتے ہیں اور اس کی دُعائیں قبول کی جاتی ہیں، حج کے بعد تقوے کی ضرورت اس لیے بھی ہے کہ شیطان دِل میں غرور پیدا کر دیتا ہے، جس سے اس کا سارا عمل ضائع اور بے کار چلا جاتا ہے، حاجی کے پاس دُنیا کا زادِ راہ بہ قدرِ ضرورت ہو لیکن اِخلاص، للّٰہیت، اِتباعِ سنت، اِنابت اِلی اللہ اور خوف وخشیت کا توشہ اتنا ہونا چاہئے کہ وہ سفرِ حج کے دوران بھی قدم قدم پر کام آئے اور واپسی پر بھی اتنا بچ جائے کہ زندگی بھر کام آتا رہے۔

عصری تعلیم کے ساتھ دینی تعلیم بھی ضروری ہے

ہمارے دانش ور طبقہ کو کبھی بھول کر بھی یہ خیال نہیں آتا کہ نونہالانِ قوم کو عصری تعلیم کے ساتھ دینی تعلیم بھی دینی چاہیے، اس کے برعکس وہ اس نہج پر ضرور سوچتے ہیں کہ طلبہ مدارس کے لیے دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ عصری تعلیم بھی ضروری ہے۔ اس موضوع پر اتنا کچھ لکھا گیا ہے کہ اب اخبارات میں صرف اسی کی صدائے بازگشت سنائی دیتی ہے، عصری تعلیم گاہوں کی کوئی بات بھی نہیں کرتا۔ بلاشبہ دینی تعلیم کے ساتھ اگر کچھ ضروری تعلیم عصریات کی بھی ہو جائے تو ہمارے دینی مدارس دین و دُنیا کے اس امتزاج کے ساتھ زیادہ بہتر انداز میں خدمت کر سکتے ہیں، لیکن مدارس کی اِصلاح کے چکر میں پڑ کر ہمیں ان بچوں کو فراموش نہیں کرنا چاہیے جو محض دنیوی تعلیم میں لگے ہوئے ہیں اور انہیں یا ان کے سر پرستوں، یا ان کے ٹیچروں کو کبھی بھول کر بھی یہ خیال نہیں آتا کہ ہمارے بچوں کو دین کا اتنا علم ضرور ہونا چاہیے جو انہیں اچھے تعلیم یافتہ اِنسان کے ساتھ ساتھ اچھا مسلمان بھی بنا سکے۔ اس وقت اخبارات میں ہائی اسکول اور انٹر میڈیٹ کے سالانہ نتائج پر کافی کچھ آ رہا ہے۔ جو بچے اپنے شہروں میں یا قصبوں میں اِمتیازی نمبرات سے کامیاب ہوئے ہیں ان کے فوٹو چھپ رہے ہیں، انٹرویو شائع کیے جا رہے ہیں، ہر طرف خوشی کا ماحول ہے۔ جن اسکولوں اور کالجوں کا رزلٹ اچھا رہا ہے ان کی کوششوں کو خوب سراہا جا رہا ہے، اور جن اسکولوں کا رزلٹ مایوس کن رہا ہے ان پر تنقید کے نشتر بھی چل رہے ہیں۔ پوری قوم عصری تعلیم کے نشہ میں سرشار ہے، جو کچھ ہو رہا ہے، بہت اچھا ہو رہا ہے، لگتا ہے عصری تعلیم کے تئیں قوم بیدار ہو چلی ہے۔ یقینی طور پر قوم کو انجینئروں کی، ڈاکٹروں کی اور دُوسرے ماہرین کی ضرورت ہے اور یہ ضرورت عصری تعلیم گاہوں سے ہی پوری ہو سکتی ہے۔ ملت میں عصری تعلیم کے تئیں زبردست بیداری آئی ہے، یہ بڑی خوش آئند بات ہے اس کی جتنی بھی پذیرائی کی جائے کم ہے، مگر یہاں کچھ ایسے پہلو بھی ہیں جن پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔

عصری تعلیم کے شور میں دِین کا پہلو نگاہوں سے اوجھل ہوتا جا رہا ہے، یہ ایسا نقصان

ہے جس کی تلافی ممکن نہیں۔ آج ڈاکٹروں، انجینئروں اور دُوسرے پیشہ وروں کی ایسی ٹیم تیار ہو رہی ہے جو صرف نام کے مسلمان ہیں۔ یہ ان کا قصور نہیں ہے، قصور اس نظامِ تعلیم کا ہے جس نے ان کا راستہ غیر محسوس طریقہ سے الگ کر دیا ہے۔ بچہ کی پیدائش کے بعد سے ہی ماں باپ کو یہ فکر ستانے لگتی ہے کہ ان کا بچہ اس نظامِ تعلیم میں کہاں اور کس طرح فٹ ہوگا؟ کیوں کہ وہ یہ بات جانتے ہیں کہ اگر اس کے لیے ابھی سے جدوجہد نہ کی گئی تو وہ ترقی کی دوڑ میں پیچھے رہ جائے گا۔ اس فکر نے ماں باپ کو ان کے اس فرض سے غافل کر دیا ہے کہ وہ اپنے بچہ کو ایک اچھا مسلمان بنانے کی سعیِ پیہم بھی کریں۔ بچہ ابھی ٹھیک سے ہوش بھی نہیں سنبھالتا کہ اسے انگلش میڈیم اسکول میں داخل کر دیا جاتا ہے، اس اسکول سے وہ بہترین انگریزی بولتا ہوا نکلتا ہے ہندو اور عیسائی مذہب کے متعلق اسے بہت سی باتیں معلوم ہو جاتی ہیں لیکن وہ اپنے مذہب سے قطعی بے گانہ رہتا ہے، ماں باپ یہ سوچ کر خوش ہوتے رہتے ہیں کہ ہمارے بچہ نے ترقی کی شاہراہ پر قدم بڑھا دیے ہیں، ان بیچاروں کو یہ معلوم نہیں کہ ترقی کا یہ صرف ایک رُخ ہے، یقیناً ان کا بچہ بڑا ہو کر اچھا پیشہ ور انسان ضرور بنے گا اور لاکھوں کما کر گھر بھر دے گا، لیکن اس کے دِل کی دُنیا دِین جیسی بیش قیمت متاعِ زندگی سے خالی رہ گئی ہے اسے کون پُر کرے گا؟

مسلمان اور دین دونوں لازم اور ملزوم ہیں۔ دین کا ایک علم تو وہ ہے جو مکمل نظام کے ساتھ اِسلامی مدارس میں جاری ہے، جہاں مفسر، محدث اور فقیہ پیدا کیے جاتے ہیں۔ یقیناً یہ بڑا کام ہے اور اُمت کو دینی رہنمائی کے لیے ماہر علماء کی سخت ضرورت ہے، مگر یہ ضرورت ایک محدود تعداد پر ختم بھی ہوسکتی ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے قوم کو میڈیسن، انجینئرنگ اور لاء وغیرہ کے شعبوں میں ماہرین کی ضرورت ہے، مگر یہ ضرورت اس وقت پوری ہوسکتی ہے جب ایک معقول تعداد ان ماہرین کی پیدا ہو جائے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جس طرح قوم کے ہر فرد کا ڈاکٹر یا انجینئر بننا ضروری نہیں ہے اسی طرح قوم کے ہر فرد کا محدث، فقیہ اور مفسر بننا بھی ضروری نہیں ہے، لیکن بعض چیزیں ایسی بھی ہیں جو ہر شخص کے لیے ضروری ہیں، مثال کے طور پر ایک اچھا شہری بننے کے لیے یہ جاننا ضروری ہے کہ ملک کا قانون کن اُمور کو صحیح اور کن اُمور کو

غلط کہتا ہے، نہ صرف جاننا ضروری ہے بلکہ صحیح اُمور پر چلنا اور غلط اُمور سے بچنا بھی ضروری ہے۔ ملک کا قانون ہمیں فتنہ وفساد اور شر انگیزی سے روکتا ہے اور پُر امن بقائے باہم کے اُصول پر زندگی گزارنے کی ہدایت کرتا ہے۔ اس صورت میں ہمارے لیے لازم ہے کہ ہم ملکی قوانین پر عمل کرتے ہوئے ہر ایسے کام سے بچیں جس سے معاشرہ میں فتنہ وفساد پھیلتا ہو اور ہر وہ کام کریں جس سے امن وامان کو فروغ ملتا ہو۔ اسی طرح ہمیں یہ جاننے کی بھی ضرورت ہے کہ ایک اچھا مسلمان بننے کے لیے ہمیں کیا کرنا چاہیے، کن چیزوں کو اِختیار کرنا چاہیے اور کن چیزوں سے اِجتناب کرنا چاہیے، یہ وہ ضرورت ہے جس کا اظہار اس حدیث شریف میں کیا گیا ہے ''طلب العلم فریضة علی کل مسلم'' (ابن ماجہ ۱/ ۱۸ حدیث نمبر ۲۲۴) ''علم حاصل کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے۔'' اس علم کو جس کا اس حدیث میں ذِکر ہے اگر ہم ان علوم پر محمول کریں جو مدارسِ اِسلامیہ میں پڑھائے جارہے ہیں تو یہ بات ناقابلِ فہم ہے کہ ان علوم کا حصول تمام مسلمانوں پر فرض کر دیا جائے اور اگر دُنیوی علوم مراد لیں جیسا کہ بعض لوگ ''اطلبو العلم ولو کان بالصین'' ''علم حاصل کرو اگر چہ چین جانا پڑے'' جیسی ضعیف احادیث سے یہ اِستدلال کرتے ہیں کہ جدید علوم کا حصول بھی فرض کے درجہ میں ہے، کیوں کہ حدیث شریف میں چین جانے کی ہدایت بھی کی گئی ہے اور چین نہ پہلے علومِ دِینیہ کا مرکز تھا اور نہ آج ہے، وہ اُس زمانہ میں بھی ٹکنالوجی کا مرکز تھا اور آج بھی ہے، اس سے ثابت ہوا کہ اِسلام میں جدید علوم کے حصول کو بھی لازم قرار دیا گیا ہے، یہ دعویٰ بھی غلط ہے اور اِستدلال بھی، دعویٰ تو اس لیے غلط ہے کہ جدید علوم کا حصول سب کے لیے یکساں طور پر ضروری نہیں ہو سکتا اور نہ یہ ممکن ہے کہ سب لوگ ایک ہی راستہ کے مسافر بن جائیں، اس طرح تو زندگی کا سفر رُک سکتا ہے۔ اِستدلال اس لیے غلط ہے کہ اگر حدیث کے ضعف کو نظر انداز بھی کر دیا جائے تب بھی چین اصل میں دُوری کی علامت ہے، منشاءِ حدیث یہ ہے کہ علم حاصل کرو اگر چہ اس کے لیے کتنی ہی دور کیوں نہ جانا پڑے۔ اس سے معلوم ہوا کہ بعض علوم وہ بھی ہیں جو بلا استثناء سب پر فرض ہیں اور ان کے حصول کے لیے جد وجہد کرنا بھی فرض کے درجہ میں

ہے، ہم ان علوم کو دین کی بنیادی تعلیمات سے تعبیر کر سکتے ہیں۔

قوم کے نوجوان ترقی کی شاہراہ پر تو آگے بڑھ رہے ہیں مگر دین کے راستہ سے دور ہوتے جا رہے ہیں، کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ ہمارے بچے اس طرح آگے بڑھیں کہ وہ پکے سچے مسلمان بھی ہوں اور اعلیٰ تعلیم یافتہ شہری بھی! اس کے لیے والدین کے ساتھ ساتھ ان لوگوں کو بھی غور وفکر کرنے کی ضرورت ہے جو تعلیم کے میدان میں کام کر رہے ہیں۔ بچہ پیدا ہوتو جس طرح آپ کو یہ فکر ہوتی ہے کہ ہمارا بچہ کس مشہور ومعروف اور اعلیٰ معیار کے حامل اسکول میں تعلیم حاصل کرے گا؟ اسی کے ساتھ آپ کو یہ فکر بھی ہونی چاہیے کہ آپ کا بچہ دین دار کیسے بنے گا؟ یاد رکھیے اعلیٰ تعلیم یافتہ اِنسان بننے میں اور دین دار بننے میں کوئی تضاد نہیں ہے، ایک بچہ دین داری کے ساتھ دُنیا داری کے تقاضے بھی پورے کر سکتا ہے، اس کی کئی مثالیں ہمارے سامنے ہیں، لیکن وہ اتنی کم ہیں کہ ہم انہیں قابلِ تقلید نمونہ تو کہہ سکتے ہیں مگر ان پر قناعت نہیں کر سکتے، ان مثالوں کو عام کرنے کے لیے تعلیمی نظام میں بنیادی تبدیلیاں لانے کی ضرورت ہے۔

اس وقت ملت کے سامنے سب سے اہم کام یہ ہے کہ مسلمان نرسری اسکولوں سے لے کر کالج کی سطح تک تمام ادارے اپنے قائم کریں، پھر ان اداروں میں دینیات کو لازمی مضمون کی حیثیت سے اِختیار کریں۔ اگر بچے کو نرسری سے لے کر کالج کی سطح تک دِینی تعلیم دی جاتی رہی تو جس وقت وہ عملی زندگی میں قدم رکھے گا ہر اعتبار سے مکمل اِنسان ہوگا، ایک ایسا اِنسان جس کے اندر تعلیمی صلاحیت بھی ہوگی، تہذیبی شعور بھی ہوگا اور دین کی سمجھ بھی، یہ نوجوان نہ صرف اپنے والدین کے لیے دُنیا وآخرت میں متاعِ گراں مایہ ثابت ہوگا بلکہ قوم و ملت کے لیے بھی باعث اِفتخار بنے گا۔

عصری علوم کے مدارس میں یہ غلط فہمی پھیلی ہوئی ہے کہ اگر ان میں مذہبی تعلیم دی جائے گی تو حکومت ان کو جو مالی تعاون دیتی ہے وہ بند ہو جائے گا اور ہوسکتا ہے ان اِداروں کی منظوری بھی ختم ہو جائے، یہ بڑی غلط فہمی ہے، دستور ہند کے آرٹیکل ۲۸ میں واضح طور پر کہا گیا ہے کہ ایسے تعلیمی ادارے جنہیں اقلیتیں چلا رہی ہیں اور جو حکومت سے منظور شدہ ہیں اور

جنہیں حکومت کی اِمداد مل رہی ہے ان میں مذہبی تعلیم دی جا سکتی ہے۔ یہاں یہ امر بھی ملحوظ رہے کہ اقلیتوں کو اپنے اداروں میں مخلوط تعلیم سے حتی الامکان بچنا چاہیے۔ مخلوط تعلیم اس دور کا وہ فتنہ ہے جس نے معاشرہ کو اخلاقی اعتبار سے تباہ وبرباد کر کے رکھ دیا ہے۔ آج جدید تعلیم یافتہ معاشرہ میں جس قدر برائیاں عام ہیں وہ ان ہی دو چیزوں کی وجہ سے ہیں، ایک دِینی تعلیم سے دُوری اور دُوسرے طلبہ و طالبات کا آزادانہ اِختلاط و میل وجول! ہم دِینی تعلیم کو اپنے اِداروں کے نصابِ تعلیم کا لازمی جز بنا کر اور مخلوط تعلیم سے دُور رہ کر ایک ایسا معاشرہ تشکیل دینے میں کامیاب ہو سکتے ہیں جو ایک طرف جدید تعلیم یافتہ بھی ہو اور دُوسری طرف اِسلامی تعلیمات پر عمل کرنے والا بھی!

یہ وقت تعلیمی سرگرمیوں کے آغاز کا زمانہ ہے، کوشش یہ ہونی چاہیے کہ ہمارے بچے ایسے ماحول میں تعلیم حاصل کریں جو دین کی آمیزش سے تیار کیا گیا ہو۔ اگر کسی جگہ اسکولوں اور کالجوں میں یہ ماحول میسر نہیں آتا تو گھر کی فضاؤں میں یہ ماحول بنانا ضروری ہے۔ اگر بچے اس ماحول سے محروم رہ گئے تو وہ آپ کی خواہش کے مطابق اچھے ڈاکٹر یا انجینئر یا قانون داں یا اکاؤنٹینٹ تو بن جائیں گے مگر اچھے مسلمان نہ بن سکیں گے! اور اس کی تمام تر ذمہ داری آپ پر ہوگی! والدین کی حیثیت سے آپ اس ذمہ داری سے سبکدوش نہیں ہو سکتے اور نہ آخرت کی جواب دہی سے دامن بچا سکتے ہیں!

ہمارے ملک میں مسئلہ صرف یہی نہیں ہے کہ عربی مدارس کے نصابِ تعلیم کو عصری تقاضوں سے ہم آہنگ بنایا جائے، مسئلہ یہ بھی ہے کہ عصری تعلیم کے اِداروں کے نصابِ تعلیم کو بھی دینی تقاضوں سے مربوط کیا جائے، دونوں ہی مسئلے اہم ہیں دونوں پر بہ یک وقت توجہ دینے کی ضرورت ہے، اگر مدارس میں عصری علوم کی شمولیت پر علماء اور ذمہ دارانِ مدارس کو غور کرنا چاہیے تو عصری تعلیم گاہوں میں دینی علوم کے اِضافے کے موضوع پر دانش وروں اور ماہرین تعلیم کو بھی توجہ دینی چاہیے۔

اسلام وصف اعتدال اور انتہا پسندی

سعودی عرب کے مقدس شہر مدینہ منورہ سے خبر آئی ہے کہ وہاں کی مشہور اسلامی یونیورسٹی میں دہشت گردی کے موضوع پر ایک بین الاقوامی کانفرنس کا انعقاد عمل میں آیا، اس چار روزہ کانفرنس میں دنیا بھر سے آنے والے علماء اور زعماء نے مساجد کے ائمہ اور خطباء سے کہا ہے کہ وہ اسلام کی اعتدال پسند تعلیمات عام کریں کانفرنس میں مسلم نوجوانوں پر زور دیا گیا ہے کہ وہ ویب سائٹس کے ذریعے رواداری اور اعتدال کی اسلامی اقدار سامنے لائیں اور دوسروں کے لئے داعی کے طور پر سرگرم ہوں، اس کانفرنس میں مسلمان گھرانوں سے درخواست کی گئی ہے کہ بچوں کو افہام وتفہیم کا کلچر سکھلایا جائے تا کہ وہ دوسروں کو قبول کرسکیں، غیر مسلم ملکوں میں رہنے والے مسلمانوں سے کہا گیا ہے کہ وہ اپنے بچوں کو اسلام فہمی کے محاذ پر اعتدال پسند بنائیں۔

اس میں شک نہیں کہ اسلام ایک اعتدال پسند مذہب ہے، اور وہ تمام تعلیمات میں اپنے اس وصفِ خاص میں ممتاز نظر آتا ہے، جہاں تک انتہا پسندی کا تعلق ہے اسلام اس کے دونوں جوانب کے خلاف ہے، اس انتہا پسندی کے بھی جس کے پہلو سے دہشت گردی جنم لیتی ہے، اور جہاں پہنچ کر عدل وانصاف کے تمام تقاضے رخصت ہوجاتے ہیں صرف ایک جنون باقی رجاتا ہے، آج جہاں کہیں بھی دہشت گردی نظر آرہی ہے وہ اسی جنون کے مختلف مظاہر ہیں، اسلام کو وہ انتہا پسندی بھی مطلوب نہیں جو کسی فرد یا قوم کو انتہائی بزدل بنادیتی ہے اور اس میں اتنی صلاحیت یا اتنا حوصلہ اور اتنی سکت بھی باقی نہیں رہتی کہ وہ اپنا حق لے سکے یا اپنا دفاع کرسکے۔ اسلام کی اعتدال پسندی یہ ہے کہ وہ اپنی جان ومال، اور دین ووطن کے دفاع اور تحفظ کے لئے سینہ سپر رہنے کی تلقین بھی کرتا ہے اور یہ بھی چاہتا ہے کہ کسی فرد یا قوم سے کسی دوسرے فرد یا قوم کو بلا قصور کوئی تکلیف نہ پہنچے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری آسمانی دین کو جن بے شمار خصوصیات اور امتیازات سے نوازا ان میں ایک وصفِ خاص اور ایک طرّۂ امتیاز یہ ہے کہ اس کا ہر حکم معتدل اور متوسط ہے اور افراط

وتفریط سے پاک ہے۔قرآن کریم میں ہے: ''اور اسی طرح ہم نے تم کو متوسط اور معتدل امت بنایا ہے۔'' (البقرۃ:۱۴۲) وسط اور اعتدال دونوں کا مفہوم تقریباً ایک ہی ہے، ائمہ لغت نے وسط کے معنی لکھے ہیں: الخیار و الاعتدال من کل شیٔ ''ہر شئی کا بہترین اور درمیانی حصہ وسط ہے''، بعض لغویین نے وسط کی تعریف کی ہے: الخیار والاعلی من کل شی ہر چیز کا بہترین اور اعلی پہلو وسط کہلاتا ہے۔لغت تصریحات کے مطابق اعتدال اور توسط کا حقیقی مفہوم یہ ہے کہ کسی چیز کے دو متضاد و بالمقابل پہلوؤں کے درمیان کا حصہ اس طرح اختیار کیا جائے کہ ان دونوں پہلوؤں میں سے ایک دوسرے پر غالب نہ آئے اور کسی بھی مرحلے میں افراط یا تفریط کا احساس نہ ہو۔

اسلام کا یہ وصف اعتدال ہمیں تمام تعلیمات میں نظر آتا ہے خواہ وہ تعلیمات عملی ہوں یا اعتقادی ہوں، خواہ ان کا تعلق عبادات سے ہو یا معاشرت سے، ہر معاملے میں اسلام یہی کہتا ہے کہ اعتدال اور میانہ روی اختیار کرو، اگر آپ تخلیقِ کائنات پر نظر ڈالیں تو ہمیں ہر چیز میں اعتدال اور توازن نظر آئے گا، مثال کے طور پر زمین کو دیکھئے کہ یہ اس قدر سخت بھی ہوسکتی تھی کہ نہ اسے کھودا جاسکتا، نہ اس میں کاشت کی جاسکتی، نہ اس میں سے پانی اور دوسرے ذخائر نکالے جاسکتے، اور اتنی نرم بھی ہوسکتی تھی کہ قدم جمانا دوبھر ہوجاتا، لیکن اللہ تعالیٰ نے اسے نرمی اور سختی کے درمیان متوازن بنایا۔اب ہم اس پر آسانی کے ساتھ چل پھر سکتے ہیں، اس کے سینے پر بڑی بڑی عمارتیں بنا کر کھڑی کر دیتے ہیں، دوسری طرف اس میں اتنی نرمی بھی رکھ دی کہ انسان اپنی ضرورت کی چیزیں اس سے پیدا کر سکے اور جو کچھ اللہ نے اس کے اندر ودیعت فرمادیا ہے اسے باہر نکال سکے۔خود انسان کی تخلیق بھی اسی اعتدال اور توازن کا مظہر ہے۔اس کے ہر ہر پہلو سے کمال اعتدال نمایاں ہے۔ہاتھ پاؤں، آنکھ، ناک سب اپنی اپنی جگہ متوازن ہیں، قد وقامت بھی معتدل ہے، نہ اسے انتہائی پستہ قد بنایا کہ اپنی زندگی کا بوجھ بھی نہ اٹھا سکے بلکہ خود دوسروں کے لئے بوجھ بن جائے اور نہ اتنا طویل القامت بنایا کہ چلنا پھرنا، اٹھنا بیٹھنا دوبھر ہوجائے۔اللہ کو طرح کی تخلیق پر قدرت حاصل ہے وہ کسی انسان کو انتہائی پستہ قد بھی بنا سکتا ہے اور انتہائی طویل قامت بھی، لیکن اس نے عام طور پر انسان کے قد

سے لے کر اس کے اعضاء بدن تک ہر چیز کو حد اعتدال میں رکھ کر یہ تعلیم دی ہے کہ خالق کائنات ہر شعبۂ زندگی میں اعتدال اور میانہ روی دیکھنا چاہتا ہے۔ ظاہری اعضاء بدن سے ہٹ کر دیکھیں، انسان کی طبیعت اور اس کا مزاج بھی معتدل بنایا گیا ہے۔ ذرا حدّ اعتدال سے انحراف ہوا جسمانی نظام میں اختلال واقع ہوا۔ میڈیکل سائنس یہ بات تسلیم کرتی ہے کہ انسان کی صحت مزاج کے اعتدال پر موقوف ہے، جب تک اس کا مزاج معتدل رہتا ہے وہ صحت مند رہتا ہے اور جوں ہی مزاج کے اعتدال میں فرق پڑتا ہے جسمانی صحت متاثر ہو جاتی ہے اور مختلف عوارض انسانی بدن کو گھیر لیتے ہیں۔ انسان کا بدن چار اخلاط خون، بلغم، سوداء، صفراء سے مرکب ہے، اسی طرح اس کے اندورنی نظام میں چار کیفیات گرمی، سردی، خشکی اور تری کا ہونا ضروری ہے، جب بھی ان چاروں اخلاط میں سے کوئی خلط یا ان چاروں کیفیات میں سے کوئی کیفیت کمی یا زیادتی کی طرف مائل ہوگی صحت کا نظام مختل ہو جائے گا۔

اگر ہم اسلام کی اعتقادی تعلیمات کی بات کریں تو ان میں بھی ہمیں یہی اعتدال اور توازن نظر آئے گا جسے امت محمدیہ کی خصوصیت قرار دیا گیا ہے۔ گزشتہ امتوں نے یہ وصف اعتدال کھودیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں اعتقاد کے باب میں افراط وتفریط کا پہلو نمایاں ہے۔ مثال کے طور پر یہودیوں اور عیسائیوں کا حال یہ تھا کہ وہ اپنے پیغمبر کے احترام میں اس قدر غلو کرنے لگے تھے کہ انھیں اللہ کا بیٹا سمجھتے تھے اور انھیں تین معبودوں میں سے ایک معبود قرار دیتے تھے۔ قرآن کریم نے ان دونوں امتوں کے اس رجحان کو اس طرح نمایاں کیا ہے:

ترجمہ: ''یہود کہتے ہیں کہ عزیر اللہ کے بیٹے ہیں اور نصاری کہتے ہیں کہ عیسٰی اللہ کے بیٹے ہیں۔'' (التوبة:۳۰)

ایک طرف حد درجہ غلو اور افراط کہ اللہ کے بندوں اور اس کے بھیجے ہوئے پیغمبروں کو انھوں نے اللہ کا بیٹا بنا کر انہیں مقام الوہیت پر بٹھا دیا، دوسری طرف اس معاملے میں اس قدر تفریط اختیار کی گئی کہ جب ان سے کہا گیا کہ تم رسولوں کا اتنا احترام کرتے ہو تو ان کی بات کیوں نہیں مانتے؟ جب وہ تمہیں ظالموں سے جنگ کرنے کا حکم دیتے ہیں تو جواب میں تم یہ کیوں کہتے ہو؟

ترجمہ: ''تم اورتمہارا رب جائے اور تم دونوں جنگ کرو، ہم تو یہاں بیٹھے ہیں۔''
(المائدۃ:۲۴)

امت محمدیہ کی خصوصیت یہ ہے کہ اس نے اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو مقام الوہیت پر فائز نہیں کیا بلکہ انھیں اللہ کا بندہ اور انسان سمجھا، لیکن اپنے پیغمبر کی عظمت اور اطاعت کو بھی فراموش نہیں کیا اور ان کی ذات پاک سے اس درجہ عشق کیا کہ جس کی نظیر انسانی تاریخ پیش کرنے سے قاصر ہے۔

عمل کے باب میں گزشتہ امتوں کے احوال پر نظر ڈالی جائے تو صرف امت محمدیہ ہی جادۂ اعتدال پر کھڑی نظر آتی ہے، باقی امتوں کا حال یہ ہے کہ ایک طرف تو ان امتوں کے کچھ لوگ آسمانی شریعت کے خلاف صف آراء نظر آتے ہیں یہاں تک کہ انجیل اور توریت جیسی آسمانی کتابوں کے احکام میں بھی وہ چند سکوں کے عوض تبدیلی کرنے سے گریز نہیں کرتے، دوسری طرف کچھ لوگ ایسے نظر آتے ہیں جن کی نظر میں شریعت کی اتباع اور ترک دنیا دونوں لازم وملزوم ہیں۔ اسلام عبادت کی تلقین تو کرتا ہے لیکن نہ اس قدر کہ آدمی عبادت کی خاطر سب کچھ چھوڑ بیٹھے۔ اس سلسلے میں وہ مشہور واقعہ پیش نظر رہنا چاہئے کہ کچھ صحابہ کرامؓ نے طے کیا کہ ہم دن میں مسلسل روزے رکھیں گے اور رات کو لگاتار نمازیں پڑھیں گے۔ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہوا تو آپ نے فرمایا کہ میں روزے بھی رکھتا ہوں اور افطار بھی کرتا ہوں۔ میں رات کو نماز بھی پڑھتا ہوں اور آرام بھی کرتا ہوں۔ اس ارشاد مبارک کا منشاء یہی ہے کہ اسلام کو ہر معاملے میں اعتدال مطلوب ہے، آپ روزہ بھی رکھیں اور افطار کر کے اپنے جسم کو پاکیزہ وحلال غذاؤں سے لطف اندوز ہونے کا موقع بھی فراہم کریں۔ آپ نمازیں بھی پڑھیں لیکن نیند کے ذریعے اپنے بدن کو آرام بھی دیں۔

اعتدال کی یہ تعلیم ہمیں ہر جگہ ملتی ہے، حد یہ ہے کہ ایسے معاملات میں بھی جن کا تعلق کسی عقیدے یا عبادت سے نہیں ہے ہم اعتدال کے ساتھ رہنے کے پابند بنائے جاتے ہیں، مال کسی بھی انسان کی اپنی پونجی ہے جسے وہ کما کر یا کسی اور ذریعے سے حاصل کرتا ہے، اسے اختیار

حاصل ہے کہ وہ اس مال کو جس طرح جی چاہے اور جہاں جی چاہے خرچ کرے، مگر اسلام نے بندے کو اس معاملے میں بھی آزاد نہیں چھوڑا، ایک طرف تو چند شرائط کے ساتھ اس کے مال میں زکوٰۃ کے نام سے غریبوں کا حق متعین کر کے اس پر یہ واضح کر دیا کہ اگر چہ یہ مال تمہاری ملکیت ہے، مگر تمہیں اس کا مالک اور متصرف اللہ نے بنایا ہے اس لئے ضروری ہے کہ تم اس کی مرضی کے مطابق اس میں تصرف کرو اور اس کے مالک بن کر رہو، پھر اللہ کا حق ادا کرنے کے بعد بھی تمہیں اپنے مال و دولت میں اعتدال کے ساتھ تصرف کرنا چاہئے، قرآن کریم میں ہے:

ترجمہ: ''اور نہ تم اپنے ہاتھ کو اپنی گردن میں باندھ لو اور نہ اسے پوری طرح کھول دو کہ حسرت زدہ اور رنجیدہ ہو کر بیٹھ جاؤ۔'' (الاسراء:۹۲)

ہمیں اسلام کی تمام تعلیمات میں اسی حسن اعتدال کی جھلک ملتی ہے، یہاں تک کہ انتہا پسندی کے باب میں بھی اسلام اسی جادۂ اعتدال پر گامزن نظر آتا ہے، آج دنیا انتہا پسندی اور اس کے پہلو سے جنم لینے والی دہشت گردی سے پریشان ہے بلا شبہ بے قصور انسانوں کو موت کے گھاٹ اتارنا، اور ان کی املاک تباہ کرنا انتہا پسندی ہے، لیکن ظلم برداشت کرنا اور حق تلفیوں پر خاموش رہنا بھی انتہا پسندی ہے۔ اسلام اس کی قطعاً اجازت نہیں دیتا۔

جہاں تک فتنہ وفساد اور قتل ناحق کا معاملہ ہے اسلام سے زیادہ کسی بھی مذہب نے اس کی مذمت نہیں کی۔ وہ سراپا امن مذہب ہے اور ہر طرف امن وسلامتی دیکھنا چاہتا ہے۔ جہاں تک افہام وتفہیم کا تعلق ہے اسلام سے زیادہ افہام وتفہیم کا قائل بھی کوئی دوسرا مذہب نہیں ہے، نہ اس میں جبر واکراہ ہے نہ ظلم وزیادتی ہے، نہ حق تلفی اور نا انصافی ہے، بلکہ ہر معاملے میں اس کا رویہّ مصالحت آمیز اور روادارانہ ہے۔ دہشت گردی اور انتہا پسندی کی مذمت بہت ہو چکی ہے اور ہم ہر سطح پر اس کے خلاف اس قدر بیان بازیاں کر چکے ہیں کہ اب دہشت گردی اور مسلمان ہم معنی بن گئے ہیں۔ اب ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم دوسری اقوام کی دہشت گردانہ کاروائیوں کا تجزیہ بھی کریں اور ان کے خلاف بھی آواز بلند کریں۔ محض کانفرنسوں میں مذمت کر دینے سے دہشت گردی کا خاتمہ ہونے والا نہیں ہے۔

اسلام، احترام انسانیت، مساوات اور دلت اقوام

ہندوستان میں دلت قومیں ہمیشہ سے پسماندہ رہی ہیں، تعلیم میں، اقتصادیات میں ،سیاست میں، سماج میں، ہر جگہ ان کو حاشیے پر رکھا گیا ہے، اگر چہ اب ان اقوام کو تعلیمی اداروں میں ،سرکاری ملازمتوں میں اور قانون ساز اداروں میں تحفظات دیئے جارہے ہیں، ان تحفظات کی وجہ سے ان طبقات میں کچھ سیاسی بیداری بھی پیدا ہوئی ہے، تعلیمی اور اقتصادی سطح پر بھی ان میں کچھ مثبت تبدیلیاں واقع ہورہی ہیں، ان کے باوجود معاشرے میں ان کو وہ عزت اور وقار امرتبہ حاصل نہیں ہو پارہا ہے جس کے وہ انسانیت کی رو سے مستحق ہیں، اس کی وجہ دراصل وہ مذہبی تعلیمات ہیں جن سے ہندو مذہب کی معتبر کتابیں بھری پڑی ہیں اور جنہوں نے دلتوں کو سماجی اعتبار سے اچھوت اور بے وقار بنادیا ہے، یہ لوگ کتنا ہی پڑھ لکھ لیں، کتنی ہی اچھی ملازمتوں پر کیوں نہ آجائیں اور کتنے ہی بڑے افسر یا لیڈر کیوں نہ بن جائیں اعلیٰ ذات کے لوگ ان سے دور ہی رہنا پسند کرتے ہیں، صدیوں کی روایات کے تسلسل نے ان کے دل دماغ میں یہ بات راسخ کردی ہے کہ وہ (اعلیٰ ذات کے لوگ) دنیا میں عزت و وقار کے ساتھ پیدا کئے گئے ہیں اور دلتوں کے مقدر میں ذلت ہے، کیا ان تاریخی سچائیوں کو جھٹلایا جاسکتا ہے کہ ہندوستان میں برہمنوں کو چھتری، ویش، شودر اور چنڈال جیسی قوموں کے مقابلے میں کچھ زیادہ ہی حقوق اور مراعات حاصل رہی ہیں، اسی کا اثر ہے کہ ان اقوام کو ہندو سماج میں کبھی عزت نہ مل سکی اور ان کے ساتھ ہمیشہ توہین آمیز سلوک کیا جاتا رہا، حقائق تو یہ بتلاتے ہیں کہ ان قوموں کو اعلیٰ ذات کے لئے مخصوص کنویں سے پانی لینے تک کی اجازت نہیں ہے، نہ انہیں اعلیٰ ذات کے لئے بنائے گئے مندروں میں جانے کا حق ہے، ساتھ کھانے پینے کا تو تصور بھی نہیں کیا جاسکتا، بہت سے علاقوں میں ان کے ساتھ اس دور ترقی میں انسانیت سوز سلوک کیا جاتا ہے، ان کے تالاب الگ ہیں، راستے الگ ہیں، ان کو یہ اجازت نہیں ہے کہ وہ معاشرتی رسم ورواج میں بھی اپنے سے اونچی ذات کے لوگوں کے ساتھ برابری کرسکیں، اخبارات میں رات دن ایسی خبریں پڑھنے کو ملتی ہیں کہ فلاں گاؤں میں دلت ذات کے دولہا کو گھوڑی چڑھنے

کی اجازت نہیں دی گئی کیوں کہ گھوڑی پر سوار ہوکر یہ ناصرف اونچی ذات کے دولھوں کا حق ہے کبھی کبھی کوئی جرأت مد برست نوجوان گھوڑی چڑھنے کی ہمت کر بھی لیتا ہے تو اسے سخت ترین سزائیں دی جاتی ہیں تاکہ آئندہ کوئی شخص ایسی حرکت نہ کر سکے، روایتوں کے سامنے تمام قوانین ناکام اور بے بس ہیں، اس صوبے میں بھی جہاں ایک دلت خاتون وزیر اعلیٰ ہے، جو صرف دلت ایجنڈے پر کام کرتی ہے اور دلتوں کی فلاح و بہبود کے لئے ہی سوچتی ہے، دلتوں کے ساتھ غیر سماجی اور غیر آئینی سلوک کے خلاف مختلف دفعات کے تحت مقدمات بھی قائم کئے جاتے ہیں، گرفتاریاں بھی عمل میں آتی ہیں اور مرتکبین کو جیل کی سزا بھی دی جاتی ہی ہے، اس کے باوجود اونچی ذات کے لوگوں کے دلوں میں نفرت کا لاوا پکتا رہتا ہے اور کبھی کبھی آگ کا طوفان بن جاتا ہے۔ حال ہی میں ایک خبر رساں ایجنسی نے یوپی میں دلتوں کی حالت زار پر ایک سروے رپورٹ جاری کی ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ قومیں اپنے ہی مذہب کے لوگوں کے ہاتھوں کس قدر ذلیل کی جارہی ہیں، انسانی حقوق کیے ایشیائی کونسل نے اپنی رپورٹ میں کہا ہے کہ دلتوں پر ظلم وتشدد کے واقعات سال بہ سال بڑھتے جارہے ہیں، 2007 میں اس طرح کے 6628 واقعات درج کئے گئے تھے۔ 2008 میں 4.5 فیصد کے اضافے کے ساتھ واقعات کی تعداد بڑھ کر 6942 ہوگئی ہے، یہ صورت حال اس وقت ہے جب کہ اس صوبے میں دلتوں کی ایک سخت گیر بیٹی، وزیر اعلیٰ کے منصب پر فائز اور جس کی ہدایت پر صوبے کے تمام حکام دلتوں کی مدد کے لئے ہمہ وقت مستعد رہتے ہیں، قابل ذکر بات یہ ہے کہ واقعات کی یہ تعداد سرکاری اندراجات کے مطابق ہے۔

اسلام اور ماحولیات کا تحفظ

ماحولیات کا لفظ بڑا وسیع ہے، اس کا تعلق ہمارے ارد گرد کے ماحول سے نہیں ہے بل کہ اس پوری کائنات سے ہے جسے ہم دنیا کہتے ہیں، ایک صحت مند اور آرام دہ زندگی کے لیے دنیا کے ماحولیات کی حفاظت بہت ضروری ہے، دنیا جس تیز رفتاری کے ساتھ ترقی کر رہی ہے اس سے اگر چہ انسان کی آسائش و آرام کی بے شمار چیزیں وجود میں آرہی ہیں مگر ان کے پہلو سے انسان کی زندگی اور اس کی صحت کو نقصان پہنچانے والے بے شمار مسائل بھی جنم لے رہے ہیں، اگر ہم ان مسائل کو کسی ایک لفظ میں سمیٹنا چاہیں تو وہ کثافت اور آلودگی ہے، گویا ہمارے دور کا سب سے اہم مسئلہ اس آلودگی اور کثافت پر قابو پانا ہے، اسی کے بعد انسانی زندگی کو مادّی راحت و آرام کے ساتھ جسمانی صحت اور روحانی سکون کی نعمتوں سے بھی مالا مال کر سکتے ہیں۔

کثافت اور آلودگی بھی مختلف طریقوں سے پھیل رہی ہے، پانی کی آلودگی، ہوا کی آلودگی، شعاعی آلودگی، صوتی آلودگی، ان تمام آلودگیوں نے مل کر انسان کا جینا حرام کر رکھا ہے، اس کے لیے کسی کو مورد الزام ٹھہرانا غلط ہے، خود انسان اپنے لیے گڑھا کھود رہا ہے، خود ہی اس میں اوندھے منھ گر رہا ہے اور خود ہی اٹھنے کے لیے ہاتھ پاؤں بھی مار رہا ہے، مغربی قومیں اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ ماحولیات کے تحفظ کا تصور ان کے ذہن کا اختراع ہے، یہ بڑی غلط فہمی ہے، آج سے چودہ سو سال پہلے قرآن کریم نے ہمیں بتلا دیا تھا کہ دنیا کو ہر اعتبار سے محفوظ بنانے کے لیے انسان کو کیا اقدامات کرنے چاہئیں، مغربی تو صرف مادّی نقطۂ نظر کی بات کرتا ہے جب کہ قرآن کی نظر دنیا کی روحانی اور معنوی آلودگی پر بھی ہے، بل کہ ثانی الذکر آلودگی زیادہ اہم ہے کیوں کہ وہ زیادہ تباہ کن ہے، دنیا کو اس آلودگی سے بچانے کی فکر و اہتمام زیادہ ہونا چاہیے۔

قرآن کریم میں غور کرنے کے بعد یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ کم و بیش دو سو آیات ماحولیات سے متعلق ہیں، ان میں زمین، پانی، ہوا، زندہ اور مردہ مخلوقات، شجر، حجر، پہاڑ، سمندر

اور وہ سب عجائبات عالم زیر بحث آئے ہیں جن کی تخلیق اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ کی گواہی دیتی ہے اور زبان حال سے پکار پکار کر یہ اعلان کرتے ہیں، صُنْعَ اللّٰهِ الَّذِي اَتْقَنَ كُلَّ شَيْءٍ (نمل:88) ''اللہ کی کاری گری ہے جس نے ہر چیز کو مضبوطی کے ساتھ بنایا ہے۔''

اللہ نے ان چیزوں کو پیدا ہی نہیں کیا بل کہ انسانوں کو یہ دعوت بھی دی کہ وہ ان کو دیکھے، ان پر غور کرے اور ان کے ذریعہ خالق کی عظمت اور قدرت کا ادراک کرے، سورۃ النمل کی آیت پانچ سے آیت چودہ تک مسلسل ان نعمتوں کو شمار کرایا گیا ہے جو اللہ نے انسانوں کو عطا کی ہیں اور جن پر غور وفکر کرنے کی ضرورت ہے، تا کہ ان نعمتوں کے حوالہ سے ہم اس ہستی کو پہچانیں، اس کی عظمت کے گن گائیں اور اس کا شکر ادا کریں جس نے یہ نعمتیں پیدا کیں اور جن سے ہمیں مستفید ہونے کا موقع بخشا۔

اس کائنات کا محور انسان ہے، کیوں کہ اللہ تعالیٰ کی بے شمار مخلوقات میں سے یہ واحد مخلوق ہے جسے دنیا کی خلافت عطا کی گئی ہے، یعنی اسے یہ صلاحیت بخشی گئی ہے کہ وہ دنیا میں آ کر اس کو آباد کرے، اس کا نظام چلائے، اس کی نعمتوں سے مستفید ہو اور دوسری مخلوقات میں مخفی خدا کی قدرت کے اسرار کی حقیقت تک پہنچے، اللہ تعالیٰ یہ کام کسی اور مخلوق کے بھی سپرد کر سکتا تھا، لیکن اس نے انسان کو ترجیح دی جو اس کے لیے اعزاز بھی ہے، ابتلاء اور آزمائش بھی، قرآن کریم میں خلافت ارضی کے حوالہ سے فرمایا گیا: ''اور یاد کرو جب اللہ نے ارشاد فرمایا فرشتوں سے کہ میں زمین میں ایک نائب بنانے والا ہوں۔'' (البقرۃ:30) وہی ہے جس نے تم کو زمین میں صاحب اختیار بنایا۔ (الانعام:165) اللہ نے انسان کو زمین میں بھیج کر اس کے حقوق وفرائض بھی متعین کر دیئے، فرض تو صرف ایک ہے، باقی تمام فرائض کا تعلق اسی ایک فرض کی تکمیل سے ہے، فرمایا: ''اور میں نے جن وانس کو صرف اپنی عبادت کے لیے پیدا کیا ہے'' (الذاریات: 56) یہی حال حقوق کا ہے، اگر ہم ایک جملہ میں ان حقوق کی وضاحت کرنا چاہیں تو اس طرح کہہ سکتے کہ اللہ نے پوری کائنات کو انسان کے لیے مسخر کر کے اس کے تابع بنا دیا ہے، وہ جائز حدود میں رہ کر جس طرح چاہے اس سے فائدہ اٹھائے، قرآن

کریم کی بہت سی آیات میں تسخیر کائنات کے حوالہ سے گفتگو کی گئی ہے، مثال کے طور پر ایک جگہ انسان کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا گیا: ''اور اللہ نے تمہارے لیے رات دن کو اور سورج چاند کو مسخر کیا ہے۔'' (النحل:12) پھر فرمایا: ''کیا تو یہ نہیں دیکھتا کہ وہی ہے جس نے تمہارے لیے زمین کی تمام چیزوں کو مسخر کر دیا ہے۔'' (الحج:65)

خلافت ارضی اور تسخیر کائنات گویا اللہ کی وہ عظیم نعمتیں ہیں جو انسان کو بن مانگے عطا کی گئی ہیں، اب یہ خود انسان کا فرض ہے کہ وہ ان نعمتوں کی قدر کرے اور ان کا حق ادا کرے، ان نعمتوں کی قدر اور حق کی ادائیگی کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ اس کائنات کی حسن نظام کی حفاظت کی جائے، انسان کی جہالت، نادانی یا سرکشی یہ ہے کہ وہ اس کائنات کو جسے اللہ نے اس کے لیے مسخر کیا ہے خود اپنے ہاتھوں تباہ و برباد کر رہا ہے، آیئے دیکھیں یہ کائنات انسان کے ذریعہ کس طرح برباد ہو رہی ہے۔ کائنات کی تباہی کی بنیادی وجہ کثافت ہے، اس میں شک نہیں کہ بعض کثافتیں تو قدرت نے خود ہی پیدا کی ہیں اور بعض انسان کی اپنی پیدا کردہ ہیں، حالاں کہ جو کثافتیں قدرت کی پیدا کردہ ہیں ان پر قدرت کے بتلائے طریقہ پر عمل کر کے قابو پایا جا سکتا ہے اور جو کثافتیں خود پیدا کی جا رہی ہیں ان پر قابو پانے کے لیے بھی مؤثر تدبیریں اختیار کی جا سکتی ہیں، لیکن فطرت سے بغاوت کا جو عنصر انسان کی طبیعت میں ہے اس نے مشکلات پیدا کر دی ہیں، اس لیے کثافت پر قابو پانے کا مسئلہ انتہائی اہمیت حاصل کر چکا ہے۔

اس مسئلہ کی سنگینی کو دیکھتے ہوئے ماہرین ارضیات اور اَربابِ بست وکشاد وقتاً فوقتاً سر جوڑ کر بیٹھتے رہتے ہیں، تدبیریں سوچتے ہیں، تجویزیں پاس کرتے ہیں، مگر عمل نہیں کراپاتے، 1992ء میں اقوام متحدہ نے برازیل کے دارالحکومت میں دوسری عالمی ماحولیاتی کانفرنس کا انعقاد کیا جس میں تیس ہزار افراد نے شرکت کی، تقریباً سو عالمی لیڈر بھی اپنے اپنے ملکوں کے ارضیاتی ماہرین اور جغرافیائی سائنس دانوں کے ساتھ شریک رہے، اس کانفرنس میں ماحولیاتی نظام کی بربادی کی جو تباہ کن تصویر سامنے آئی وہ کچھ اس طرح تھی:

(1): گزشتہ پچیس سالوں کے دوران افریقی ملکوں میں اناج کی پیداوار اٹھائیس فی صد کم ہوگئی ہے۔

(2) ایتھوپیا نے 1900ء کے بعد سے اب تک اپنے جنگلات کا نوے فی صد حصہ کھودیا ہے، جس کی وجہ سے وہاں کی زمینیں بنجر ہوچکی ہیں۔

(3) آسٹریلیا میں حیوانات مسلسل کم ہورہے ہیں، حالیہ برسوں میں ان کی تعداد میں اٹھائیس فی صد تک کمی واقع ہوچکی ہے۔

(4) آسٹریلیا ہی جیسی صورت حال پوری دنیا میں ہے، اعداد وشمار بتلاتے ہیں کہ صرف ایک سال کے عرصہ میں حیوانات کی چھتیس نسلیں اور پرندوں کی چورانوے نسلیں دنیا سے ناپید ہوگئی ہیں، جب کہ تین سو گیارہ نسلوں کو خطرات لاحق ہیں۔

(5) فضائی آلودگی کی وجہ سے جنگلات کا رقبہ دو فی صد سالانہ کے اعتبار سے گھٹتا جارہا ہے، ہر دہائی میں خشک زمین کا سات فی صد رقبہ گھٹ رہا ہے۔

(6) خلیجی جنگ کے دوران لاکھوں بیرل تیل خلیج عرب کے پانیوں میں مل گیا، جس سے سمندری زندگی کے لیے مشکلات پیدا ہوگئی ہیں، صورتِ حال پر قابو پانے کے لیے ایک سو اَسّی برس درکار ہوں گے۔

(7) یہ اندازہ لگایا جارہا ہے کہ 2025ء تک فضائی کثافت ایک خوف ناک بحران کی شکل اختیار کر جائے گی، ہوا میں کاربن ڈائی آکسائیڈ کی مقدار میں چار گنا اضافہ ہوجائے گا، اور اس کے نتیجہ میں حیاتیاتی اجناس کو پچیس فی صد تک خسارہ اٹھانا پڑے گا۔

(8) یہ بھی اندازہ لگایا گیا ہے کہ مشرقی ملکوں کے مقابلہ میں مغربی ممالک بیس گنا زیادہ پانی برباد کرتے ہیں اور بیس گنا زیادہ کثافت پھیلاتے ہیں، ایک امریکی شہری تیسری دنیا کے شہری کے مقابلہ میں بیس سے لے کر سو گنا تک کثافت پھیلانے کا سبب بنتا ہے، جب کہ ایک امریکی پانی جیسے قدرتی وسائل تین جاپانی، چھ میکسیکن، تیرہ چینی، پینتیس ہندوستانی، ایک سو ترپن بنگلادیشی اور چار سو نانوے ایتھوپیائی شہری کے برابر استعمال کر کے ضائع کرتا ہے۔

(9) صنعتی اور مشینی ترقیات کے نتیجہ میں خارج ہونے والی گیسیز، دھویں، فضلات اور دوسری کثافتوں کی وجہ سے اوزون گیس کی پرت میں شگاف پڑ گیا ہے جس کی وجہ سے سورج کی مضر شعائیں زمین تک بلا روک ٹوک پہنچنے لگی ہیں اور کینسر جیسی جسمانی بیماریوں کا سبب بن رہی ہیں۔

(10) دنیا میں جتنے دریا اور نہریں وغیرہ ہیں ان میں سے دس فی صد آبی وسائل انسانی جسم کے فضلات، گھروں سے نکلنے والی نجاستوں اور فیکٹریوں اور کارخانوں کے فضلات کی وجہ سے نہ صرف گندے ہو چکے ہیں بل کہ ان کا پانی بھی زہریلا ہو گیا ہے۔

بلاشبہ ماحولیاتی آلودگی کا مسئلہ عالمی سطح کا مسئلہ ہے تنہا کسی علاقے، کسی ملک، کسی قوم یا کسی مذہب کا مسئلہ نہیں ہے، سب کو مل کر اس مسئلہ کا حل نکالنا چاہیے، اس سلسلہ میں سب سے زیادہ مؤثر مذہبی تعلیمات ہو سکتی ہیں بشرطیکہ ان پر کان دھرا جائے اور ان سے استفادہ کیا جائے، اسلام دنیا کا واحد مذہب ہے جس نے اس مسئلہ کی اہمیت کو اس وقت سمجھا جب دنیا ماحولیاتی آلودگی کے نام سے بھی واقف نہیں تھی، چہ جائے کہ اس کے تباہ کن اثرات سے واقف ہوتی، اس وقت قرآن کریم نے نسل انسانی کی صحت مند بقا کے لیے بہت سی چیزوں کی نشان دہی کی، سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ارشاداتِ مبارکہ کے ذریعہ انسان کو محفوظ زندگی گزارنے کے طریقے سکھلائے، یہ انسان کی بدقسمتی ہے کہ اس نے ان ارشادات کو دل کے کانوں سے نہیں سنا، آج اس کا نتیجہ سامنے ہے، قدرتی وسائل پر قبضہ کرنے اور انہیں اپنی مرضی سے استعمال کرنے کی انسانی ہوس نے دنیا کے چھ ارب باشندوں کو ہلاکت کی کگار پر لا کھڑا کر دیا ہے، اب خدا ہی انہیں تباہ ہونے سے بچا سکتا ہے، کم از کم انسان کے بس میں تو نہیں کہ وہ اس بحران سے نکلنے کی کوئی راہ تلاش کر سکے۔

اللہ تعالیٰ نے زمین پیدا کی، اس میں انسان کے لیے بے شمار فائدے رکھے، مثلاً: یہ کہ اسے انسانی رہائش کے قابل بنایا، اس کے سینہ میں معدنیات کی دولت رکھی، اس کے اندر پھل، پھول، غلے اور میوے پیدا کرنے کی صلاحیت پیدا فرمائی، کہیں اس کو ٹھوس بنایا اور کہیں

نرم رکھا تا کہ انسان اس کے نرم حصہ پر کھیتیاں اگا سکے، درخت لگا سکے، پانی نکال سکے، اسے اس قابل بنایا کہ آسمان سے جو بارش برسے وہ اس پر ٹھہر سکے، اس میں پانی ذخیرہ کرنے کی صلاحت رکھی، نہریں، دریا، چشمے اور پانی کے دوسرے ذخیرے پیدا کیے، اس میں مختلف شکل و صورت کے جانور پیدا کیے، جن میں سے بعض کا گوشت کھایا جاتا ہے، بعض سواری اور بار برداری کے کام آتے ہیں، بعض جانوروں کے اون سے پوشاکیں تیار کی جاتی ہیں، بعض جانوروں کو دیکھنے اوران کی آوازیں سننے سے دل و دماغ کو سکون ملتا ہے۔ یہ اور اس طرح کے بے شمار فوائد کی حامل یہ زمین قدرت کا بے مثال تحفہ ہے، اب اگر ہم اس تحفہ کی قدر نہ کریں اور اس کی صورت مسخ کرکے اسے تمام صلاحیتوں سے محروم کرکے خود بھی اس کے فوائد سے محروم ہو جائیں تو اس سے بڑھ کر ہماری بدقسمتی اور کیا ہوگی!

ماحولیاتی آلودگی ایک خطرناک مسئلہ اور ہمارے خطے کے لیے ایک بڑا چیلنج:

ماحولیاتی آلودگی کا تعلق پوری دنیائے انسانیت سے ہے، آج دنیا کے تمام ممالک کسی نہ کسی نوعیت کی فضائی آلودگی کا شکار ہیں، لیکن اس میں برصغیر ہندو پاک کا خطہ سرفہرست ہے جہاں فضائی اور صوتی آلودگی نے طرح طرح کے مسائل پیدا کرر کھے ہیں۔

ماحولیاتی آلودگی کے حوالہ سے یہ خطہ بین الاقوامی سطح پر بحث و گفتگو کا موضوع بن چکا ہے، پہلے فضائی آلودگی صرف شہری اور صنعتی علاقوں کے لیے ایک مسئلہ تھا، پچھلی دو تین دہائیوں سے دیہی علاقے بھی اس آلودگی کی زد میں آگئے ہیں، تیز رفتار صنعتی ترقی کے نتیجہ میں گھریلو پیداوار میں اضافہ تو ہوا ہے، مگر اس سے انسانی صحت کے لیے بڑے مسائل پیدا ہو گئے ہیں، پھر ہمارے ہاں ترقی اور خوش حالی صرف شہروں تک محدود ہے اس لیے دیہات سے بڑی تعداد میں لوگ نقل مکانی کرکے خوش حالی کی تلاش میں بڑے شہروں کا رخ کرر ہے ہیں، اس کے نتیجہ میں سڑکوں پر بھیڑ بڑھ گئی ہے، اور شہری علاقوں کی فضائی کیفیت دھما کہ خیز ہوتی جارہی ہے، صحت سے متعلق زیادہ تر مسائل ماحولیاتی آلودگی کی وجہ سے پیدا ہور ہے ہیں، آج اس خطے کو دنیا کی سب سے زیادہ خراب ماحولیات کا حامل خطہ کہا جارہا ہے، اس کی بڑی وجہ یہ ہے

کہ بیشتر صنعتیں ماحولیات کے تعلق سے رہ نما اُصول اور ضوابط کی پابندی نہیں کرتیں، حکومتیں داخلی کرپشن کی وجہ سے ان صنعتوں کو ضوابط کا پابند کرنے میں نا کام ہیں، ماحولیات کے سدھار کے متعلق جو اقدامات بھی کرنے ہیں ان کا تعلق حکومتوں سے ہے، لیکن عوام کی ذمہ داری بھی کچھ کم نہیں ہے۔

ماحولیات کے مسئلہ پر دوسرے معاملات اور مسائل کی طرح اس معاملہ میں بھی اسلامی تعلیمات موجود ہیں اور عوام اور حکومت دونوں ان تعلیمات سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں، بل کہ دونوں کی ذمہ داری بنتی ہے کہ وہ ان تعلیمات سے فائدہ اٹھا کر ماحول کی کثافت اور آلودگی پر قابو پانے کی کوشش کریں اور نسل انسانی کو خالق کائنات کی رضا اور منشاء کے مطابق زندگی گزارنے کا موقع فراہم کریں۔

ماحولیاتی کثافت کی بنیادی وجہ ماحول کے قدرتی توازن میں مداخلت ہے، اللہ رب العزت نے اس کائنات کی ہر چیز کو نپی تلی مقدار میں اور باہم توازن کے ساتھ پیدا فرمایا ہے، یہ حقیقت قرآن کریم کی متعدد آیات میں واضح طور پر بیان کی گئی ہے، یہ حقیقت اگر چہ چودہ سو برسوں سے قرآن کریم کی آیات میں پوشیدہ تھی مگر انسان کے ہاتھوں قدرت کے پیدا کردہ توازن سے چھیڑ چھاڑ نے خود اس کے لیے بے شمار مشکلات پیدا کردی ہیں اور ان مشکلات کے سد باب کے لیے ضروری ہے کہ انسان اس چھیڑ چھاڑ سے باز آئے اور جو توازن اس نے بگاڑا ہے اس کو اپنی اصل حالت پر واپس لانے کی کوشش کرے، اس کی ذمہ داری اگر چہ حکومتوں کی ہے، لیکن عوام بھی اس میں اپنا بڑا کردار ادا کر سکتے ہیں بل کہ انھیں اپنا کردار ادا کرنا چاہیے۔

کھلے عام رفع حاجت کرنا، سڑکوں، پارکوں اور عام گزرگاہوں پر پان اور گٹکے کھا کر تھوکنا، پیشاب کرنا، گھروں کا آلودہ پانی گلیوں میں بہانا، گھروں کی گندگی اور کوڑا کرکٹ عام جگہوں پر ڈالنا، تعمیراتی کاموں کے وقت گردوغبار روکنے کی تدابیر اختیار نہ کرنا، یہ سب وہ امور ہیں جن میں عام شہری پوری طرح ملوث ہیں، اوّل تو حکومت اس طرح کے مسائل پر قابو

پانے کے لیے مؤثر قوانین نہیں بناتی اور اگر قوانین بناتی بھی ہے تو ان کا صحیح طور پر نفاذ نہیں ہو پاتا، ضروری ہے کہ اس طرح کے قوانین بنیں، صحیح طور پر نافذ ہوں اور ملک کا ہر شہری اپنی ذمہ داری محسوس کرے اور اپنے اردگرد کے ماحول کو آلودگی سے پاک بنانے کی کوشش کرے۔

صوتی آلودگی بھی ہمارا بڑا مسئلہ ہے، ایک سروے کے مطابق ہمارے ہاں کا ہر بارہواں شخص بڑھتے ہوئے شور وشغب کے باعث سماعت سے محروم ہوتا جارہا ہے، برین ہیمبرج، ہارٹ اٹیک، بلڈ پریشر، شوگر وغیرہ جیسی کئی خطرناک بیماریاں صوتی آلودگی کی وجہ سے پیدا ہورہی ہیں، اسلامی تعلیمات کی روشنی میں ہر مسلمان شہری کے لیے ضروری ہے کہ ماحول کو گندگی اور آلودگی سے بچائے اور یہ مسلمانوں کا مذہبی فریضہ ہے، اس کے لیے کم آلودگی پھیلانے والے ایندھن کا استعمال ہونا چاہیے، عوامی مقامات پر تمباکونوشی نہ کی جائے، ایسی جگہوں پر تھوکنے سے احتراز کیا جائے، کھلی نالیوں میں گندگی نہ ڈالی جائے، بلاضرورت اور بغیر اجازت درخت نہ کاٹے جائیں، ڈیگ وغیرہ نہ بجائے جائیں، مذہبی جلسوں اور مشاعروں وغیرہ میں تیز آواز کے ساتھ اور دیر رات تک لاؤڈ اسپیکر استعمال نہ کیے جائیں، سب سے اہم بات یہ ہے کہ حکومتوں نے ماحولیاتی آلودگی کے سلسلہ میں جو قوانین بنائے ہیں مسلمان پوری دیانت داری کے ساتھ ان قوانین پر عمل پیرا ہوں۔

ریلیف اور امداد؛ دینی اور انسانی فریضہ

اس کرۂ ارض پر جو انسانوں کا مسکن ہے قدرتی آفات ومصائب کی آمد کا سلسلہ اس وقت سے جاری ہے جب سے یہ کرہ وجود میں آیا، کبھی زلزلے اس کے لیے تباہی کا سامان لے کر آتے ہیں، کبھی طوفان بادوباراں کی وجہ سے اس کے مکینوں کو جان ومال کا نقصان اٹھانا پڑتا ہے، کبھی سیلاب کی وجہ سے آبادیاں ڈوب ڈوب جاتی ہیں، کبھی خشک سالی کے باعث لوگوں کو آٹھ آٹھ آنسو رونے پر مجبور ہونا پڑتا ہے، ان قدرتی آفات وحوادث کے ظاہری اسباب پر ہماری نظر رہتی ہے اور ہم سمجھتے ہیں کہ زمین کے نیچے پلیٹوں کے سرکنے اور ان کے ایک دوسرے کے ساتھ ٹکرانے سے زلزلے آتے ہیں، ہوائیں طوفان بن جائیں تو تباہی مچا دیتی ہیں، بارش کی زیادتی سے سیلاب کی صورتِ حال پیدا ہوتی ہے اور اس کی قلت سے کھیتیاں خشک اور زمینیں ویران وبنجر ہوجاتی ہیں، یہ حوادث کے ظاہری اسباب ہیں، لیکن ان کا ایک حقیقی سبب بھی ہے جس کی طرف قرآن کریم کی اس آیت میں توجہ دلائی گئی ہے: ''خشکی اور تری ہر جگہ لوگوں کے اعمال کے نتیجے میں فساد چھا گیا ہے تاکہ اللہ ان کے بعض کرتوتوں کا مزہ چکھائے شاید وہ رجوع کرلیں۔'' (الروم:۱۴)

اسی مضمون کو دوسری جگہ اس طرح بیان کیا گیا ہے: ''تمہیں جو بھی مصیبت پہنچتی ہے وہ تمہارے ہی ہاتھوں کی کمائی کے سبب سے ہے اور بہت سے گناہوں کو تو اللہ تعالیٰ معاف کردیتا ہے۔'' (الشوریٰ:۳۰)

ان دونوں آیتوں کا مطلب یہ ہے کہ اس دنیا میں جو مصائب اور آفات تم پر آتی ہیں ان کا حقیقی سبب تمہارے گناہ ہوتے ہیں، اسی لیے بعض علماء نے فرمایا کہ جو انسان کوئی گناہ کرتا ہے وہ ساری دنیا کے چرند پرند اور حیوانات پر ظلم کرتا ہے، کیوں کہ اس کے گناہوں کے وبال سے جو بارش کی زیادتی وکمی ہوتی ہے، دوسرے مصائب دنیا میں آتے ہیں، اس سے سب ہی جاندار متأثر ہوتے ہیں، حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے ''حجۃ اللہ البالغۃ'' میں لکھا ہے کہ اس دنیا میں خیروشر، مصیبت وراحت اور مشقت وسہولت کے اسباب دو طرح کے

ہیں، ایک ظاہری، دوسرے باطنی۔ ظاہری اسباب تو وہی مادّی اسباب ہیں جو عام دنیا کی نظر میں اسباب سمجھے جاتے ہیں اور باطنی اسباب انسانی اعمال ہیں، جیسے اعمال ہوں گے اسی طرح کے ثمرات ونتائج مرتب ہوں گے، الا یہ کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم کا معاملہ فرمائے۔ ان دنوں ہمارے خطہ میں اس قدر خطرناک اور زبردست سیلاب آیا ہوا ہے کہ اس نے ہزاروں مربع میل علاقے کو جل تھل کر دیا ہے، لگ بھگ ڈیڑھ کروڑ افراد اس سے متاثر ہیں، بہت سے گاؤں تباہ وبرباد ہو گئے ہیں، ہزاروں مویشی ہلاک ہو چکے ہیں، کتنی انسانی جانیں ضائع ہوئی ہیں اس کا اندازہ ابھی نہیں لگایا جا سکا، ان تباہ حال انسانوں میں بوڑھے خواتین اور معصوم وشیر خوار بچے بھی شامل ہیں جو زندگی اور موت کے درمیان معلق ہیں، نہ ان کے پاس پینے کے لیے پانی ہے اور نہ کھانے کے لیے غذا ہے، حکومت نے ایسے افراد کی تعداد پانچ لاکھ بتلائی ہے جنہیں غذا یا صاف پانی میسر نہیں ہے بھاری بارش کی وجہ سے امداد کا کام ٹھپ ہے، تیس اضلاع کے ہزاروں گاؤں اس سیلاب سے بری طرح متاثر ہیں، ان میں سے بعض اضلاع میں صورتِ حال نہایت تشویش ناک ہے۔

ان حالات میں ہمارا فرض بنتا ہے کہ ہم اپنے بھائیوں کی مدد کے لیے آگے آئیں، اور اسے اپنا دینی اور انسانی فریضہ سمجھیں، مدد کی ایک صورت تو یہ ہے کہ ہم میں سے ہر شخص چاہے وہ بڑا ہو یا چھوٹا، مرد ہو یا عورت، جوان ہو یا بوڑھا، مال دار ہو یا غریب اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو اور نہایت آہ وزاری کے ساتھ اپنے مجبور وبے کس اور پریشان حال بھائیوں کے لیے دعا کرے، یہ وہ مدد ہے جو ہم میں سے ہر شخص بہ سہولت کر سکتا ہے، اس میں نہ کسی قسم کی جسمانی مشقت ہے اور نہ مالی بوجھ، دوسری مدد جس کے وہ اس وقت بھی سخت محتاج ہیں اور جب بارش کی قہر سامانی ختم ہو جائے گی اور پانی اتر جائے گا اس وقت بھی محتاج ہوں گے، بلکہ اس وقت زیادہ محتاج ہوں گے جب یہ تباہ حال اور مصیبت زدہ لوگ اپنے ٹھکانوں کی طرف واپس پہنچیں گے تو انہیں نہ ان کے مکانات صحیح حالت میں ملیں گے، نہ گھر کا سامان ہاتھ آئے گا، نہ جانور زندہ سلامت ملیں گے، کاروبار ختم ہو چکے ہوں گے، کھیتیاں برباد ہو چکی ہوں گی

اور لوگ زندگی کے لق ودق صحرا میں بے یارو مددگار کھڑے ہوں گے، ایسے حالات میں آپ کی مالی مدد ان کو بڑا حوصلہ دے گی، آپ کی تھوڑی سی مشفقانہ توجہ ان کے لیے گھنی دھوپ میں شجر سایہ دار بن جائے گی، جس کے سہارے وہ زندگی کا باقی ماندہ سفر پورا کر سکیں گے۔

ہمیں ہر وقت یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ ہم ایسے دین کے ماننے والے ہیں جو سراپا رحمت ہے، اس کی تعلیمات میں بہ طور خاص ان لوگوں کا خیال رکھا گیا ہے جو زندگی کا سفر طے کرنے میں کسی مدد اور دست گیری کے محتاج ہیں، وہ اپنے ماننے والوں کو ہدایت دیتا ہے کہ ایک دوسرے کے ساتھ ہمدردی کریں، ایک دوسرے کی مدد کریں، معاشرے کے کم زور اور مجبور افراد کے ساتھ تعاون کریں اور انہیں خوش گوار زندگی کے راستے پر قدم بڑھانے کے لیے حوصلہ دیں۔

اس وقت سیلاب زدگان ہماری طرف امید بھری نظروں سے دیکھ رہے ہیں، ہمارا فرض بنتا ہے کہ ہم انہیں مایوس نہ کریں، وہ ٹوٹ چکے ہیں، بکھر چکے ہیں ان کے ساتھ بلاتفریق مذہب وملت رحم وکرم کا معاملہ کرنے کی ضرورت ہے اور اپنے عمل سے یہ ثابت کرنے کی ضرورت ہے کہ اسلام دین رحمت ورأفت ہے، اس کے علاوہ کسی بھی مذہب میں انسانیت نوازی کا اور انسانوں کے ساتھ حسن سلوک کا وہ تصور نہیں ملتا جو اسلام میں پایا جاتا ہے، اسلام نے عمومی جذبہ ترحم پیدا کرنے کی کوشش کی ہے اور اسے ایمان کامل کا مظہر قرار دیا ہے، ایک حدیث میں ہے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''تم اس وقت تک مومن کہلانے کے مستحق نہیں ہو جب تک رحم نہ کرو، صحابہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ! ہم سب رحم دل ہیں، فرمایا وہ رحم مراد نہیں ہے جو تم اپنے رفیق کے ساتھ کرتے ہو بلکہ عمومی رحمت مراد ہے۔'' (صحیح الترغیب والترهیب: ۲/۲۷۲، رقم الحدیث: ۲۲۵۳)

ایک حدیث میں یہ الفاظ ہیں لاحتی یرحم العامة (مسند عبد ابن حمید: ۴/ ۹۷، رقم الحدیث: ۱۴۵۸) نہیں رحم دل وہ ہے جو عام مخلوق پر رحم کرے۔ سرکارِ دو عالم

صلی اللہ علیہ وسلم نے بار بار اس عمومی رحمت پر زور دیا ہے، ایک مرتبہ ارشاد فرمایا: **من لا یرحم الناس لایرحم اللّٰہ. (البخاری:۵/۲۲۳۵، رقم الحدیث :۵۶۵۱)** ''جو لوگوں پر رحم نہیں کرتا اللہ اس پر رحم نہیں کرتا'' ایک حدیث میں یہ الفاظ ہیں:

''جو زمین والوں پر رحم نہیں کرتا آسمان والا اس پر رحم نہیں کرتا'' **(المعجم الکبیر الطبرانی :۲/۳۵۵ رقم الحدیث:۲۴۹۷)** یہ بات ان لفظوں میں بھی بیان فرمائی گئی ہے ''زمین والوں پر رحم کرو آسمان والا تم پر رحم کرے گا'' **(ابو داؤد :۲/۷۰۳ رقم الحدیث : ۴۹۴۱)**

یہ اور اس طرح کی بے شمار احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ اسلام ہر دل میں جذبہ ترحم دیکھنا چاہتا ہے تاکہ دنیا امن وسلامتی اور خوش حالی سے بھر جائے، اگر دل اس جذبے سے خالی ہوں گے تو کوئی کسی پریشان حال کی مدد کو نہیں آئے گا، کوئی کسی کی غم خواری نہیں کرے گا، ہر شخص اپنی کھال میں مست رہے گا، خواہ اس کے پڑوس میں کوئی بچہ بھوک سے تڑپ رہا ہو، یا کوئی مریض شدتِ مرض کی تاب نہ لا کر دم توڑ رہا ہو، اسلام ایک ایسا معاشرہ چاہتا ہے جس میں مساوات اور برابری کی بنیاد پر لوگ ایک دوسرے کی مدد کرتے ہوں اور ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک رہتے ہوں، وہ ہر شخص سے یہ مطالبہ کرتا ہے۔ ''تم دوسرے کے ساتھ حسن سلوک کرو جیسا کہ اللہ نے تمہارے ساتھ حسن سلوک کیا ہے۔'' **(القصص:۷۷)**

اس جذبہ ترحم اور رحمت عامہ کا تقاضا یہ ہے کہ ہم اپنے ان مصیبتوں زدہ بھائیوں کی طرف دست تعاون دراز کریں جو سیلاب میں اپنا سب کچھ کھو چکے ہیں، اور اس تعاون کی سب سے مؤثر اور مفید شکل وہ ہے جسے اسلام میں صدقہ وخیرات سے تعبیر کیا جاتا ہے، قرآن وحدیث میں جگہ جگہ اس عملِ خیر کی تاکید کی گئی ہے کیوں کہ یہ وہ واحد ذریعہ ہے جس سے انسانی معاشرہ مربوط ومستحکم رہ سکتا ہے، اگر ہم ایک دوسرے کی مدد نہیں کریں گے تو جو لوگ مدد کے محتاج ہیں وہ معاشرے میں اپنا وجود کھو دیں گے، اسی لیے اسلام نے سماج کے مجبوروں، لاچاروں، مسکینوں، یتیموں اور ضرورت مندوں کی مدد اور اعانت کرنے کی بار بار تاکید کی ہے،

قرآن کریم میں پکے سچے مومن کا ایک وصف یہ بتلایا گیا ہے:

''اور اپنے لیے کھانے کی ضرورت کے باوجود مسکین، یتیم اور قیدی کو کھلا دیتے ہیں''

(الدہر:۸) قرآن کریم میں جہاں صحابہ کرامؓ کی مثالی زندگی کا نقشہ کھینچا گیا ہے وہاں ان کا یہ امتیازی وصف بھی بیان کیا گیا ہے:

''اور اپنے اوپر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں اگر چہ وہ خود ہی ضرورت مند کیوں نہ ہوں''(**الحشر:۹**)

ضرورت مندوں کی مدد انسانیت نوازی کی اعلیٰ مثال ہے اور اس سے بڑھ کر کوئی نیکی نہیں ہوسکتی کہ اللہ کے ان بندوں کی دل کھول کر مدد کی جائے جو اپنا تمام سرمایۂ حیات لٹا کر کاروانِ زندگی سے بہت پیچھے رہ گئے ہیں، ان لوگوں کی جو بھی مدد ہوگی وہ مال ضائع نہیں ہوگا بلکہ دوگنا چوگنا ہو کر ملے گا۔قرآن کریم میں صدقہ وخیرات کی مثال اس دانے سے دی گئی ہے جو ایک کسان اپنی زمین میں ڈالتا ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ دانہ زمین کا سینہ چیر کر پودا بن جاتا ہے اور اس میں اسی طرح کے سینکڑوں دانے نکل آتے ہیں۔

اپریل فول تاریخ اور اسلامی تعلیمات کے آئینے میں

مثل مشہور ہے ''جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے!'' یہ کہاوت اس وقت بولی جاتی ہے جب کوئی شخص بے پر کی اڑاتا ہے یا ایسی بات کرتا ہے جس کی کوئی بنیاد نہیں ہوتی۔ میرا خیال ہے یکم اپریل کو کچھ ایسی ہی بے پر کی اڑائی جاتی ہے اور اس دن بے بنیاد باتیں پھیلائی جاتی ہیں، پھر ان کے نتائج سے لطف اٹھایا جاتا ہے، یہ ایک مغربی رسم ہے، جو مشرق میں بھی پوری طرح پھیل چکی ہے، اسے ''اپریل فول'' کہتے ہیں، اس کے لیے یکم اپریل کا دن خاص کیا گیا ہے، کیا بچے کیا بوڑھے اور کیا جوان سب اس دن کی مسرتوں سے لطف اندوز ہوتے ہیں؛ لیکن یہ مسرتیں حقیقی نہیں ہوتیں، کیوں کہ ان کی بنیاد تین چیزوں پر رکھی جاتی ہے، جھوٹ پر، فریب پر اور دوسروں کی تضحیک پر، ظاہر ہے وہ مسرت حقیقی نہیں کہلائی جاسکتی جو کسی کا دل دُکھا کر، کسی کو فریب دے کر یا کسی کو اذیت میں مبتلا کر کے حاصل کی گئی ہو، یوں تو مغرب کے لوگ بڑے دیانت دار، بڑے سچے، بڑے ہم درد اور کھرے بنتےہیں؛ لیکن اپریل کی پہلی تاریخ کو وہ اپنے ان تمام خود ساختہ اوصاف سے محروم ہو جاتے ہیں اور وہ لوگ بھی ان کے رنگ میں رنگ جاتے ہیں جو مغرب کے اندھے مقلد ہوتے ہیں، خود ان کے پاس تو سوچنے کے لیے کچھ نہیں ہوتا، سو وہ نقالی کرتے ہیں، مغرب کے لوگ اگر ننگے ہو کر ناچنا شروع کر دیں تو یہ بھی بے حیا بن کر ناچنے میں فخر محسوس کریں گے، اس پورے عمل میں ان کے لیے قابل فخر چیز یہ ہے کہ وہ مغرب کی تقلید کر رہے ہیں، اس سے بحث نہیں کہ وہ کتنے شرم ناک کام میں مشغول ہیں، یکم اپریل کو ''اپریل فول'' منانے کی رسم بد کا بھی یہی حال ہے، لوگ اس دن ایک دوسرے کو بے وقوف بناتے ہیں، جھوٹ بولتے ہیں اور جب مخاطب جھوٹ کو سچ سمجھ لیتا ہے تب یہ خوشی سے قہقہے لگاتے ہیں، کیوں کہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ انہوں نے جھوٹ بول کر مخاطب کو بے وقوف بنانے میں کام یابی حاصل کر لی ہے، انہیں اس سے بحث نہیں ہوتی کہ اس جھوٹ سے کسی دوسرے کو کتنی تکلیف پہنچی ہے اور اسے کتنا ذہنی، جسمانی یا مالی نقصان اٹھانا پڑا ہے؟ بعض اوقات اس طرح کے بے ہودہ مذاق سے انتہائی تکلیف دہ صورت حال بھی پیدا ہوئی ہے اور متعلقہ لوگوں

نے برسہابرس تک اس کا خمیازہ بھگتا ہے، مجھے یاد ہے، ہمارے قدیم محلے میں برسوں پہلے ایک نوجوان نے اپریل فول منانے کی حماقت کی تھی، ایک صبح جب ہم ناشتے میں مشغول تھے، باہر گلی میں شور ہوا، میں نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا، محلے کا ایک نوجوان زخمی حالت میں پڑا ہوا ہے، اس کی آنتیں باہر نکلی ہوئی ہیں اور اس کے اردگرد خون پھیلا ہوا ہے، یقین کیجیے مجھے یہ منظر دیکھ کر چکر آ گیا، ہم لوگ ناشتہ وغیرہ سب بھول گئے، محلے کے لوگوں نے اس زخمی نوجوان کے گھر والوں کو اطلاع دی، گھر میں اس وقت زخمی نوجوان کی والدہ اور بہنیں وغیرہ تھیں، وہ روتی پیٹتی بے پردہ باہر نکل آئیں، جب مجمع اچھا خاصا ہو گیا اور والدہ وغیرہ چیخ چیخ کر بے حال ہو گئیں، تب اچانک وہ لڑکا کھڑا ہو گیا، صحیح سلامت، ہنستا قہقہے لگاتا، معلوم ہوا یہ سب کچھ ڈرامہ تھا اور یہ ڈرامہ اپریل فول کے نام پر کیا گیا تھا، وہ لڑکا مذبح خانے سے جانوروں کی خون آلود آنتیں لے کر آیا اور ان کو اپنے جسم پر ڈال کر چیخنے چلانے لگا، ہم سب سمجھے شاید اسے کسی نے شدید طور پر زخمی کر دیا ہے، یہاں تک کہ اس کی آنتیں وغیرہ باہر نکل آئی ہیں، حقیقت کھلی تو لوگ ہنسنے قہقہے لگانے کے بجائے سخت ناراض ہوئے، ہر شخص نے اسے دل کھول کر برا بھلا کہا والدہ بھی بد عائیں دیتی واپس ہوئیں، کچھ عرصے کے بعد اس نوجوان کا یہ حال ہوا کہ وہ دیوانوں جیسی حرکتیں کرنے لگا، کچھ دنوں کے بعد بالکل پاگل ہو گیا اور اسی حالت میں ایسا غائب ہوا کہ آج تک واپس نہیں آیا، معلوم نہیں مر چکا ہے یا زندہ ہے۔

حتمی طور پر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ کس بدبخت نے یہ رسم بد ایجاد کی ہے اور کیوں کی ہے؟ اس سلسلے میں مؤرخین کے بیانات مختلف ہیں ''انسائیکلوپیڈیا آف برٹانیکا'' میں اس کی وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ فرانس میں سال نو کا آغاز جنوری کے بجائے اپریل سے ہوا کرتا تھا او ررومیوں کے نزدیک یہ مہینہ مقدس تصور کیا جاتا تھا، کیوں کہ اس کی نسبت ان کی مشہور دیوی وینس کی طرف تھی، یکم اپریل سال نو کے آغاز کا دن بھی تھا اور دیوی کی نسبت سے اس مہینے کو تقدس بھی حاصل تھا، اس لیے لوگ اس دن کو یادگار دن سمجھنے لگے اور جب سال میں یہ دن آتا تو خوشی اور مسرت سے جھومتے گاتے، ہنسی مذاق کرتے، آہستہ آہستہ ہنسی مذاق اس دن کا

لازمی عمل بن گیا، اگر بات بے ضرر ہنسی تک رہتی تب بھی غنیمت تھا، لوگوں نے یہاں تک کیا کہ ہنسی مذاق کے نام پر جھوٹ بولنا اور دھوکا دینا شروع کر دیا، جب کوئی شخص جھوٹ پر یقین کر لیتا، یا کسی فریب کا شکار ہو جاتا تو اس کا مذاق اڑایا جاتا، آہستہ آہستہ معاشرے میں مذاق کی یہ بدنما اور تکلیف دہ شکل اتنی عام ہوئی کہ لوگ یکم اپریل کو عام معافی کا دن سمجھ کر کمینگی کی تمام حدود کو پار کرنے لگے، اسی انسائیکلو پیڈیا میں یہ وجہ بھی بیان کی گئی ہے کہ مارچ کی آخری تاریخوں سے موسم میں تغیر شروع ہو جاتا ہے، بعض افراد اس موسمی تغیر کو قدرت کا مذاق قرار دیتے ہیں، گویا قدرت موسم کی اس غیر یقینی صورت حال کے ذریعے ہمیں بے وقوف بنا رہی ہے، لہٰذا کیوں نہ ہم ایک دوسرے کو بے وقوف بنا کر قدرت کے اس مذاق کا جواب دیں؟ اگر یہ وجہ ہے تو انتہائی مہمل اور بے ہودہ ہے، اول تو یہ سوچنا ہی لغو ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے اس طرح کا مذاق کرے گا، پھر اگر کوئی اپنی ناقص عقل کی بنیاد پر موسم کے تغیرات کو قدرت کا مذاق قرار دینے کی حماقت بھی کرتا ہے تو آپس میں انسانوں کا ایک دوسرے کو بے وقوف بنانے کے فعل سے اس کا کیا تعلق؟

انیسوی صدی عیسوی کی مشہور انسائیکلو پیڈیا ''لاردس'' نے ایک دوسری ہی وجہ بیان کی ہے اور اگر یہ وجہ صحیح ہے تو واقعی یورپ اور باقی دنیا کے عیسائیوں کی عقل پر ماتم کرنے کو جی چاہتا ہے کہ وہ خود ہی اپنے پیغمبر کا مذاق اڑا رہے ہیں۔ ''لاردس'' نے یہودیوں اور عیسائیوں کے مستند حوالوں کی بنیاد پر لکھا ہے کہ یکم اپریل وہ تاریخ ہے جس میں رومیوں اور یہودیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا مذاق اڑایا تھا اور انہیں تکلیف پہنچائی تھی، لوقا کی انجیل میں یہ روایت بیان کی گئی ہے کہ جن لوگوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو گرفتار کیا وہ ان کا مذاق اڑاتے، ان کی آنکھیں بند کر کے طمانچے مارتے اور کہتے کہ اب اپنی ''نبوت کے ذریعے بتلا کہ تجھے کس نے مارا ہے؟'' گرفتاری کے بعد انہیں یہودی علماء کے سامنے پیش کیا گیا، وہاں سے دوسری عدالتوں میں بھیجا گیا۔ ''لاردس'' کا کہنا ہے کہ مختلف عدالتوں میں بھیجنے کا مقصد انہیں تکلیف پہنچانا اور ان کا مذاق اڑانا تھا، کیوں کہ وہ واقعہ یکم اپریل کو پیش آیا تھا، اس لیے یہودیوں نے

اس دن کو یادگار دن کے طور پر منانے کا فیصلہ کیا۔ (بحوالہ ذکر وفکر مولانا مفتی محمد تقی عثمانی:68-67)

یہودیوں کی حیثیانہ فطرت سے یہ بعید نہیں ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ انہوں نے یہ ناشائستہ اور غیر مہذب سلوک کیا ہو، مگر عیسائیوں کو کیا ہو گیا کہ وہ اپنے معتبر مآخذ ومراجع کی اس حتمی صراحت وشہادت کے باوجود یہودیوں کی تقلید میں خود اپنے پیشوا کا مذاق اڑا رہے ہیں؟ واقعی اندھی تقلید قوموں کی فکری قوتیں سلب کر لیتی ہے، سوچنے کی بات یہ ہے کہ ''اپریل فول'' کس کے خلاف جا رہا ہے؟ اس رسم کے ذریعے کس مذہبی شخصیت کی تضحیک وتذلیل کی جا رہی ہے، یہودی ہی نہیں، عیسائی تک یہ مانتے ہیں کہ جس دن حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو گرفتار کیا گیا اور انہیں مارا پیٹا گیا، ان کا مضحکہ اڑایا گیا اسی دن کی یادگار کے طور پر یہ بری رسم شروع کی گئی ہے، عیسائی تو شاید یہودیوں کی کسی غلط بات کو غلط قرار نہ دے سکیں، مگر مسلمانوں کو تو اللہ نے ایمانی قوت اور فراست عطا کی ہے، انہیں تو اس فریب میں نہ آنا چاہیے، ان کے نزدیک بھی یہ رسم اس لحاظ سے غلط ہونی چاہیے کہ اس میں ایک عظیم پیغمبر کا اسم گرامی شامل ہے، مانا کہ تاریخی اعتبار سے یہ واقعہ غلط ہے، لیکن اس غلط واقعے کی بنیاد تو ایک اولو العزم پیغمبر کی اہانت پر رکھی گئی ہے۔ مولانا محمد تقی عثمانی صاحب نے صحیح لکھا ہے کہ ''عیسائیوں کا مزاج ومذاق اس معاملے میں عجیب وغریب ہے، جس صلیب پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ان کے خیال میں سولی دی گئی بہ ظاہر قاعدے سے تو یہ ہونا چاہیے تھا کہ وہ ان کی نگاہ میں قابل نفرت ہوتی کہ اس کے ذریعے حضرت مسیح علیہ السلام کو ایسی اذیت دی گئی لیکن یہ عجیب بات ہے کہ عیسائی حضرات نے اسے مقدس قرار دینا شروع کر دیا اور آج وہ عیسائی مذہب میں تقدس کی سب سے بڑی علامت ہے۔'' (ذکر وفکر:70)

یکم اپریل کو تہوار اور جشن کی طرح منائے جانے کے پیچھے ایک اور تاریخی روایت بھی ہے، مغرب کی مسلم دشمنی سے یہ چیز بعید نہیں کہ واقعی اس دن کو اسی لیے یادگار دن بنایا گیا ہو، جو مسلمان اس دن کے بے ہودہ لغویات میں ذوق وشوق کے ساتھ حصہ لیتے ہیں وہ ذرا

ٹھنڈے دل ودماغ سے سوچیں کہ کیا واقعی وہ محض مسرت وشادمانی کے چند لمحات کشید کر رہے ہیں یا اپنی تاریخ کی ایک المناک داستان پر خود ہی قہقہے لگا رہے ہیں؟! اسپین پر مسلمانوں نے آٹھ سو سال تک بڑی شان کے ساتھ حکومت کی ہے، وہاں کی عالی شان مسجدیں اور سر بہ فلک محل آج بھی اس شاندار دور حکومت کی کہانی سناتے نظر آتے ہیں، مسلمانوں کی باہمی چپقلش اور مسلم حکمرانوں کی عیش کوشی نے عیسائیوں کو دوبارہ اقتدار میں آنے کا موقع فراہم کیا، اسپین کی تمام ریاستیں ایک ایک کر کے مسلمانوں کے ہاتھ سے نکلتی چلی گئیں، پہلے طیطلہ، پھر اشبیلیہ، پھر قرطبہ اور آخر میں غرناطہ، مسلمان پسپا ہوتے ہوتے غرناطہ میں جمع ہو گئے تھے اور یہ آخری مورچہ تھا، جہاں مسلمانوں کے قدم جم سکتے تھے، لیکن شکست مقدر تھی، حالات ایسے پیدا ہوتے چلے گئے کہ آخری مسلم حکمران ابوعبداللہ نے الحمراء کی چابیاں کلیسا کے حوالے کر دیں، کلیسا نے ابوعبداللہ سے ایک معاہدہ کیا تھا، جس کی ایک شق یہ بھی تھی کہ جو مسلمان غرناطہ میں باقی رہ گئے ہیں ان کی جان، مال اور عزت وآبرو کی حفاظت کی جائے گی، لیکن اس معاہدہ پر عمل نہیں کیا گیا، اس کے برعکس مسلمانوں کو ظلم وتشدد کا نشانہ بنایا گیا، انہیں عیسائی مذہب اختیار کرنے پر مجبور کیا گیا، جن لوگوں نے یہ حکم ماننے سے انکار کیا ان کو باغی قرار دے کر سزائیں دی گئیں، بے شمار مسلمانوں کو زندہ جلایا گیا، کچھ لوگ جان بچا کر بھاگ گئے اور پہاڑوں اور غاروں میں جا چھپے، ایسے ہی لوگوں کو عیسائیوں نے یہ پیش کش کی کہ ان کو بہ حفاظت مراکش پہنچا دیا جائے گا، مسلمان ان کے جھانسے میں آ گئے، ان کے سامنے اس کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ بھی نہیں تھا، ایک نئی زندگی پانے کی آرزو میں بچے کھچے اور لٹے پٹے مسلمان عیسائیوں کے فراہم کردہ جہاز میں سوار ہو گئے، جب یہ جہاز بحیرۂ روم میں پہنچا تو اسے پہلے سے طے شدہ منصوبے کے تحت سمندر میں غرق کر دیا گیا، یہ المناک اور انسانیت سوز واقعہ یکم اپریل 1498ء کو پیش آیا تھا، مغربی اقوام یہ دن اس لیے مناتی ہیں، تاکہ مسلمانوں کے بے وقوف بنا کر انہیں غرق آب کرنے کے یہ لمحات یادگار بنائے جاسکیں؛ اگر اس پہلو سے دیکھا جائے تو اس دن کی کسی سرگرمی میں حصہ لینا انتہائی بے غیرتی کی بات ہے۔

اگر اپریل فول کے پیچھے یہ تمام واقعات نہ بھی ہوں تب بھی فی نفسہ کسی مسلمان کے لیے یہ جائز نہیں ہوسکتا کہ وہ اس بے ہودہ رسم میں کسی بھی طرح کا کوئی حصہ لے، کیوں کہ اس میں تین گناہ ایک ساتھ موجود ہیں، ایک تو جھوٹ، جس کی اسلام میں سخت مذمت وارد ہے، جھوٹ ایک ایسی برائی ہے جسے بہت معمولی سمجھا جاتا ہے، حالاں کہ یہ بے شمار برائیوں کی جڑ ہے، ایک جھوٹ کو سچ ثابت کرنے کے لیے کئی جھوٹ بولنے والے کا کردار مجروح ہوتا ہے، معاشرے میں اس کا اعتماد اور وقار ختم ہوجاتا ہے، اگر وہ سچ بھی بولتا ہے تو لوگ اس کو جھوٹ ہی سمجھتے ہیں، حدیث شریف میں ہے، سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: سچائی اختیار کرو، اس لیے کہ سچائی نیکی کی طرف لے جاتی ہے اور نیکی جنت کی طرف لے جاتی ہے، آدمی سچ بولتا ہے، اور سچ بولنے میں لگا رہتا ہے، یہاں تک کہ وہ اللہ کے نزدیک سچا لکھ دیا جاتا ہے، جھوٹ سے بچو، اس لیے کہ جھوٹ برائی کی طرف لے جاتا ہے اور برائی جہنم کی طرف لے جاتی ہے، آدمی جھوٹ بولتا ہے اور جھوٹ میں لگا رہتا ہے یہاں تک کہ اللہ کے یہاں جھوٹا لکھ دیا جاتا ہے۔'' (بخاری: 2261/5، رقم الحدیث: 5743، مسلم: 2012/2، رقم: 2607)

ایک اور حدیث میں ہے، سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرامؓ سے فرمایا کیا تمہیں کبیرہ گناہوں میں سے تین زیادہ بڑے گناہ نہ بتلاؤں؟ صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ! ضرور بتلائیں، فرمایا: اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک کرنا، والدین کی نافرمانی کرنا اور کسی انسان کو قتل کرنا، راوی کہتے ہیں کہ جس وقت آپ نے یہ بات ارشاد فرمائی اس وقت آپ ٹیک لگائے تشریف فرما تھے، یہ کہہ کر آپ (سیدھے ہوکر) بیٹھ گئے اور فرمایا: خبر دار! جھوٹی بات اور جھوٹی شہادت (بھی بڑا گناہ ہے)۔ آپ نے اس جملے کا اس قدر تکرار فرمایا کہ ہم (دل میں) کہنے لگے کاش! آپ سکوت اختیار فرمالیں (بخاری: 2230/5، رقم الحدیث: 5632۔ مسلم: 91/1، رقم الحدیث: 88)

بعض لوگ دوسروں کو ہنسانے کی خاطر جھوٹ بولتے ہیں، ایسے لوگوں کے متعلق حدیث شریف میں ہے ''تباہی ہے ایسے شخص کے لیے جو دوسروں کو ہنسانے کے لیے جھوٹ

بولے۔'' (ابوداؤد: 716/2، رقم الحدیث: 4990)

کسی کو دھوکا دینا بھی کچھ کم بڑا گناہ نہیں ہے، ایک حدیث میں ہے: ''من غشنا فلیس منا'' (مسلم: 99/1، رقم: 101)

''جوشخص ہمیں دھوکہ دے وہ مسلمان نہیں ہے۔''

یعنی حقیقی معنی میں وہ شخص مسلمان کہلانے کا مستحق نہیں ہے، جوفریب دیتا ہے، تیسرا گناہ جو یکم اپریل کو رسم منانے کی صورت میں ہمارے نامہ اعمال میں لکھا جاتا ہے، وہ کسی کے ساتھ تمسخر کرنا اور اس کا مذاق اڑانا ہے، مذاق اڑانا یہ ہے کہ کسی شخص کے ساتھ ایسا معاملہ کیا جائے کہ دوسرے اسے دیکھ کر ہنسنے لگیں یا حقیقت ظاہر ہونے پر وہ خود اپنے دل میں شرمندگی محسوس کرنے لگے، گو اس کا اظہار نہ کرے، حضرت عبداللہ بن عباسؓ روایت کرتے ہیں کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ''تو اپنے بھائی سے جھگڑا مت کر اور نہ اس سے (ناروا) مذاق کر ادر نہ کوئی ایسا وعدہ کر جسے تو پورا نہ کر سکے۔'' (ترمذی: 359/4، رقم الحدیث: 1995)

قرآن کریم میں ہر طرح کے تمسخر سے منع کیا گیا ہے، فرمایا: ''اے ایمان والو! نہ مردوں کو مردوں پر ہنسنا چاہیے، ہوسکتا ہے کہ جن پر ہنستے ہیں وہ ہنسنے والوں سے بہتر ہوں اور نہ عورتوں کو عورتوں پر ہنسنا چاہیے، ہوسکتا ہے جن پر وہ ہنستی ہیں ہنسنے والیوں سے بہتر ہوں۔'' (الحجرات: 11)

عام طور پر ''اپریل فول'' کو ایک بے ضرر اور سادہ سا مذاق تصور کیا جاتا ہے؛ لیکن یہ بے ضرر اور سادہ مذاق نہیں ہے، اگر اس کے تاریخی پس منظر کو نظر انداز بھی کر دیا جائے تب بھی یہ جھوٹ، فریب اور استہزا جیسے بڑے گناہوں کا مجموعہ ہے اور اللہ اور اس کے رسول کو یہ پسند نہیں ہے کہ مسلمان ان گناہوں میں مبتلا ہوں، ایک اور گناہ جو ان تمام گناہوں کے نتیجے میں سرزد ہوتا ہے وہ ایذاء مسلم کا گناہ ہے، آپ خواہ جھوٹ بولیں، یا فریب دیں یا مذاق اڑائیں ، اس سے مسلمان کو تکلیف ضرور پہنچے گی اور ایذائے مسلم کتنا بڑا گناہ ہے اس کا اندازہ قرآن

کریم کی اس آیت کریمہ سے لگایا جاسکتا ہے، فرمایا: ”اور جولوگ ایمان والے مردوں اور ایمان والی عورتوں کو بغیر کسی جرم کے ایذا پہنچاتے ہیں وہ لوگ بہتان اور صریح گناہ کا بوجھ اٹھاتے ہیں۔“ (الاحزاب:58)

”اپریل فول“ کے سلسلے میں اسلام کا موقف بالکل واضح ہے، اس میں کسی طرح کے جواز کی کوئی گنجائش ہی نہیں ہے، حضرات مفتیان کرام نے بڑے مدلّل انداز میں اسلام کے اس موقف کا اظہار کیا ہے، حضرت مولانا مفتی عبدالرحیم لاج پوریؒ نے ایک استفتا کے جواب میں لکھا کہ ”اپریل فول منانا یہ نصاریٰ کی سنت ہے، اسلامی طریقہ نہیں یہ ہے، جھوٹ بولنا حرام ہے، حدیث شریف میں ہے: **”ویل للذی یحدث، فیکذب، لیضحک به القوم، ویل له ویل له“** (ابوداؤد:716/2، رقم الحدیث:4338)

”اس آدمی کے لیے ہلاکت ہے جو لوگوں کو ہنسانے کے لیے جھوٹ بولتا ہے۔“ اور حدیث میں ہے: ”کوئی بندہ پورے ایمان کا حامل نہیں ہوگا، جب تک وہ جھوٹ کو ترک نہ کر دے، جھوٹ خواہ ہنسی مذاق میں ہو، خواہ لڑائی جھگڑے میں۔“ (مسند احمد:352/2، رقم الحدیث:8615)

اس کے علاوہ حقیقت یہ ہے کہ جھوٹ بولنا بڑی خیانت ہے، کیوں کہ انسان اللہ اور لوگوں کا امین ہے، اس کو سچ ہی بولنا چاہیے، جھوٹ بولنا امانت کے منافی ہے، حدیث شریف میں ہے: ”یہ بہت بڑی خیانت ہے کہ تم اپنے بھائی سے کوئی بات اس طرح کہو کہ وہ تم کو سچا جان رہا ہو، حالاں کہ تم جھوٹ بول رہے ہو۔“ (ابوداؤد:711/2، رقم الحدیث:4971)

مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ اس لغو، بے ہودہ اور خلاف تہذیب مذاق اور وقارِ انسانیت کے منافی اس رسم سے دور رہیں، یہی اسلام کا مطالبہ بھی ہے اور یہی عقل وخرد کا تقاضا بھی۔

کرکٹ؛ کھیل یا جنگ

چمپینز ٹرافی کے فائنل میں پاکستان نے ہندوستان کو ایک سو اسی رنوں سے شکست دی اور چیمپئن بننے کا اعزاز حاصل کیا، یہ خبر آپ کی طرح ہم نے بھی سنی اور پڑھی، بہ ظاہر اس خبر میں کوئی خاص بات نہیں ہے، کھیل رات دن ہوتے ہیں اور جیت ہار کا سلسلہ بھی چلتا رہتا ہے، لیکن اگر کرکٹ کا میچ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان ہو تو پھر یہ کھیل کھیل نہیں رہتا، بل کہ دو روایتی حریفوں کے درمیان جنگ کی شکل اختیار کر لیتا ہے، راقم الحروف کو اس کھیل سے اس حد تک تو دل چسپی ہے کہ یہ معلوم کر لیتا ہے کہ کون سی ٹیم کھیل رہی ہے اور اس کا اسکور کیا ہے لیکن اتنی دل چسپی کبھی نہیں رہی کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر ٹی وی سیٹ سے چپک کر بیٹھ جائے، اور ہر چو کے چھکے پر تالیاں پیٹ پیٹ کر بے حال ہو جائے، خاص طور پر ان دو ملکوں کے کھیل سے اگر یہ دونوں آمنے سامنے ہوں تو دل چسپی سے زیادہ خوف محسوس ہوتا ہے، اور اسکور معلوم کرنے کی بھی ہمت نہیں ہوتی، ہمارے ملک کا ماحول کچھ اس طرح کا بن گیا ہے کہ اگر پاکستان کے مقابلے میں ہندوستان جیت جاتا ہے تو مسلمانوں کی خاموشی کو افسوس اور ان کی خوشی کو نفاق سے تعبیر کیا جاتا ہے اور اگر پاکستان جیت جاتا ہے تو غلطی سے کوئی مسلمان مسکرا بھی دے تو اسے غدار کا خطاب دے دیا جاتا ہے، ماضی میں کئی فسادات ان دونوں ملکوں کی شکست و فتح کے نتیجے میں رونما ہوئے، کئی سالوں سے ہندو پاک کی کرکٹ ٹیمیں ایک دوسرے کے ملکوں میں نہیں جا رہی تھیں اور نہ دوسرے ملکوں میں ان کے مقابلے ہو رہے تھے، اس سے بڑا سکون تھا لیکن برا ہو ویلز اور لندن والوں کا کہ انھوں نے چمپینز ٹرافی کے کھیل منعقد کر کے ان دونوں ٹیموں کو آمنے سامنے کر ہی دیا، جب دو ٹیمیں کھیلتی ہیں تو کسی ایک ہی کو فتح نصیب ہوتی ہے، اگر میچ فکس نہ ہو تو اسے محنت سے زیادہ مقدر کا کھیل سمجھا جاتا ہے، اس ٹرافی میں بھی ایسا ہی ہوا، محض اتفاق سے پاکستان کی ٹیم ایک سو اسی رنوں سے جیت گئی اور ہماری ٹیم ایک سو اٹھاون کے اسکور پر سمٹ کر رہ گئی، کھلاڑی اوول کے میدان میں کرکٹ کو کھیل سمجھ کر کھیل رہے تھے، لیکن دونوں ملکوں کے کروڑوں لوگ اسے ہندو مسلم جنگ کے نقطہ

نظر سے دیکھ رہے تھے،کھیل سے پہلے،کھیل کے دوران اور کھیل کے بعد سوشل میڈیا پر جس طرح کے تبصرے ایک دوسرے کے خلاف دیکھنے اور پڑھنے کو ملے ان سے ایسا لگتا تھا کہ کھیل نہیں ہورہا ہے بلکہ محاذ جنگ پر لڑائی چل رہی ہے، برادران وطن کی بات تو ہم بعد میں کریں گے پہلے ہم پاکستان کے مسلمانوں پر ماتم کرلیں کہ انھوں نے کھیل کے پتے رمضان کے تقدس کا بھی خیال نہیں رکھا یہ عبادت کا مہینہ ہے، اس کا ایک ایک لمحہ قیمتی ہے، ایک اچھے مسلمان کی شان یہ ہونی چاہئے کہ وہ اپنے ہر لمحے کی قیمت وصول کرے، اس کے برعکس فائنل والے دن جس طرح سلطنت خداداد کے مسلمانوں نے رمضان کو بالائے طاق رکھ کر کھیل کی جنگ میں شرکت کی اس سے بڑی مایوسی ہوئی ہے، اگر بات عوام تک محدود رہتی تو بھی دل کو سمجھالیا جاتا وہاں تو جبہ ودستار والے بھی اسے کفر واسلام کی جنگ سمجھ کر اس میں حصہ لے رہے تھے۔

پاکستان کے اُردو روزنامے ''جسارت'' کے حوالے سے سوشل میڈیا پر ایک مضمون نظر سے گزرا، اس کے لکھنے والے پاکستان کے مشہور عالم دین، معروف صاحب قلم مولانا زاہد الراشدی صاحب ہیں، راقم نے ان کا یہ مضمون پڑھا تو اپنا سر پیٹ لیا، بہت دیر تک تو یہ یقین ہی نہیں آیا کہ فکر دیوبند کی ترجمانی کرنے والے علامہ راشدی صاحب بھی اس طرح کی باتیں کرسکتے ہیں، جہاں تک کرکٹ سے ان کی، ان کے بیٹوں، پوتوں اور والدہ محترمہ کی دلچسپی کا معاملہ ہے اس پر کچھ کہنا بیکار ہے، یہ تو اپنا اپنا شوق ہے، والدہ صاحبہ نے پاکستان کی جیت کے لئے اتنی نفلیں قبولیں جتنے رنوں سے پاکستانی ٹیم کی جیت مقدر تھی، اس سلسلے میں بھی ہم کچھ نہیں کہہ سکتے، اب ان کی والدہ صاحبہ ایک سو اسی نفلیں ادا کررہی ہوں گی، ظاہر ہے قبولی ہیں تو ادا بھی کرنی ہوں گی، ہمیں تو اعتراض اس بات پر ہے کہ انہوں نے اس کھیل کو روم وفارس کی جنگ سے تشبیہ دیتے ہوئے یہ ارشاد فرمایا ہے کہ جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے ابتدائی دنوں میں مشرکین مکہ فارس کی طرف اور مسلمان روم کی طرف تھے اور فارس کی فتح کی خبر سن کر کفار خوشی سے جھوم اٹھتے تھے اور روم کی فتح کی خبر سن کر مسلمانوں کے

چہرے جگمگا اٹھتے تھے یہی صورت حال اس کھیل میں بھی سامنے آرہی ہے، علامہ راشدی صاحب ایک ذمہ دار عالم سمجھے جاتے ہیں، ان کے قلم سے اس طرح کے تصورات کی اشاعت کو ذمہ دارانہ نہیں کہا جا سکتا، پہلی اور قطعی بات تو یہ ہے کہ کرکٹ صرف ایک کھیل ہے، ہم سب کو مل کر دونوں ملکوں کی حکومت اور عوام کو یہ سمجھانے کی کوشش کرنی چاہئے کہ اگر دونوں ملکوں کے لئے کرکٹ کھیلنا ضروری ہی ہے تو وہ اسے کھیل سمجھ کر کھیلیں، جنگ سمجھ کر نہ لڑیں، کیوں کہ جنگ چاہے وہ کسی بھی صورت میں ہو ان دونوں میں سے کسی کے حق میں بھی بہتر نہیں ہے، اگر جنگ کرنی ہے تو غربت سے، جہالت سے، فرقہ واریت سے، مسلکی منافرت سے، کرپشن سے، ناانصافیوں سے کریں، اسی میں دونوں ملکوں کی بھلائی ہے، اس کوشش کے بجائے جب ہم کھیل کو ہندو مسلم جنگ کے نقطہ نظر سے دیکھتے ہیں اور اس کے لئے تاریخ کے دامن سے الٹی سیدھی دلیلیں لانے کی کوشش کرتے ہیں تو ہم نہ انسانیت کی خدمت کرتے ہیں اور نہ اپنے ملک کی بھلائی کے بارے میں سوچتے ہیں۔

روم اور فارس کی جنگ مجوسیوں اور عیسائیوں کے درمیان لڑی گئی تھی، مشرکین مکہ اپنے عقائد ونظریات کے لحاظ سے خود کو مجوسیوں کے قریب تصور کرتے تھے اور آسمانی مذہب ہونے کے خیال سے مسلمان روم کے نصاری کو اپنا سمجھ رہے تھے، یوں یہ جنگ مشرکین اور مسلمانوں کی دل چسپی کا موضوع بن گئی تھی، اس میں مشرکین اور مسلمان براہِ راست شریک نہیں تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد جب فارس کے مجوسیوں نے رومیوں پر غلبہ پایا تو مسلمانوں کے چہرے لٹک گئے اس وقت قرآن عظیم نے فتح فارس کی پیش گوئی کی جو بعثت نبوی کے پانچ سال بعد سچ ہو کر رہی، اس تاریخی واقعے کو کرکٹ کے کھیل پر منطبق کرنے کی اس کوشش کو اس کے علاوہ کیا کہیں گے کہ پاکستان کے اہل علم بھی جذبات کی رو میں بہہ رہے ہیں۔

جہاں تک برادران وطن کا معاملہ ہے انہیں بھی کھیل کو کھیل سمجھنا چاہئے، کرکٹ کے کھیل میں ہندوستان نے پاکستان کو کئی بار شکست دی ہے، اور آئندہ بھی دے گا، اگر اس بار ہم

ہار گئے تو اس قدر جذباتی بننے کی ضرورت نہیں ہے، ان کو ہندوستانی مسلمانوں کے بارے میں اپنے نظریئے کو بھی تبدیل کرنا چاہئے، کشمیر کے مسلمانوں کے آئینے میں باقی مسلمانوں کو دیکھنے کی کوشش نہ کی جائے، ان کے مسائل الگ ہیں، باقی ہندوستان کے تمام مسلمانوں کو اپنے ملک سے اتنی ہی محبت ہے جتنی آپ کو ہے، وہ بھی چاہتے ہیں کہ ان کا ملک ہر کھیل میں جیتے اور اس کے کھلاڑی ہر کھیل میں اپنے ملک کا نام روشن کریں، میڈیا کے پروپیگنڈے سے متأثر نہ ہوں، آج کل ایک ویڈیو وائرل ہو رہا ہے اس میں دکھلایا گیا ہے کہ کسی ایک بڑے ہال میں سینکڑوں ڈاڑھی ٹوپی اور کرتے پاجامے والے لڑکے اور عمر رسیدہ لوگ جمع ہیں، سامنے دیوار پر ایک بڑی اسکرین پر کھیل کے مناظر دکھلائے جارہے ہیں اور وہ پاکستانی ٹیم کی کارکردگی پر خوشی سے بلیوں اچھل رہے ہیں اس ویڈیو کے متعلق یہ کہا گیا ہے کہ یہ بمبئی کے میرا روڈ کی مسجد کا منظر ہے، اے بی پی نیوز نے اس کا سچ جاننے کی کوشش کی تو پتہ چلا کہ میرا روڈ بمبئی میں اس طرح کی کوئی مسجد ہے ہی نہیں، ویسے بھی الحمد للہ ہماری مسجدوں میں اس طرح کی خرافات کا کوئی گزر نہیں، معلوم ہوا کہ یہ منظر پاکستان کے کسی شہر کا ہے اور وہاں پاکستانی ٹی وی کے اسپورٹ چینل کی نشریات دیکھی جارہی ہیں، دراصل کچھ گروپ کسی نہ کسی بہانے ہندو مسلم منافرت پھیلا کر اپنا الّو سیدھا کرنا چاہتے ہیں، برادران وطن کو یہ حقیقت سمجھ لینی چاہئے، اور مسلمانوں کی حب الوطن کو شک کے دائرے میں لانے سے گریز کرنا چاہئے، ویسے ہماری دلی تمنا یہ ہے اور دُعا بھی ہے کہ ہندو پاک کے درمیان کبھی کوئی کھیل نہ ہو، حکومتیں اور کھلاڑی تو ان کھیلوں کے ذریعے نفع کماتے ہیں اور عوام بیچارے اپنی جانیں گنواتے ہیں، اب جنگ کا یہ کھیل یا کھیل کی یہ جنگ ہمیشہ کے لئے ختم ہی ہو جائے تو بہتر ہے۔

فتوؤں کی گرم بازاری

آج کل فتووں کے متعلق بہت کچھ لکھا پڑھا اور سنا جارہا ہے، میڈیا نے اس موضوع کو بار بار اٹھا کر اسے ایک مسئلہ بنادیا ہے، ورنہ فتویٰ پوچھنے اور بتلانے کا کام نیا نہیں ہے، ہر دور میں مسلمان اپنے علماء اور فقہاء سے مسائل معلوم کرتے رہے ہیں، زبانی بھی اور تحریری بھی، اسلام کے دورِ اوّل میں صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اپنے سوالات پیش کرتے اور جواب پاتے، یہ تمام سوال و جواب حدیث کی کتابوں میں موجود ہیں اور امت آج تک ان سے استفادہ کررہی ہے۔ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد وہ صحابہ کرامؓ یہ خدمت انجام دیتے رہے جنہیں اللہ تعالیٰ نے فقہی بصیرت سے نوازا تھا، علامہ ابن القیمؒ نے ''اعلام الموقعین'' میں ایک سوتیس صحابہ کرامؓ کے اسمائے گرامی ذکر کیے ہیں جو فتویٰ دیا کرتے تھے، یہ سلسلہ اس وقت سے اسی طرح چل رہا ہے اور قیامت تک اسی طرح جاری رہے گا۔ فقہی احکام مدون ہونے کے بعد فتویٰ نویسی نے باقاعدہ ایک فن کی شکل اختیار کرلی، پہلے طلبہ ماہر فن اساتذہ کی خدمت میں رہ کر فقہ وفتاویٰ کی تعلیم حاصل کرتے تھے، بعد میں اس فن کی درس گاہیں بن گئیں اور طلبہ ان درس گاہوں میں رہ کر یہ فن حاصل کرنے لگے، ماضی میں بہت سے فقہاء ایسے گزرے ہیں جنہوں نے اس موضوع پر باقاعدہ کتابیں لکھی ہیں، یا ان کے فتاویٰ جمع کیے گئے ہیں، اس طرح کی فقہی کتابیں اور مجموعے کئی کئی ضخیم جلدوں میں ہیں، ان میں بہت سی کتابوں کی باقاعدہ تعلیم ہوتی ہے؛ بعض کتابیں مطالعے میں رکھی جاتی ہیں اور بوقت ضرورت ان کی طرف مراجعت کی جاتی ہے، ماضی قریب میں برصغیر ہندوپاک میں بھی ایسے بہت سے فقہاء گذرے ہیں جن کے فتاویٰ کے مجموعے اردو میں مرتب ہوکر شائع ہوئے، جیسے فتاویٰ دارالعلوم دیوبند، امدادالفتاویٰ، احسن الفتاویٰ، فتاویٰ رحیمیہ، فتاویٰ محمودیہ، خیر الفتاویٰ، فتاویٰ عثمانی وغیرہ، آج بھی بہت سے مفتیانِ کرام ایسے ہیں جن پر امت اعتماد کرتی ہے، اور ان کے فتاویٰ کو حرفِ آخر سمجھا جاتا ہے۔

یہاں یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ مفتی اپنی طرف سے کچھ نہیں بتلاتا، بلکہ پیش آمدہ سوال یا مسئلے کا حل کتاب وسنت کی روشنی میں پیش کرتا ہے، اور اگر اسے کتاب وسنت میں کوئی واضح ہدایت نہیں ملتی تو اس مسئلے کی نظیریں تلاش کرتا ہے اور ان کی روشنی میں حل ڈھونڈتا ہے، خود اپنی عقل سے کوئی فیصلہ نہیں کرتا۔

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ایک مسلمان کی زندگی پر فقہی احکام ومسائل کا گہرا اثر مرتب ہوتا ہے، بہت سے نیک لوگ جو شریعت کے سانچے میں ڈھل کر زندگی گزارنا چاہتے ہیں وہ قدم قدم پر شریعت کی رہ نمائی حاصل کرتے ہیں، اور اس کے لیے انہیں کتابوں سے مدد لینی پڑتی ہے اور اگر کتابوں سے ان کی ضرورت پوری نہیں ہوتی تو وہ اہل علم کی طرف لپکتے ہیں اور ان سے پوچھتے ہیں، علماء حضرات بھی مسئلہ بتلانے میں تأمل نہیں کرتے کیوں کہ وہ سمجھتے ہیں کہ شریعت میں مسلمانوں کی رہ نمائی ان کی ذمہ داری ہے۔فتویٰ کی اہمیت کو ہر مسلمان تسلیم کرتا ہے، خواہ وہ باعمل مسلمان ہو یا بےعمل۔

بدقسمتی سے ہمارے دور میں ذرائع ابلاغ نے انسانی دل ودماغ پر اپنا تسلط جما لیا ہے، وہ انسان کی زندگی کے ہر گوشے میں کچھ اس طرح دخیل ہوگیا ہے کہ ہم چاہیں بھی تو اس سے چھٹکارا نہیں پا سکتے، اب سے کچھ سال پہلے تک یہ صورتِ حال نہیں تھی، ہمارے ملکوں میں الیکٹرانک میڈیا کے نام پر صرف سرکاری چینل دوردرشن تھا جس نے خبر ناموں اور تفریحی پروگراموں تک خود کو محدود کر رکھا تھا، صرف اخبارات ہی وسیلہ اطلاع تھے، عام طور پر فضا بھی فرقہ واریت کی بادسموم سے اس حد تک مکدر نہیں ہوئی تھی، اس لیے لوگ محض باخبر رہنے کے لیے یا تفریح طبع کے لیے اخبارات ورسائل دیکھتے تھے۔ جب سے الیکٹرانک میڈیا کے نام پر سینکڑوں کی تعداد میں ملکی اور غیر ملکی چینل شروع ہوئے ہیں انہوں نے سب کو اپنے حصار میں لے لیا ہے، کیا بچے، کیا بوڑھے، کیا جوان، اس لیے کہ ان چینلوں کے پاس ہر عمر اور ہر معیار کے لوگوں کے ذوق کی تسکین کے لیے سامان موجود ہے، خبریں بھی ہیں، فلمیں بھی ہیں، کھیل کود بھی ہے، کارٹون بھی ہے، موسیقی بھی ہے، اکثر وبیشتر چینل رات دن رواں دواں رہتے

ہیں، چینلوں کی کثرت نے ان کے درمیان مقابلہ آرائی کی فضا پیدا کر دی ہے، ہر چینل یہ چاہتا ہے کہ وہ اپنے ناظرین کے سامنے ایسا کچھ پیش کرے جس سے اس کی واہ واہ ہو، ناظرین کی تعداد بڑھے، اس کے نتیجے میں اشتہارات زیادہ ملیں، خوب پیسہ کمائیں، مسابقت کا یہ جذبہ انہیں نت نئے موضوع تلاش کرنے پر مجبور کرتا ہے۔

فتوے سے زیادہ دلچسپ موضوع ان چینلوں کو کوئی دوسرا نہیں مل سکتا، کیوں کہ وہ فتووں کی آڑ میں اسلام اور مسلمانوں کا مذاق اڑا کر نہایت آسانی کے ساتھ اپنی ٹی آر پی بڑھا سکتے ہیں۔

سب سے پہلے تو ہم یہ عرض کرنا چاہیں گے کہ فتویٰ دینے کی ذمہ داری کوئی معمولی ذمہ داری نہیں ہے اس میں کسی چیز کے جواز یا عدم جواز، حلت یا حرمت کے متعلق اللہ تعالیٰ کے حکم کو بتلانا پڑتا ہے اس طرح ایک مفتی شریعت کی ترجمانی کرتا ہے، اس ترجمانی کے دوران وہ کسی شرعی حکم میں ادنیٰ درجے کا تغیر بھی نہیں کرسکتا، وہ اس حکم کی توضیح وتشریح تو کرسکتا ہے، مگر اسے یہ اجازت نہیں کہ وہ اس میں کوئی تبدیلی کرے۔ اس طرح دیکھا جائے تو یہ بڑی ذمہ داری ہے، اگر ہم یہ کہیں کہ یہ ایک پل صراط ہے تو اس میں کوئی مبالغہ نہیں، مسئلہ بتلانے میں صحابہ کرامؓ جیسے لوگ بھی احتیاط سے کام لیتے تھے، صحابہ کرامؓ کے واقعات میں ہے کہ اگر کسی صحابیؓ سے کوئی سوال کیا جاتا تو وہ دوسرے کے پاس اور دوسرا تیسرے کے پاس بھیج دیتا یہ سلسلہ اسی طرح دراز ہوتا یہاں تک کہ سائل پہلے والے صحابی کی طرف واپس آجاتا اور ان سے دریافت کرتا۔ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ فرماتے ہیں کہ ''مجھ کو فقہ ہی میں بولتے ہوئے ڈر معلوم ہوتا ہے، مسائل کا بہت نازک معاملہ ہے۔'' (الافاضات الیومیۃ ج۱،ص۴۹) ایک جگہ فرمایا ''فقہ کا فن بڑا ہی نازک ہے، میں اتنا کسی چیز سے نہیں ڈرتا جتنا اس سے ڈرتا ہوں۔'' (حسن العزیز ج۱،ص۱۴۴) حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ بانی دارالعلوم دیوبند کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ فتویٰ نہیں دیتے تھے بلکہ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے پاس بھیج دیا کرتے تھے۔ (حسن العزیز ج۲،ص۲۰۲) مگر آج کل شرعی مسائل کے باب

میں بے باکی بہت بڑھ گئی ہے، حد یہ ہے کہ بعض وہ لوگ جو محض صورت سے عالم لگتے ہیں مسئلہ بتلانے بیٹھ جاتے ہیں، بہت سے اہل علم کو دیکھا ہے کہ وہ ہر سوال کا جواب دینا ضروری سمجھتے ہیں چاہے انہیں معلوم ہو یا نہ معلوم ہو، خواہ انہیں اس مسئلے کی تحقیق ہو یا نہ ہو، وہ لا ادری (میں نہیں جانتا) کہنا اپنی شان کے منافی سمجھتے ہیں حالاں کہ حضرت امام مالکؒ جیسا محدث اور فقیہ بھی اس میں کوئی جھجک نہیں سمجھتا تھا، ان کے حالاتِ زندگی میں لکھا ہے کہ ایک مرتبہ امام صاحبؒ سے ۴۰ سوال کیے گئے، جن میں سے ۳۶ کے جواب میں انہوں نے لا ادری کہا، صرف چار کا جواب دیا، حضرت تھانویؒ نے یہ واقعہ بیان کرنے کے بعد لکھا ہے کہ آخر خوفِ خدا بھی کوئی چیز ہے۔ (الافاضات الیومیہ ج۱ص۵۹)

اصل بات یہ ہے کہ ہم تعلیمی انحطاط میں مبتلا ہیں، تیز رفتار زندگی نے ہمیں ہر شعبے میں برق رفتاری کا عادی بنا دیا ہے، پہلے لوگ سال ہا سال کی محنت کے بعد کسی لائق بنتے تھے، اب وقت رہا ہے اور نہ محنت، حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی نے اپنے والد ماجد مفتی اعظم حضرت مولانا مفتی محمد شفیع عثمانیؒ کے حالاتِ زندگی میں لکھا ہے کہ ''کسی بھی علم وفن میں کوئی بھی اعلیٰ مقام حاصل کرنے اور اس مقام کو خدمت دین اور خدمت خلق کے نقطہ نظر سے مفید بنانے کے لیے بڑے مراحل سے گزرنا ہوتا ہے، حضرت والد صاحب کو اللہ تعالیٰ نے علومِ دین اور بالخصوص فقہ وفتویٰ میں جو مقام بلند عطا فرمایا وہ اللہ تعالیٰ کی عطائے خاص کے علاوہ اس طرزِ عمل کا نتیجہ ہے جو اس سلسلے میں آپ نے اختیار فرمایا، اور اس طرزِ عمل کا خلاصہ احقر کی ناچیز رائے میں چار چیزیں ہیں: (۱) پیہم محنت (۲) للّٰہیت (۳) بزرگوں کی صحبت اور ان سے تربیت حاصل کرنے کا اہتمام (۴) اور غایت احتیاط۔'' (البلاغ مفتی اعظم نمبر ۱۱۴)

آج کل جو حضرات فقہ وفتاویٰ کی تعلیم حاصل کر کے منصب افتاء پر بیٹھ جاتے ہیں وہ خود اپنا احتساب کریں کہ ان چار امور میں سے ان کے پاس کیا چیز ہے؟ اگر ہم یہ کہیں تو غلط نہ ہوگا کہ ہمارا نظام فتویٰ رو بہ انحطاط ہے، اس سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا، اس کی چند بنیادی وجوہات ہیں جن کی طرف ہم ذیل میں اشارہ کرنا چاہتے ہیں۔

گذشتہ دس پندرہ برسوں کے درمیان جگہ جگہ دارالافتاء قائم ہو چکے ہیں، پندرہ بیس برس پہلے صرف مشہور ومعروف مرکزی مدارس میں افتاء کے شعبے ہوا کرتے تھے، اب شاید ہی کوئی مدرسہ ایسا ہو جہاں یہ شعبہ قائم نہ ہو، ہم بعض ایسے مدارس سے واقف ہیں جہاں عربی کے درجات موجود نہیں ہیں، لیکن وہاں افتاء کی تعلیم بھی دی جاتی ہے، اور فتویٰ دینے کا بندوبست بھی ہے، بعض لوگوں نے چھوٹے چھوٹے قصبوں میں، بلکہ گاؤں دیہات میں اپنے ذاتی دارالافتاء بنا لیے ہیں، ان اداروں میں افتاء کی تعلیم بھی ہوتی ہے اور یہاں سے فتوے بھی جاری کیے جاتے ہیں، ایسے لوگوں کو سوچنا چاہیے کہ وہ اس طرح کے ادارے قائم کر کے نظام افتاء کی خدمت کے بجائے اس نظام کا توازن بگاڑ رہے ہیں، صحیح بات یہ ہے کہ مسلم معاشرے میں مفتی کو جو وقار اور اعتبار حاصل ہے اسے پانے کے لیے ہمارے نوجوان علماء اپنے نام کے ساتھ مفتی کا سابقہ لگانا چاہتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ آج ہر دینی درس گاہ میں افتاء کی تعلیم حاصل کرنے والوں کا ایک ہجوم ہے، اہل مدارس بھی افتاء کی تعلیم کو اپنی حصولیابیوں میں سرفہرست رکھنے پر مجبور ہیں کیوں کہ چندہ دہندگان کی پسندیدگی اسی کو حاصل ہے، طلبہ کی خواہش، ذمہ داران مدارس کی کوشش اور چندہ دینے والوں کی پسندیدگی کے تکون نے اس تعلیم کو اس کے اعلیٰ معیار سے ہٹا دیا ہے، بعض مدارس سے صرف نام کے مفتی نکل رہے ہیں، ان میں نہ فقہی شعور پایا جاتا ہے، اور نہ عصری اسلوب میں مسائل کی تفہیم کا سلیقہ، اور نہ معاشرتی تقاضوں اور ضرورتوں کا صحیح ادراک، یہی وجہ ہے کہ بالکل بدیہی معاملات میں بھی متضاد فتاویٰ جاری ہوتے ہیں، فتووں کے اس تضاد نے معاشرے میں نظامِ فتویٰ نویسی کو مذاق کا موضوع بنا دیا ہے، پہلے اگر کوئی فتویٰ جاری ہوتا تھا تو متعلقہ لوگ اس کے سامنے خود کو دینی اور سماجی اعتبار سے بے بس محسوس کرتے تھے، اب وہ اس کے اثرات سے خود کو آزاد تصور کرتے ہیں، متعلقہ افراد کو سوچنا چاہیے کہ آخر یہ صورتِ حال کیوں پیدا ہوئی؟

نظام افتاء کی اس توسیع پسندی نے اس نظام کی مرکزیت کو کمزور کر دیا ہے، اب سے چند سال پہلے تک اہم مسائل ومعاملات میں دارالعلوم دیوبند جیسے مرکزی اداروں کی طرف

رجوع کیا جاتا تھا، اور ان اداروں سے جاری ہونے والے فتووں کو حرفِ آخر سمجھا جاتا تھا، اب صورتِ حال تبدیلی کی طرف مائل ہے، اور اس سے ہمارے اداروں کی مرکزیت کو خطرہ لاحق ہو گیا ہے، اربابِ بست وکشاد کو اس پورے نظام کا جائزہ لینے سے پہلے اس پہلو کو بھی سامنے رکھنا ہوگا۔

غیر معیاری مفتیوں کے اس سیلِ رواں پر قابو پانے کے لیے ضروری ہے کہ افتاء کی تعلیم کو چند مرکزی درس گاہوں تک محدود کیا جائے، اور ان درس گاہوں میں بھی اس تعلیم کے لیے ایسی شرائط عائد کی جائیں کہ صرف قابل اور ذی استعداد طلبہ ہی ان شرائط کی تکمیل کر سکیں، اکثر مدارس میں افتاء کی تعلیم کے لیے صرف ایک سالہ کورس ہے، یہ مدت اچھا مفتی بننے کے لیے بہت مختصر ہے، کم از کم سہ سالہ نصابِ تعلیم ضروری ہے اس میں دو سال مختلف علوم وفنون کی تعلیم کے لیے اور ایک سال تدریب وتمرین کے لیے ہونا چاہیے، زیرِ تعلیم طالب علم کو اسی وقت افتاء کی سند سے سرفراز کرنا چاہیے جب ہر طرح سے یہ تسلی اور اطمینان ہو جائے کہ وہ صحیح معنی میں مفتی بننے کا اہل ہے۔ افتاء کی تعلیم کے نصاب میں فقہ وفتاویٰ کی کتابوں کے ساتھ ساتھ انگریزی اور ہندی زبانیں بھی سکھلائی جائیں، اور ان سماجی، اقتصادی اور نفسیاتی علوم میں بھی مہارت پیدا کرائی جائے جن کی ضرورت فتویٰ نویسی کے دوران پیش آسکتی ہے، ایک مفتی کے لیے ضروری ہونا چاہیے کہ وہ جدید وقدیم علوم کا ماہر، وقت کے تقاضوں سے باخبر، اور عصری اسلوبِ تفہیم سے واقف اور ظاہر وباطن کے اعتبار سے اسلامی تعلیمات پر سختی کے ساتھ عمل پیرا ہو۔

مرکزی درس گاہوں میں قائم دارالافتاء کے علاوہ اس میدان میں جو ادارے اس وقت کام کر رہے ہیں ان کو چاہیے کہ وہ اپنی سرگرمیوں کو محدود کریں، خاص طور پر سیاسی اور سماجی طور پر حساس اور مختلف فیہ مسائل ومعاملات میں فتویٰ دینے سے اجتناب کریں اور ان کو مرکزی اداروں پر محول کر دیں۔

آج کل فتویٰ پوچھنے کا رجحان بہت زیادہ بڑھ گیا ہے، کوئی بھی واقعہ ہو، کسی بھی

طرح کا مسئلہ ہو فوراً ہی شریعت کے بعض ہمدرد اور بہی خواہ حضرات خواہ وہ اس واقعے سے براہِ راست متعلق ہوں یا نہ ہوں ایک عدد سوال نامہ تیار کر کے مفتیانِ کرام کی طرف بڑھا دیتے ہیں، اور اسے کارِ خیر سمجھنے کی غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں، بیشتر حضرات صرف جذبہ خود پرستی اور خود نمائی کی تسکین کے لیے اس طرح کے سوال نامے مرتب کرتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں کہ مفتیانِ کرام کو سوالات کی پیچیدگی میں اُلجھا دیں، مفتیانِ کرام بھی ہر رطب و یابس کا جواب دینا، اور ہر مسئلے پر اپنی رائے ظاہر کرنا ضروری سمجھتے ہیں، یہ صحیح ہے کہ مفتی کی ذمہ داری یہ نہیں ہے کہ وہ سوالات کی گہرائی میں جائے اور سائل کی نیت کا پتہ لگائے، لیکن اس کو اتنا بھی سادہ لوح نہیں ہونا چاہیے کہ وہ کسی سائل کی شرانگیزی کو نہ سمجھ سکے، یا جواب سے پیدا ہونے والے رَدِّ عمل کا اندازہ نہ لگا سکے، اس لیے مفتیانِ کرام کی ذمہ داری ہے کہ وہ حساس معاملات میں خاموشی کا وطیرہ اپنائیں یا وسیع تر مشاورت کے بعد فتویٰ دیں اس سلسلے میں مرکزی درس گاہوں کو مفتیانِ کرام کے لیے رہ نما اصول وضع کرنے چاہئیں۔

مسلم پرسنل لاء بیداری مہم

ایک بڑی ملّی تنظیم جماعت اسلامی ہند نے ۲۳/ اپریل سے ۷/مئی تک پورے ملک میں مسلم پرسنل لاء بیداری مہم چھیڑنے کا فیصلہ کیا ہے، ایک اور بڑی ملّی جماعت ''جمعیت علمائے ہند'' (مولانا سیّد محمود اَسعد مدنی گروپ) نے اس مہم کی تائید کی ہے اور اپنے ارکان سمیت تمام مسلمانوں سے اپیل کی ہے کہ وہ جماعت اسلامی کی اس مہم کا حصہ بنیں، بلا شبہ پورے ملک میں دونوں جماعتوں کا بڑا نیٹ ورک ہے، خود جماعت اسلامی ہند کی ۱۱/سو شاخیں ہیں، اور جمعیت علمائے ہند بھی تقریباً ہر شہر، ہر قصبے اور ہر گاؤں میں سرگرم عمل ہے، امید ہے یہ مہم اپنے مقصد میں کامیاب ہوگی۔

اس میں شک نہیں کہ دینی تعلیم سے دوری، اور جہالت نے مسلمانوں کی اکثریت کو دین سے دور کردیا ہے، اسلام کی بہت سی تعلیمات ایسی ہیں جن سے بہت سے تعلیم یافتہ لوگ بھی باخبر نہیں ہیں، اسی لیے مسلم معاشرے میں بہت سے معاملات کے حوالے سے غلط فہمیاں پھیلی ہوئی ہیں، مسلمانوں کی اسی ناواقفیت سے فائدہ اٹھا کر ملک کے ٹی وی چینل اسلامی تعلیمات کا کھلم کھلا مذاق اڑانے میں مصروف ہیں، اگرچہ وہ اپنے پروگراموں میں بعض مولوی نما داڑھی والوں کو اور کچھ حقیقی مولویوں کو بھی بلاتے ہیں تاکہ یہ ثابت کیا جاسکے کہ وہ اپنے پروگراموں میں مولویوں کو بھرپور نمائندگی دے رہے ہیں، اس کے ساتھ ہی کچھ ایسی نام نہاد مسلم خواتین اور جدید تعلیم یافتہ حضرات کو بھی خالص فقہی اور شرعی موضوعات پہ گفتگو کرنے کے لیے بٹھادیتے ہیں جن کو شریعت کے متعلق کچھ بھی معلوم نہیں ہوتا، لیکن وہ اپنی جرأت بے جا اور اینکروں کے جانب دارانہ تعاون سے اسلام اور اس کی تعلیمات پر بہ طورِ خاص عورتوں کے متعلق اس کے تصورات اور نظریات پر تابڑ توڑ حملے کرتے ہیں، دوسری طرف مولوی نما داڑھی والے حضرات اپنی جہالت کی وجہ سے اور حقیقی مولوی اپنی بے زبانی اور خود اعتمادی میں کمی کی وجہ سے ان حملوں کا مقابلہ نہیں کرپاتے اور میدان سے راہِ فرار اختیار کرنے پر مجبور ہوجاتے ہیں، اس پسپائی سے اینکر حضرات یہ سمجھتے ہیں کہ انہوں نے کوئی بڑا قلعہ فتح کرلیا

ہے، دار العلوم دیو بند نے اس طرح کے نام نہاد ٹی وی چینلوں کا بائیکاٹ کرنے کی اپیل کی ہے اور کہا ہے کہ علماء اور دانش ور حضرات ان مباحثوں میں شریک ہو کر اسلامی تعلیمات کا مذاق اڑانے کے عمل کا حصہ نہ بنیں، اب یہ ان حضرات کا کام ہے کہ وہ کہاں تک اس اپیل پر عمل کرتے ہیں، ہماری رائے میں مباحثوں میں شرکت نہ کرنا ہی وقت کا تقاضا ہے، اس کے بجائے مسلم امہ کو اسلام کی حقیقی تعلیمات سے روشناس کرانے کے لیے وہ راستہ زیادہ مفید ہے جو جماعت اسلامی ہند نے اختیار کیا ہے اور جس کی تائید جمعیت علمائے ہند نے کی ہے۔

موجودہ دور میں اسلامی تعلیمات سے مسلمانوں کی ناواقفیت کی بڑی وجہ علماء دین کی بے توجہی اور ائمہ وخطباء مساجد کی غفلت شعاری ہے، عام طور پر یہ حضرات اپنی تقریروں میں ان موضوعات پر گفتگو نہیں کرتے جو معاشرتی مسائل میں مسلمانوں کی رہ نمائی کر سکیں، اس کے برعکس ان کا سارا فوکس گھسے پٹے موضوعات پر ہوتا ہے، مدارس کے سالانہ جلسوں میں جو تقریریں سننے میں آتی ہیں اور جن کی روداد یں اردو اخبارات کے صفحات کی زینت بنتی رہتی ہیں، عموماً ان کا موضوع ۱۸۵۷ء کی جدوجہد، تحریک آزادی میں علماء کا کردار، اور مدارس کی ناقابل فراموش حصہ داری رہتا ہے، بلا شبہ یہ موضوع بھی اہمیت رکھتا ہے، مگر صرف یہی موضوع اہمیت نہیں رکھتا، مسلمانوں کی زندگی کے کچھ اور گوشے بھی ہیں جن پر روشنی ڈالنے کی ضرورت ہے، خاص طور پر اصلاحِ معاشرہ کا موضوع بڑا اہم ہے، اس موضوع پر کم ہی کوئی مقرر تقریر کرتا نظر آتا ہے، ائمہ مساجد اور جمعہ کے خطیب بھی رٹی رٹائی تقریروں سے آگے نہیں بڑھتے، دین کے نام پر جلسوں اور کانفرنسوں کی کمی نہیں، مگر لاکھوں، کروڑوں روپیوں کے بجٹ سے ہونے والے ان عظیم الشان جلسوں اور کانفرنسوں سے امت کو کچھ حاصل نہیں ہوتا، خاص طور پر نصف مسلمان یعنی عورتیں تو بالکل ہی محروم رہ جاتی ہیں، غالباً اسی کوتاہی کے پیش نظر جمعیت علمائے ہند نے سال رواں کو اصلاح معاشرہ کے سال کے طور پر منانے کا فیصلہ کیا ہے، اگر ہم سے یہ مجرمانہ کوتاہی سرزد نہ ہوئی ہوتی اور ہم نے ایمان داری کے ساتھ مرد وخواتین تک اسلام کا آفاقی پیغام پہنچانے کی کوشش کی ہوتی تو آج نہ اصلاحِ معاشرہ کا سال منانے کی

ضرورت پیش آتی اور نہ مسلم پرسنل لاء بیداری مہم کے ہفتے منانے پڑتے۔

بہ ہر حال اب جب کہ مسلم امہ ملیؔ تنظیموں، دینی مدرسوں اور ائمہ مساجد کی غفلت شعاری کا نتیجہ بھگت رہی ہے ایسے میں امید کی جو کرن بھی چمکے ہمیں اس کو خوش آمدید کہنا چاہئے ،ضرورت ہے کہ مسلمانوں میں بیداری پیدا کرنے کی یہ مہم ہمہ گیر سطح پر ہو، اور اس میں خواتین تک پہنچنے کی اور ان تک اسلامی تعلیمات پہنچانے کی خاص طور پر کوشش کی جائے، آج ملک میں فسطائی طاقتیں اسی حوالے سے اسلام کو بدنام کرنے کی کوشش کر رہی ہیں، میڈیا کے ذریعے سے مسلسل یہ بتلایا جارہا ہے کہ اسلام صرف مردوں کی بات کرتا ہے، جو بھی حقوق ہیں وہ صرف مردوں کے لیے ہیں، جو بھی آزادی ہے وہ صرف مردوں کو حاصل ہے، اسلام میں عورتوں کی صرف یہ حیثیت ہے کہ وہ گھر میں رہیں، بچے پیدا کریں، انہیں پالیں پوسیں اور دنیا سے رخصت ہو جائیں، نکاح وطلاق سے لے کر خرید وفروخت تک، ملازمت تجارت اور سفر تک میں عورتوں کو کوئی اختیار حاصل نہیں ہے، ایک طرح سے وہ مرد کی غلام اور زندگی کے ہر مرحلے میں اس کی دست نگر اور محتاج ہیں، میڈیا کا یہ پروپیگنڈہ برادران وطن کو اسلام کی طرف سے بدگمانی میں مبتلا کر رہا ہے، ہوسکتا ہے اس کے اثراتِ بد مسلم خواتین کے ذہنوں کو بھی مسموم کردیں، اس سے پہلے کہ یہ صورتِ حال پیدا ہو ہمیں مسلم خواتین تک پہنچنا ہوگا اور انہیں بتلانا ہوگا کہ اسلام نے ان کو کتنی آزادی دی ہے، اور کن کن معاملات میں دی ہے، وہ کتنی خود مختار ہیں اور کتنی محتاج و دست نگر، انہیں بتلانا ہوگا کہ اسلام دنیا کا واحد مذہب ہے جس نے خواتین کو باعزت مقام عطا کیا ہے، اس کو بے پناہ حقوق دیئے ہیں، آج بھی اسلام ہی ان کی عزت و عظمت کا محافظ ہے اور اس کی تعلیمات ہی ان کی سربلندی کی ضامن ہیں، اس سلسلے میں اصولی طور پر یہ بات واضح کرنی ہے کہ اسلام نے انسان کو جو عزت واحترام عطا کیا ہے اس میں مرد و عورت دونوں برابر کے شریک ہیں، اسی طرح اللہ تعالیٰ نے جو احکامات نازل کئے ہیں ان کی پابندی بھی دونوں پر لازم ہے، اور ان احکامات پر عمل کرنے میں آخرت کا جو اجر و ثواب ہے اس میں بھی دونوں برابر ہیں، اس کے لیے قرآن کریم کی یہ آیات ہمارے لیے مشعل راہ

ہیں، ''مؤمن مرد اور مؤمن عورتیں آپس میں ایک دوسرے کے معاون و مددگار ہیں'' (التوبۃ: ۷۱) ''اور عورتوں کے لیے وہی حقوق ہیں جو ان پر مردوں کے حقوق ہیں اچھائی کے ساتھ'' (البقرۃ:۲۲۸) اور جو بھی ایمان کی حالت میں اچھے عمل کرے گا خواہ وہ مرد ہو یا عورت یقیناً ایسے لوگ جنت میں جائیں گے اور کھجور کی گٹھلی کے شگاف کے برابر بھی ان پر ظلم نہ ہوگا، (النساء:۱۲۴) قرآن کریم میں اس طرح کی بے شمار آیات ہیں، اور حدیث کے ذخیرۂ کتب میں اس نوعیت کی سینکڑوں احادیث ہیں ان کو سامنے لانے کی ضرورت ہے تا کہ عورتوں کے تعلق سے اسلام کے خلاف جو پروپیگنڈہ کیا جا رہا ہے اس کا مدلل اور بھر پور جواب دیا جا سکے۔

آج کل اسلام کا نظامِ نکاح و طلاق دشمنوں کے نشانے پر ہے، حالاں کہ یہ آزادی، عدل اور انصاف پر مبنی ایک مستحکم نظام ہے جس میں مرد و عورت دونوں کے حقوق سامنے رکھے گئے ہیں، اس سلسلے میں کہیں بھی جو کوتاہی ہو رہی ہے اس کی ذمہ داری اس حق کو استعمال کرنے والوں پر ہے اسلام پر نہیں ہے، ہم نے گذشتہ ہفتے کے مضمون میں بھی لکھا تھا کہ عورت کو اگر اپنے شوہر سے کوئی ایسی شکایت ہے جس کی بنیاد پر علیحدگی اختیار کی جا سکتی ہے تو اسے خلع کے ذریعے طلاق حاصل کرنے کا پورا پورا حق ہے، اس کے علاوہ بھی عورت کو ایک حق حاصل ہے اور وہ یہ ہے کہ وہ بہ وقت نکاح اپنے نکاح نامے میں ایسی شرائط تحریر کرا سکتی ہے جن پر مرد کے ذریعے عمل نہ کرنے کی صورت میں عورت کو اپنے شوہر کی زوجیت سے علیحدگی اختیار کرنے کا حق حاصل ہو جائے، ہمارے خیال میں دنیا کے کسی بھی مذہب نے عورت کو اتنا بڑا حق نہیں دیا ہے۔ یہ سب حقوق سامنے آنے چاہئیں، طلاق کو بھی اسلام نے اتنا آسان نہیں بنایا کہ جو چاہے جب چاہے طلاق دے دے، اس کا پورا نظام ہے، علماء کو چاہیے کہ وہ مردوں کو عورتوں کے حقوق اور مردوں کی ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ یہ بھی بتلائیں کہ اگر میاں بیوی میں نباہ نہ ہو تو علیحدگی کے لیے کیا شکل اختیار کی جائے، ان دنوں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے کہ طلاق کا قانون عورت کے حق میں انتہائی غیر مفید ہے، بلکہ ایک طرح سے یہ قانون ظالمانہ ہے، مردوں کو جو حق طلاق حاصل ہے اس کی تلوار ہر وقت عورت کی گردن پر لٹکتی رہتی ہے، یہ

صورتِ حال اس لیے پیدا ہوئی ہے کہ مسلمانوں کو اس حق کی مصلحت وحکمت اور اس حق کے استعمال کرنے کے موقع ومحل اور طریقۂ کار کا علم ہی نہیں ہے، اکثر جگہوں پر جاہل نکاح خواں نکاح پڑھا کر چلتے بنتے ہیں، یہ اہم کام ہے، اہل علم حضرات کو یہ ذمہ داری سنبھالنی ہوگی اور بہ وقت نکاح مرد وزن کو اسلام کے نظام نکاح وطلاق کے محاسن اور اس کی خوبیوں سے روشناس کرانا ہوگا، امید ہے فسطائی طاقتوں نے امت مسلمہ کو جو چیلنج دیا ہے اس کا جواب ہم ان کی زبان میں دینے کے بجائے اسلامی تعلیمات کو عام کر کے دیں گے۔

مسلم پرسنل لاء بورڈ کا مقصد:

اس تحریک کا مقصد ان حقوق کا تحفظ ہے جن کی ضمانت آئین ہند میں دی گئی ہے۔ فی الحال بورڈ نے اپنی تحریک کو چار بنیادی اور اہم امور تک محدود رکھا ہے۔ ان میں سے پہلا معاملہ ڈائریکٹ ٹیکسز کوڈ کا ہے مگر یہ بات نہایت افسوس ناک ہے کہ گزشتہ 60 سالوں سے رائج انکم ٹیکس قانون میں تبدیلی لائی جارہی ہے۔ وزارتِ خزانہ نے ایک مفصل مسودہ قانون مرتب کیا ہے جو انکم ٹیکس کے موجودہ قانون کی جگہ ملک میں نافذ کیا جائے گا۔ لیکن حکومتوں کے تغافل سے یہ قانون وجود میں نہیں آرہا ہے جس کی وجہ سے وقف جائیدادوں پر قبضے ہورہے ہیں۔ ان کو متولیوں اور کرائے داروں اور خود حکومتوں کے ناجائز قبضوں کے ذریعے تباہ وبرباد کیا جارہا ہے۔ حکومت نے ایک بل پارلیمنٹ سے منظور تو کرایا ہے اور اب یہ راجیہ سبھا کی سلیکٹ کمیٹی کے زیر غور ہے۔

مسلم پرسنل لاء بورڈ نے اپنی ترمیمات تحریری طور پیش کر دی ہیں۔ امید ہے کہ کوئی موثر اور نفع بخش قانون بن سکے گا جو اوقاف کی حفاظت، غلط قبضوں کے خاتمے اور اوقاف کی ترقی کا ذریعہ بنے گا۔

بچوں کے مفت اور لازمی حصولِ تعلیم کے حق کو بڑا انقلابی مانا جارہا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ RTE کے مکمل نفاذ کے بعد نہ مدارس کو زندہ رکھا جاسکتا ہے اور نہ دستورِ ہند میں اقلیتوں کو تعلیمی ادارے بنانے اور چلانے کا بنیادی حق یعنی دفعہ 30 سے عملاً فائدہ اٹھایا جاسکتا

ہے۔ اگر چہ حکومت نے RTE میں کچھ تبدیلیاں کی ہیں لیکن ابھی تک ان تبدیلیوں کو مکمل قانونی شکل نہیں دی جاسکی ہے اوراس کے لیے پرسنل لاء بورڈ مسلسل جدوجہد کر رہا ہے۔

یو پی میں زرعی جائیدادوں میں عورتوں کو حق وراثت سے محروم رکھنے کا قانون موجود ہے جو سراسر مسلم پرسنل لاء بورڈ سے متصادم ہے۔ بورڈ اس قانون کے خاتمہ کے لیے بھی جدوجہد کر رہا ہے کیوں کہ وراثت میں مرد وعورت کو ان کے شرعی حصہ کے مطابق حصہ دینا ضروری ہے۔ دیوبند کے مسلمان اور سیکولر عوام اس تحریک میں قدم بہ قدم بورڈ کے ساتھ ہیں اوراس کی ہر آواز پر لبیک کہنے کے لیے تیار ہیں۔

عدالتی فیصلے کے بعد

سپریم کورٹ کی پانچ رکنی آئینی بینچ کے تین ارکان نے ایک مجلس میں تین طلاق کو غیر آئینی قرار دیتے ہوئے اس پر چھ ماہ کے لئے پابندی لگادی ہے، اگر چہ دوججوں نے اس فیصلے سے اختلاف بھی کیا ہے، عدالت عظمی نے کہا ہے کہ تین طلاق؛ طلاقِ بدعت ہے، اور اسلام کالازمی حصہ نہیں ہے، یہ صرف ایک روایت ہے، اس کو آئین کے آرٹیکل 25 (بنیادی حقوق سے متعلق قانون) کے تحت تحفظ حاصل نہیں ہے، لہذا اسے ختم کرنا چاہئے، عدالت عظمی نے طلاق ثلاثہ کو خواتین کے حق مساوات سے متصادم قرار دیتے ہوئے اس پر چھ ماہ کے لئے پابندی عائد کردی ہے، اور حکومت کو ہدایت کی ہے کہ وہ طلاق ثلاثہ کو ختم کرنے کے لئے چھ ماہ کے اندر قانون سازی کرے، اگر حکومت چھ ماہ میں یہ قانون نہیں بناتی ہے تو عدالت کی لگائی گئی پابندی چھ ماہ بعد بھی برقرار رہے گی، ایک طرح سے عدالت نے طلاق ثلاثہ کو مستقل طور پر ختم کردیا ہے، اب اگر کوئی شخص اپنی بیوی کو تین طلاق دیتا ہے اور مطلقہ عورت عدالت پہنچ کر، یا خود طلاق دینے والا عدالت میں جاکر یہ اپیل کرتا ہے کہ اس کی تین طلاقوں کو ایک مانا جائے تو اسے عدالت کی تائید حاصل ہوگی۔

عدالت عظمی کے اس فیصلے کو تاریخی کہا جارہا ہے، اس کے تاریخی ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے کیوں کہ ہماری دانست میں یہ پہلا فیصلہ ہے جس پر دونوں فریق خوشی سے بغلیں بجارہے ہیں، وزیراعظم نریندرمودی نے عدالت کے اس فیصلے پر اپنے اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے کہا ہے کہ یہ فیصلہ مسلم خواتین کو مساوات کا حق دے گا اور یہ ان کو بااختیار بنانے کی طرف ایک مضبوط قدم بھی ثابت ہوگا، آل انڈیا مسلم پرسنل لاءبورڈ نے جو اس مقدمے میں بنیادی فریق تھا یہ کہتے ہوئے اس فیصلے کا خیر مقدم کیا ہے کہ اس نے مسلم پرسنل لاء کو تحفظ فراہم کیا ہے، سپریم کورٹ کا یہ فیصلہ واضح کرتا ہے کہ شرعی احکام مسلم پرسنل لاء کا حصہ ہیں اور ان میں ترمیم یا اضافے کا حق کورٹ کو حاصل نہیں ہے، مسلم پرسنل لاءبورڈ کے وکیل مسٹر کپل سبل بھی خوشی سے نہال نظر آرہے ہیں، انہوں نے عدالت میں بحث کے دوران طلاق ثلاثہ کو آستھا

(مذہبی عقیدت) سے جوڑا تھا، عدالت نے آستھا کی یہ عمارت منہدم کردی ہے، اس کے باوجود وکیل صاحب اسے تاریخی فتح سے تعبیر کررہے ہیں، غرض یہ کہ عدالت کا فیصلہ اگر چہ واضح ہے، مگر اس پر تمام فریقوں کے یکساں ردّ عمل نے عجیب وغریب صورت حال پیدا کردی ہے، اتراکھنڈ کے کاشی پور کی مسلم خاتون سائرہ بانو نے کہا ہے کہ آج کا دن تاریخی اہمیت کا حامل ہے، یہی وہ خاتون ہیں جو تین طلاق کے خلاف عدالت پہنچی تھیں، سلمان خورشید، تسلیمہ نسرین اور طارق فتح جیسے لوگ تو خوشی سے بے حال نظر آرہے ہیں، آخر الذکر نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ مولویو! سنبھل جاؤ، اب تعدد ازواج پر بھی پابندی لگنے والی ہے، تعدد ازواج پر پابندی لگے گی یا نہیں، یہ تو وقت بتلائے گا، مگر فی الحال تین طلاق پر تو پابندی لگ چکی ہے، اب ہماری ملّی تنظیمیں طے کریں گی کہ عدالت عالیہ کی طرف سے تین طلاق پر پابندی، حکومت کو قانون سازی کرنے کی ہدایت اور قانون سازی میں ناکام رہنے پر اس پابندی کی طویل مدتی برقراری مسلمانوں کے موقف کی شکست ہے یا فتح؟ ہماری رائے میں تو یہ تاریخی شکست ہے، اور ہم یہ کہہ کر اس پر خوش نہیں ہوسکتے کہ عدالت نے مسلم پرسنل لاء کو فلاں دفعہ کے تحت تحفظ فراہم کیا ہے، پہلی بات تو یہ ہے کہ مسلم پرسنل لا کو اگر چہ قانون کی متعدد دفعات کے تحت تحفظ حاصل ہے، اس کے باوجود وقتاً فوقتاً مسلم پرسنل لا کے تحت آنے والے معاملات سے چھیڑ چھاڑ کی جاتی رہی ہے، ۱۹۷۲ء کا شاہ بانو کیس اس کی مثال ہے، جب ایک عدالت نے مطلقہ عورت کو عدت گزرنے کے بعد بھی نان نفقہ کا مستحق قرار دیتے ہوئے مسلم پرسنل لا کے خلاف فیصلہ دیا تھا، اس وقت کی مضبوط مسلم قیادت نے اس فیصلے کی مزاحمت کی، اور اس وقت کی کانگریسی حکومت نے جس کی قیادت راجیو گاندھی کررہے تھے، پارلیمنٹ کے ذریعے ایک قانون لاکر عدالت کے فیصلے کو کالعدم قرار دیا، اس وقت سے مختلف عدالتیں دستور میں دی گئی تحفظ کی ضمانت کے باوجود مسلم پرسنل لا کے خلاف فیصلے کرتی رہتی ہیں، حالیہ فیصلہ کو بھی اسی تناظر میں دیکھنے کی ضرورت ہے، ایک طرف تو عدالت عالیہ دفعہ 25 کی بات کرتی ہے اور یہ مانتی ہے کہ اس دفعہ کے تحت مسلم پرسنل لا کو تحفظ ملا ہوا ہے، وہ یہ بھی مانتی ہے کہ اس دفعہ کی

موجودگی میں عدالت کوئی فیصلہ نہیں کرسکتی، دوسری طرف وہ تین طلاق کو یہ کہہ کر ختم بھی کر دیتی ہے کہ یہ مسلم پرسنل لا کا حصہ نہیں ہے، یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا واقعی تین طلاق مسلم پرسنل لا کا حصہ نہیں ہے؟ اور یہ صرف عقیدت اور روایت سے مربوط ہے، اگر جواب اثبات میں ہے تب تو کچھ کہنے کی گنجائش ہی نہیں ہے، اور اگر جواب نفی میں ہے تو ماننا پڑے گا کہ عدالت نے تحفظ کے اعتراف کے باوجود مسلم پرسنل لا کے خلاف فیصلہ دیا ہے، یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ہمارے وکلا عدالت کو یہ باور نہ کراپائے ہوں کہ تین طلاق شریعت کا حصہ ہے، جہاں تک ہمارا تعلق ہے ہم اب تک یہی سمجھتے آئے ہیں، اور یہی پڑھتے لکھتے رہے ہیں کہ تین طلاق؛ تین ہی ہیں اور جب کسی عورت کو تین طلاقیں دی جاتی ہیں تو تین ہی پڑتی ہیں، جس کے بعد وہ عورت اپنے شوہر کے لئے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے حرام ہوجاتی ہے، چاروں ائمہ مجتہدین میں سے کوئی بھی اس کے ایک ہونے کا قائل نہیں ہیں، اگر چہ اس کو فقہاء نے طلاق بدعت کہا ہے، اس کو گناہ بھی کہا ہے، تین طلاق دینے والے کو ناپسندیدگی کی نظر سے بھی دیکھا گیا ہے بل کہ اس کے لئے تعزیری سزاؤں تک کی تجویزیں بھی فقہ کی کتابوں میں ملتی ہیں، مگر اس کے اثرات اور نفاذ سے کسی نے بھی انکار نہیں کیا ہے، ہم تو یہی سمجھتے ہیں کہ جس طرح ایک طلاق، دو طلاق شریعت کے احکام کا حصہ ہیں اسی طرح تین طلاق بھی ہیں، اس صورت میں یہ کہنا پڑے گا کہ عدالت عالیہ کا فیصلہ دین وشریعت میں کھلی مداخلت ہے، یہ کہنا کسی بھی طرح صحیح نہیں ہے کہ عدالت نے مسلم پرسنل لا کو تحفظ فراہم کیا ہے، بلاشبہ معزز ججوں نے تحفظ کی بات ضرور کہی ہے لیکن اپنے فیصلے سے یہ بھی ثابت کردیا ہے کہ مسلم پرسنل لا محفوظ نہیں ہے، کسی بھی وقت عدالتیں اس کو نشانہ بنا سکتی ہیں، اور عدالتوں کی ہدایت پر یا از خود حکومت تحفظ کے اس دائرے کو نقصان پہنچا سکتی ہے، عدالت عالیہ نے طلاق ثلاثہ کو مسلم خواتین کے حق مساوات کی خلاف ورزی بتلایا ہے، وزیر اعظم بھی کہہ رہے ہیں کہ اس فیصلے سے مسلم خواتین کو برابری کا حق حاصل ہوگا، یہ حق مساوات اتنا محدود نہیں ہے کہ اسے تین طلاق میں محصور کردیا جائے، ایک طلاق اور دو طلاق کا حق بھی اسلام میں مردوں کو حاصل ہے، اس صورت میں کیا

عدالتیں اور حکومتیں مسلم مردوں کو ان کے حق سے محروم کر کے عورتوں کو ان کے برابر لا کر کھڑا کریں گی؟ یہ سوال بڑا اہم ہے۔

یہ کہنا سادہ لوحی سے زیادہ کچھ نہیں کہ عدالتی فیصلہ آنے کے بعد حکومت مسلم پرسنل لا کے خلاف قانون سازی نہیں کر سکتی، بنیادی حقوق مطلق نہیں ہیں چناں چہ عوامی مفادات کے تحفظ کی خاطر ان پر مناسب پابندیاں بھی عائد کی جا سکتی ہیں، ۱۹۷۳ء میں کیشوانند بھارتی بمقابلہ کیرالا حکومت کے معاملے میں عدالت عظمیٰ نے ۱۹۶۷ء کے اپنے سابقہ فیصلے کو منسوخ کرتے ہوئے یہ فیصلہ کیا تھا کہ بنیادی حقوق میں ترمیم کی جا سکتی ہے، اگر اس طرح کی کسی ترمیم سے آئین کے بنیادی ڈھانچے کی خلاف ورزی ہوتی ہو تو عدالتی نظر ثانی کے تحت پارلیمنٹ کے ہر ایوان میں دو تہائی اکثریت سے منظور آئینی ترمیم کے ذریعہ بنیادی حقوق میں اضافہ یا حذف کیا جا سکتا ہے یا نظر ثانی کی جا سکتی ہے، ہنگامی صورت حال نافذ ہونے کی صورت میں دفعہ ۲۰ اور ۲۱ کو چھوڑ کر دیگر بنیادی حقوق میں سے کسی کو بھی صدر جمہوریہ کے حکم سے عارضی طور پر معطل کیا جا سکتا ہے۔ نیز ایمرجنسی کے دوران میں صدر جمہوریہ کے حکم سے آئینی چارہ جوئی کے حقوق کو بھی معطل کیا جا سکتا ہے، نتیجتاً دفعہ ۲۰ اور ۲۱ کے سوا کسی بھی بنیادی حق کے نفاذ کے لیے شہریوں کی عدالت عظمیٰ میں جانے پر پابندی عائد ہو جاتی ہے۔

اطمینان کی بات یہ ہے کہ ہماری تمام تنظیموں اور اداروں نے موجودہ صورت حال میں بھی آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کا ساتھ دینے کی بات کہی ہے، ۱۰/ستمبر ۲۰۱۷ء میں بھوپال میں بورڈ کی مجلس عاملہ کا اجلاس ہونے والا ہے، اس میں فیصلے کے مندرجات اور مضمرات پر غور کیا جائے گا، اور آئندہ لائحہ عمل طے کیا جائے گا، ہمیں امید ہے کہ بورڈ حقیقت پسندی سے کام لے گا، اور اس وقت پوری ملت جس مایوسی میں مبتلا ہوئی ہے اسے اس مایوسی سے نکالنے کی کوشش کرے گا، جمعیت علمائے ہند کے صدر مولانا سیّد ارشد مدنی نے فیصلہ آنے کے فوراً بعد اگرچہ اس پر اطمینان و مسرت کا اظہار کیا تھا لیکن شام ہوتے ہوتے ان کا جو بیان آیا اس نے ملت کے زخموں پر مرہم رکھنے کی کوشش کی ہے، اور یہ واحد بیان ہے جس نے مایوسی کے

اندھیروں میں امیدوں کے دیئے روشن کئے ہیں، مولانا نے سپریم کورٹ کے فیصلے پر افسوس کا اظہار کرتے ہوئے اسے شریعت کے خلاف قرار دیا ہے، اور مسلمانوں سے اپیل کی ہے کہ وہ ہرگز مایوس نہ ہوں اور صبر کے ساتھ رہیں، اسلام کو اپنی زندگی میں اتارنے کی کوشش کریں، مولانا نے کہا ہے کہ یہ معاملہ صرف تین طلاق کا نہیں ہے بل کہ یہ یکساں سول کوڈ تھوپنے کے ایجنڈے کا ایک حصہ ہے، آنے والا وقت مسلمانوں کے لئے اور بھی مسائل کو جنم دے سکتا ہے جس کے لئے انہیں ذہنی طور پر تیار رہنے کی ضرورت ہے، مولانا نے کہا ہے کہ فیصلے کا سنجیدگی سے تجزیہ اور مطالعہ کرنے کے بعد آئندہ کے لئے کوئی حکمت عمل تیار کی جائے گی، قانونی ماہرین سے صلاح ومشورہ کے بعد فیصلے کے خلاف اپیل کے بارے میں فیصلہ کیا جائے گا، ہم مولانا کے بیان کی حرف بہ حرف تائید کرتے ہیں کہ انہوں نے ملت کے آزردہ دلوں کی ترجمانی کا حق ادا کردیا ہے اور اعتراف کرتے ہیں کہ مولانا سیّد ارشد مدنی وہ واحد ملیّ قائد ہیں جنہوں نے عدالتی فیصلے کو حقیقت پسندی کے تناظر میں دیکھنے کی کوشش کی ہے۔

تین طلاق پر عدالتی فیصلے کے تعلق سے کچھ معروضات

آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ مسلمانوں کا قیمتی اثاثہ بھی ہے اور ان کی آخری امید بھی، اس کی کوئی آواز آج تک صدا بہ صحرا ثابت نہیں ہوئی، مسلمان اس کی ایک اپیل پر دوڑے چلے آتے ہیں، گزشتہ دنوں تین طلاق کے معاملے میں اس نے مسلم خواتین کے دستخطوں کی مہم چھیڑی، کروڑوں کی تعداد میں مسلم خواتین نے اس کے جاری کردہ محضرنامے پر دستخط کر دیئے، ملی تاریخ میں یہ واقعہ ایک ریکارڈ کی حیثیت رکھتا ہے، بورڈ کا جب بھی کہیں کوئی جلسہ یا میٹنگ ہوتی ہے مسلمانوں کی نگاہیں اور دل ادھر ہی متوجہ ہو جاتے ہیں، حال ہی میں تین طلاق پر عدالتی فیصلے سے پیدا شدہ صورت حال پر غور کرنے کے لیے بھوپال میں مجلس عاملہ کی میٹنگ منعقد کی گئی، مسلمانانِ ہند شدت کے ساتھ اس میٹنگ کے منتظر تھے اور اس سے کسی بڑے فیصلے کی امید لگائے بیٹھے تھے، عام تأثر یہ ہے کہ مجلس عاملہ نے اس معاملے کو ٹالنے کی کوشش کی ہے، ہماری ملی تنظیموں اور اداروں کی یہ روایت رہی ہے کہ جب وہ کسی مسئلے کو ٹالنا چاہتے ہیں تو اسے کسی کمیٹی کے حوالے کر دیتے ہیں، مجلس عاملہ نے بھی ایک کمیٹی بنا دی ہے جو فیصلے کا تجزیہ کرے گی اور اپنی رپورٹ بورڈ کو دے گی، اس عام تأثر کے برخلاف راقم کی رائے یہ ہے کہ مجلس عاملہ نے صحیح فیصلہ کیا ہے کیوں کہ سب سے پہلے تو عدالتی فیصلے کا جائزہ لینے کی ضرورت ہے، ابھی تک تو اس فیصلے کو جو تین سو پچانوے صفحات پر مشتمل ہے صحیح طریقے سے پڑھا بھی نہیں گیا، سمجھنا تو دور کی بات ہے، جس وقت یہ فیصلہ آیا تھا اس وقت بعض لوگوں نے خوشی سے بغلیں بجائی تھیں، بورڈ کے وکیل نے تو اسے تاریخی فتح تک قرار دے دیا تھا، ہم حیران تھے یا اللہ! یہ کیسی فتح ہے، ہم تین طلاق کو باقی رکھنے کا مقدمہ لڑ رہے تھے یا ختم کرنے کا، فیصلے سے تو تین طلاق ختم ہوتی نظر آ رہی ہے، بی جے پی خوشی سے پھولے نہیں سما رہی ہے، وزیر اعظم تک نے ٹوئیٹ کر کے اس دن کو مسلم خواتین کی آزادی کا دن قرار دیا ہے، پھر یہ ہماری فتح ہے یا ان کی؟ عدالت نے چھ ماہ کے لیے تین طلاق پر پابندی لگا دی ہے، اور حکومت سے کہا ہے کہ وہ قانون سازی کر کے ہمیشہ کے لیے اس کا قصہ ہی پاک کر دے،

عدالت نے یہ بھی کہہ دیا ہے کہ اگر حکومت چھ ماہ کے اندر کوئی قانون نہیں بناتی تو یہ پابندی چھ ماہ کے بعد بھی برقرار رہے گی، گویا مدت کی بھی کوئی تحدید نہیں ہے، اب قانون سازی کی بھی ضرورت نہیں، حکومت بھی اپنی جگہ مطمئن کہ پابندی تو لگی ہوئی ہے، پہلے دن تو ہمارے بعض بزرگوں نے بھی فیصلے کا خیر مقدم کیا تھا لیکن جلدی ہی انہیں احساس ہوگیا کہ فیصلہ تو مایوس کن ہے، ایک بات جس پر بعض لوگ زیادہ اچھل کود کر رہے تھے وہ یہ تھی کہ عدالت نے یہ مانا ہے کہ دستور کی دفعہ 25 کے تحت مسلم پرسنل لاء کو تحفظ حاصل ہے، لہٰذا اس میں کسی طرح کی مداخلت نہیں ہوسکتی، اوّل تو یہ رائے پانچ ججوں میں سے دو؛ جسٹس کھیر اور جسٹس عبدالنذیر کی ہے، باقی تین ججوں نے ایسی کوئی بات نہیں کہی، پھر یہ بات سب جانتے ہیں کہ پارلیمنٹ کے دونوں ایوان اگر چاہیں تو وہ کسی قانون میں تبدیلی بھی کر سکتے ہیں، اس کو منسوخ بھی کر سکتے ہیں اور اس کی جگہ کوئی دوسرا قانون بھی لا سکتے ہیں، ججوں نے اسی پسِ منظر میں حکومت کو قانون سازی کی ہدایت دی ہے، یہاں یہ بتلانا بھی ضروری ہے کہ ہمارے قابل وکیل نے ہی معزز ججوں کو یہ مشورہ دیا ہے کہ وہ یہ معاملہ حکومت کو بھیجیں، چناں چہ جسٹس نریمن اور جسٹس للت نے اپنے فیصلے میں لکھا ہے کہ مسلم پرسنل لاء بورڈ کے وکیل نے بامبے ہائی کورٹ کے فیصلے کو بطور نظیر پیش کرتے ہوئے کہا کہ پرسنل لاء دفعہ 25 کی شق (۲) کے تحت بنیادی حقوق کے دائرے میں آتا ہے، عدالت اس کو ختم نہیں کر سکتی کیوں کہ یہ اس کے دائرۂ اختیار سے باہر ہے، وکیل نے عدالت کو بتلایا کہ اس شق میں ترمیم یا اصلاح کا حق صرف قانون ساز اسمبلی کو ہے، عدالت کو چاہئے کہ وہ تمام فریقوں کو وہیں بھیجے، چناں چہ معزز ججوں نے قابل وکیل کی رائے پر عمل کرتے ہوئے یہ معاملہ حکومت کے حوالے کر دیا۔

ہماری پہلے دن سے یہ رائے ہے اور فیصلے کے جو کچھ حصے اخبارات کے ذریعے ہم تک پہونچے ہیں ان کو دیکھنے کے بعد آج تک ہم اسی رائے پر قائم ہیں کہ سارا کھیل بورڈ کے وکیل کا بگاڑا ہوا ہے، انھوں نے بڑی کمزور پیروی کی ہے، دلائل کے نام پر ان کے پاس کچھ تھا ہی نہیں، وہ ججوں کو بہت سے امور میں مطمئن نہ کر سکے، نہ انھیں سمجھا پائے اور نہ ان کے کسی

سوال کا تسلی بخش جواب دے سکے، نتیجہ یہی نکلنا تھا جو نکلا، ہمارا ماتھا تو اسی وقت ٹھنک گیا تھا جس دن انہوں نے آستھا اور عقیدت کا سوال کھڑا کیا تھا، اس وقت ان کے اس عدالتی بیان پر کافی واویلا مچا تھا کیوں کہ کسی چیز کا مرکز عقیدت ہونا الگ بات ہے اور اس کا حقائق سے مربوط ہونا بالکل الگ معاملہ ہے، قارئین کو یاد ہوگا کہ راقم سمیت بہت سے لکھنے والوں نے لکھا تھا کہ عدالتی فیصلے یا کسی بھی طرح کے وہ فیصلے جن میں حق وانصاف کے تقاضے بنیادی حیثیت رکھتے ہوں آستھا اور عقیدت کی بنیاد پر نہیں ہوتے، بلکہ ان میں حقائق اور شواہد کو پیشِ نظر رکھا جاتا ہے، بابری مسجد کے قضیے میں فریق مخالف کے پاس اس کے علاوہ کوئی دوسری دلیل نہیں ہے کہ وہ جگہ ہندوؤں کی آستھا کا مرکز ہے، مسلمانوں کا یہ پہلے بھی موقف تھا اور آج بھی یہی موقف ہے کہ یہ معاملہ حقِ ملکیت کا ہے، زمین ہماری ہے اور اس کے جائز دستاویزی ثبوت ہمارے پاس موجود ہیں، اس پر جو مسجد تعمیر شدہ موجود تھی وہ جائز طریقے سے بنائی گئی تھی، کئی سو سال تک یہ مسجد غیر متنازعہ رہی، مسلمان ہی اس کے مالک، قابض اور متصرف رہے ہیں، اس صورت میں فیصلہ آستھا پر نہیں حقائق پر ہونا چاہئے، وکیل صاحب کو چاہئے تھا کہ وہ آستھا کے دائرے سے باہر آتے اور عدالت کو تین طلاق کی حقیقت سے واقف کراتے اور یہ بتلاتے کہ تین طلاق شریعت کا حصہ ہے اور اپنے دعوے کو ثابت کرنے کے لیے کچھ شواہد بھی عدالت کے سامنے رکھتے اس صورت میں یہ ممکن تھا کہ عدالت کا فیصلہ کچھ اور ہوتا۔

عدالت کے فیصلے پر غور وخوض کرنے کا سلسلہ دیر ہی سے صحیح شروع ہونے جارہا ہے، اس سلسلے میں بورڈ کے وکیل کی بحثوں کا جائزہ لینے کی ضرورت ہے، مفتی یاسر ندیم نے تین سو پچانوے صفحات پر مشتمل عدالتی فیصلے کا بہ غور مطالعہ کرکے بورڈ کے وکیل کے بیانات اور ان پر ججز کے تبصروں کا تجزیہ کیا ہے، جس کو ان کی فیس بک وال پر دیکھا جاسکتا ہے، ان بحثوں سے ایسا لگتا ہے کہ جس معاملے میں وہ بحث کررہے ہیں اس سے ان کو پوری طرح واقفیت بھی نہیں ہے، کئی جگہ تو ایسا محسوس ہوا کہ وہ جان بوجھ کر عدالت کو اس فیصلے کی طرف لانا چاہتے ہیں، مثلاً جسٹس کھیر اور جسٹس عبدالنذیر لکھتے ہیں: ''پرسنل لاء بورڈ کے وکیل کا کہنا یہ ہے کہ طلاق ثلاثہ

ان امور میں سے ہے جو مذہبی اعتبار سے برے اور قانونی اعتبار سے صحیح ہوتے ہیں، اس پر عدالت نے کہا کہ کسی مذہب میں ایسا نہیں ہوتا کہ کوئی کام گناہ بھی ہو اور مذہبی بھی ہو' اس موقع پر وکیل صاحب کہہ سکتے تھے کہ انسان کے بنائے ہوئے قانون میں بھی اس کی مثالیں موجود ہیں کہ کوئی کام برا ہونے کے باوجود واقع ہو جاتا ہے، مثلاً زنا، چوری، قتل وغیرہ برے کام ہیں، تمام مذاہب میں گناہ ہیں، ہر ملک کے قانون میں جرم ہیں، مگر جب کوئی زنا کرتا ہے زنا واقع ہوتا ہے، چوری کرتا ہے تو چوری ہوتی ہے، قتل کرتا ہے تو قتل ہوتا ہے، طلاق ثلاثہ کی نوعیت بھی ایسی ہی ہے کہ یہ گناہ ہے، غلط ہے، لیکن اور جرائم کی طرح یہ بھی واقع ہوتی ہے، ہمارے وکیل صاحب اس سلسلے میں عدالت کو قائل نہ کر سکے اور نہ کچھ سمجھا پائے، اس کے علاوہ بھی انھوں نے کئی موقعوں پر عدالت کو تسلی بخش جوابات نہیں دیئے، مثال کے طور پر وہ یہ نہیں بتلا سکے کہ طلاق ثلاثہ کا ذکر قرآن میں موجود ہے، عدالت یہ سمجھتی رہی کہ تین طلاق کا ذکر کیوں کہ قرآن میں نہیں ہے اس لیے وہ شریعت کا حصہ بھی نہیں ہے، حالاں کہ عدالت کو بتلایا جا سکتا تھا کہ قرآن کریم میں تین طلاق کا ذکر موجود ہے، اس کے ساتھ ہی عدالت کو یہ بتلانے کی بھی ضرورت تھی کہ اگر کوئی حکم قرآن میں نہیں ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ شرعی حکم نہیں ہے، شریعت صرف قرآنی احکامات کا نام نہیں ہے اور نہ تنہا قرآن کریم شریعت کا مآخذ ہے، اس موقع پر وکیل صاحب کو چاہئے تھا کہ وہ عدالت کو بتلاتے کہ قرآن کے علاوہ بھی شریعت کے تین مآخذ ہیں، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث مبارکہ، اجماعِ امت اور قیاس، عدالت وکیل صاحب کی کمزور اور غیر مدلل بحث کے نتیجے میں یہ کہنے پر مجبور ہوئی کہ حدیث قرآن کی طرح قابل اعتماد نہیں کیوں کہ اس کی تدوین بہت بعد میں ہوئی ہے۔

یہ کہا جا رہا ہے کہ دو ججوں کی رائے ہمارے حق میں ہے، مجھے تو نہیں لگتا کہ ان کی رائے ہمارے حق میں آئی ہے، وہ دونوں طلاق ثلاثہ کو صدیوں سے جاری ایک رواج کی حیثیت سے دیکھتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ رواج کو خصوصاً اگر وہ گناہ ہو عدالت ختم کر سکتی ہے، وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ پرسنل لاء بورڈ کے وکیل نے یہ بات تسلیم کی ہے کہ جدید دور میں طلاق ثلاثہ

کی ضرورت نہیں ہے، ہم پھر اپنے اس سوال کا اعادہ کریں گے کہ بورڈ کے وکیل طلاق ثلاثہ کو باقی رکھنے کی وکالت کرر ہے تھے یا ختم کرنے کی، ان کے اس اعتراف کے بعد کہ جدید دور میں طلاق ثلاثہ کی کوئی ضرورت نہیں ہے مقدمے میں کیا رہ جاتا ہے، اس کمزور پیروی کا جو نتیجہ نکلنا تھا وہ نکلا ہے، اصل میں تو مسلم پرسنل لاء بورڈ کی تشکیل کردہ کمیٹی کو عدالتی فیصلے کا جائزہ لینے کے ساتھ ساتھ یہ دیکھنے کی بھی ضرورت ہے کہ وکیل صاحب نے کیس جیتنے کے لیے لڑا تھا یا ہارنے کے لیے، انہوں نے اس کے لیے پوری طرح تیاری کیوں نہیں کی وہ عدالت کو مطمئن کیوں نہیں کر سکے، عدالت نے جو سوالات ان سے کئے وہ ان کا جواب کیوں نہیں دے سکے، یقیناً بورڈ کی طرف سے ان کے کچھ معاون بھی رہے ہوں گے جو ان کی علمی رہنمائی کرر ہے ہوں گے، ان میں سے کس نے وکیل صاحب کو یہ بات بتلائی کہ مدعیان کی طرف سے پیش کی گئی حدیثوں کو یہ کہہ مسترد کردیا جائے کہ وہ تفسیر ابن کثیر اور یوسف قرضاوی کی کتابوں سے لی گئی ہیں اور یہ دونوں سلفی ہیں اس لیے ان کی پیش کردہ احادیث قابل اعتبار نہیں ہیں، کیا اس طرح کی بات ہم نے خود ہی ججوں کے ذہنوں میں نہیں ڈالی کی بہت سی احادیث اعتبار کے قابل نہیں ہوتیں، یہی وجہ ہے کہ جج حضرات یہ کہنے پر مجبور ہوئے کہ حدیث قرآن کی طرح معتبر نہیں ہے۔

غرض یہ کہ مقدمے کی پیروی میں بڑا جھول تھا، بڑا سقم تھا جس کا خمیازہ مسلمانوں کو بھگتنا پڑا ہے اور آئندہ بھی بھگتنا پڑے گا، آج طلاقِ ثلاثہ ختم ہوئی ہے کل تعدد ازدواج کا معاملہ عدالت میں پیش ہونے جارہے ہے، آہستہ آہستہ یہ عدالتیں اور حکومتیں پورے مسلم پرسنل لاء کو ختم کردیں گی اور مسلمان کچھ بھی نہ کرسکیں گے، تین معزز ججوں نے یہ بات واضح کردی ہے کہ شریعت ایکٹ (مسلم پرسنل لاء) دستور کی تدوین سے پہلے کا ہے اور دستور میں یہ شق موجود ہے کہ پرانے قوانین صرف اسی صورت میں باقی رہے گے کہ ان سے دستور میں دیئے گئے بنیادی حقوق کی خلاف ورزی نہ ہوتی ہو، وہ یہ کہتے ہیں کہ شریعت ایکٹ پر از سرنو غور کرنے کی ضرورت ہے، دستور کا آرٹیکل 25 مذہبی آزادی ضرور دیتا ہے لیکن اس شرط کے ساتھ کہ وہ

صحت، اخلاقیات، مساوات اور دیگر بنیادی حقوق سے متصادم نہ ہو، یہ ہے فیصلے کا اصل نقطہ اور لبِ لباب، اس سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے کہ مسلم پرسنل لاء کے ساتھ کیا ہونے والا ہے، تنہا مساوات کو ہی آڑ بنا کر بہت کچھ کیا جاسکتا ہے، مردوں سے طلاق کا حق بھی چھینا جاسکتا ہے، ایک سے زائد نکاح کو بھی خلاف قانون قرار دیا جاسکتا ہے، عورتوں کو مال وراثت میں برابر کا حصہ دیا جاسکتا ہے، یتیم پوتوں کو بھی وارث بنایا جاسکتا ہے، مساوات میں تو بڑی گنجائش ہے اور اخلاقیات میں تو اس سے بھی زیادہ۔

تین طلاق پر حضرت عمرؓ کا طرزِ عمل؛ امید کی ایک کرن:

ہماری دوٹوک رائے یہ ہے کہ ہم یہ مقدمہ صرف اور صرف اس لیے ہارے ہیں کہ بورڈ کے وکیل نے طلاق ثلاثہ پر شریعت کا موقف صحیح طور پر نہیں رکھا، ویسے تو مسلم پرسنل لا بورڈ کی مجلس عاملہ نے دس ماہرین شریعت اور ماہرین قانون پر مشتمل ایک کمیٹی بنادی ہے جو اس فیصلے کا باریک بینی کے ساتھ جائزہ لے گی اور مستقبل کا لائحۂ عمل بھی طے کرے گی، امید ہے کمیٹی نے اپنا کام شروع کردیا ہوگا اور امروز وفردا میں اس کی رپورٹ بھی تیار ہوجائے گی، عین ممکن ہے عدالتی فیصلے کا جائزہ لینے کے بعد وہ لوگ بھی اسی نتیجے پر پہنچیں جس پر ہم پہنچے ہیں، ہمارا کالم پڑھنے کے بعد بعض دوستوں نے یہ سوال کیا ہے کہ اب مسلم پرسنل لا بورڈ کو کیا کرنا چاہیے؟ حقیقت تو یہ ہے کہ بورڈ میں ایک سے ایک بڑھ کر ارباب فضل وکمال موجود ہیں، ان کی موجودگی میں کچھ مشورہ دینا تو کیا کچھ کہنا بھی چھوٹا منھ بڑی بات ہے، اس موضوع پر ہم نے اپنے کالموں میں جو کچھ لکھا یا جو کچھ لکھ رہے ہیں اس کو اس نظریئے سے نہ دیکھا جائے کہ وہ کوئی رائے مشورہ یا تنقید وتبصرہ ہے بلکہ وہ محض اپنے دردِ دل کا اظہار ہے جس میں ہم اپنے قارئین کو بھی شریک کرلیتے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ سپریم کورٹ کا یہ فیصلہ اپنے نتائج اور عواقب کے اعتبار سے دور رس اثرات کا حامل ہوگا، ایک تو اس فیصلے سے یہ واضح ہوگیا ہے کہ اب عدالتیں مسلم پرسنل لا کے صرف اُن حصوں کو قابلِ اعتناد گردانیں گی جو قرآن کریم سے ثابت ہوں گے، کیوں کہ

سپریم کورٹ کے معزز ججوں نے طلاقِ ثلاثہ کو اسی لیے کالعدم قرار دیا ہے کہ اس کا ذکر قرآن میں نہیں ہے، حدیث کے متعلق ان کا یہ تبصرہ سامنے آچکا ہے کہ وہ بعد میں مدوّن ہوئی، اس لیے اس کا کوئی اعتبار نہیں، اجماع اور قیاس کا ذکر تو عدالت میں آیا ہی نہیں، آتا بھی تو عدالت انھیں شریعت کے مآخذ کی حیثیت سے کب تسلیم کرتی جب کہ اس نے حدیث کو بھی قابلِ اعتماد نہیں سمجھا، دوسری بات یہ ہے کہ عدالت اگر چہ آرٹیکل 25 کی شق 2 کو تسلیم کرتی ہے اور یہ مانتی ہے کہ مسلم پرسنل لا مذہبی آزادی کے دائرے میں آتا ہے اور مسلمانوں کو اس پر عمل کرنے کا پورا حق ہے، مگر وہ یہ بھی کہتی ہے کہ آزادی کا حق صرف اسی وقت تک ہے جب تک وہ حق دستور میں دیئے گئے دوسرے بنیادی حقوق؛ مساوات، انسانی صحت اور اخلاقیات سے متصادم نہ ہو، تنہا مساوات کو اگر لیں تو اس کی زد میں بہت کچھ آسکتا ہے، شریعت کی طرف سے مرد کو طلاق کا جو حق ملا ہوا ہے وہ بھی بہ ظاہر حقِ مساوات کے خلاف ہے، عدالت طلاق کو مساوات کے پیمانے پر رکھ کر مرد کے ساتھ ساتھ عورت کو بھی یہ حق دے سکتی ہے، تیسری بات یہ ہے کہ عدالت نے حکومت کو قانون سازی کا مشورہ دے کر آئندہ کے لیے بھی پرسنل لا میں مداخلت کے راستے ہموار کر دئے ہیں کہ حکومتیں جب چاہیں اپنی اکثریت کا فائدہ اٹھا کر پرانے قوانین منسوخ کر دیں اور ان کی جگہ نئے قوانین بنا دیں، اس طرح مسلم پرسنل لا پر عدالت اور حکومت دونوں کی تلواریں مستقل طور پر لٹک گئی ہیں جن سے بچنے کے لیے کوئی مناسب حکمت عملی اختیار کرنی ہوگی۔

عدالتی فیصلے کا اثر مسلم معاشرے پر بھی مرتب ہوگا، عام طور پر ہمارے معاشرے میں جو طلاقیں دی جاتی ہیں وہ جہالت اور کم علمی کی وجہ سے عموماً تین سے کم نہیں دی جاتیں، یہ خیال عام ہے کہ طلاق تین ہی ہوتی ہیں، نئی صورتِ حال میں اگر کوئی شخص اپنی بیوی کو تین طلاق دیتا ہے تو وہ عدالت کی پابندی سے فائدہ اٹھا کر حسبِ سابق اپنی مطلقہ بیوی کے ساتھ رہ سکتا ہے، کیوں کہ اس نے جو طلاقیں دی ہیں وہ از روئے قانون کالعدم ہیں اس لیے واقع ہی نہیں ہوئیں، قانون کی رو سے وہ دونوں میاں بیوی کی طرح رہ سکتے ہیں، اگر چہ شریعت کی

رو سے ایک ساتھ ایک لمحے کے لیے بھی نہیں رہ سکتے، صاف ظاہر ہے کہ یہ لوگ غیر شرعی زندگی گزاریں گے اور گناہ میں مبتلا رہیں گے، اگر عورت شریعت کی پابند ہوگی تب بھی قانون کے سامنے مجبور ہو جائے گی کہ وہ اپنے اس نام نہاد ''شوہر'' کے ساتھ بندھی رہے جس نے اسے تین طلاق کی سولی پر لٹکایا ہے اور جواز روئے شریعت اسے ہمیشہ کے لیے خود سے جدا کر چکا ہے، یہاں یہ صورت بھی پیدا ہوسکتی ہے کہ شوہر شریعت پر عمل کرنا چاہتا ہے مگر مطلقہ بیوی قانون کا سہارا لے کر اس کے ساتھ چپکی رہنا چاہتی ہے، قانون کے خوف سے وہ اسے بیوی بنا کر رکھنے پر مجبور ہوگا اور اس کا نان نفقہ ادا کرتا رہے گا، غرض یہ کہ اس پابندی سے اور آئندہ ہونے والی ممکنہ قانون سازی سے مفاسد کے دروازے پوری طرح کھلنے جارہے ہیں، یہ دروازے کس طرح بند ہوں گے، اس سوال پر سوچنے کی ضرورت ہے، پھر ابھی یہ بھی واضح نہیں ہے کہ عدالت عالیہ نے بہ یک وقت دی گئیں تین طلاقوں کو کالعدم قرار دیا ہے یا تین مختلف مرحلوں میں دی گئیں تین طلاقوں پر بھی اس حکم کا اطلاق ہوگا، کیوں کہ فیصلے میں اس کی کوئی وضاحت نہیں ہے، اس صورت میں تین طلاق کا دروازہ بند ہو چکا ہے خواہ وہ دفعتاً ہوں یا وقفے وقفے سے ہوں۔

اب جب کہ ہم عدالتی فیصلے کے نتائج سے آگاہ ہو چکے ہیں اور مسلم معاشرے پر اس فیصلے سے پڑنے والے ممکنہ اثرات سے بھی ہم بے خبر نہیں رہے ضروری ہے کہ مسلم پرسنل لا بورڈ اور دوسری تمام جماعتیں اور تنظیمیں میدانِ عمل میں آئیں اور مسلمانوں کو اس کے بد اثرات سے آگاہ کرنے کے عمل کو اپنے مقاصد کا حصہ بنائیں، مسلمانوں کو یہ بتلانے کی ضرورت ہے کہ طلاق کو اسلام میں اچھا نہیں سمجھا جاتا، صرف مجبوری کی حالت میں اس کی اجازت دی جاتی ہے، بعض اوقات ایسے حالات پیش آجاتے ہیں کہ زوجین میں نباہ مشکل ہو جاتا ہے، اس صورت میں صرف طلاق ہی دونوں کی گلوخلاصی کا ذریعہ ہوتی ہے، مگر شریعت نے طلاق کی اجازت کے ساتھ ساتھ اس کا ایک طریقۂ کار بھی مقرر کر دیا ہے، مسلمانوں کو بتلانا ہوگا کہ بہ یک وقت تین طلاقیں دینا شریعت کا طریقہ نہیں ہے، یہ عمل ناپسندیدہ ہے، گناہ

ہے، اگر چہ تین طلاقیں واقع ہو جاتی ہیں، اور بیوی ہمیشہ کے لیے جدا ہو جاتی ہے، بدقسمتی سے عدالت نے تین طلاق کو ماننے سے انکار کر دیا ہے اور شاید حکومت بھی اسے کالعدم قرار دے دے، مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ تین طلاقیں واقع نہیں ہوں گی، اور تین طلاق کے بعد بھی دونوں میاں بیوی بنے رہیں گے، شریعت اور عدالت کے فیصلے باہم متضاد ہیں، ایک سچے پکے مسلمان کی حیثیت سے ہمیں شریعت کے فیصلے کی پابندی کرنی ہوگی، تین طلاق کو تین سمجھ کر اس نکاح کو ختم سمجھنا ہوگا، عدالت کے فیصلے سے میاں بیوی بن کر رہنے کی جو گنجائش نکلتی ہے اس سے فائدہ اٹھانا نہ مرد کے لیے جائز ہے اور نہ عورت کے لیے، یہ گنجائش ہمارے دین وایمان کے لیے سم قاتل ہے، اس سے بچنا ہوگا، قاضی اور نکاح خواں حضرات اس سلسلے میں زیادہ مؤثر کردار کر سکتے ہیں، بوقت نکاح انہیں دُولہا دُلہن کو یہ بتلانا چاہئے کہ اسلام میں نکاح کی کیا اہمیت ہے، اور کیا مقصد ہے، ضرورت اور مجبوری کی صورت میں طلاق کا حق کس کو، کب اور کس طرح استعمال کرنا چاہئے اور تین طلاق سے کیوں گریز کرنا چاہئے۔

جو لوگ تین طلاق دیتے ہیں ان کے سلسلے میں عرصے سے یہ بات سامنے آرہی ہے کہ مسلم سماج ان کو سزا دے جس کی صورت یہ ہوسکتی ہے کہ ان کا بائیکاٹ کیا جائے تاکہ دوسروں کو سبق حاصل ہو اور وہ اس جرأتِ بے جا کا مظاہرہ نہ کرسکیں، سچ بات تو یہ ہے کہ بائیکاٹ کی یہ تجویز بہ ظاہر تو بہت خوش کن معلوم ہوتی ہے اور ہم نے اپنے کسی مضمون میں اس کی تحسین بھی کی تھی، مگر درحقیقت وسیع پیمانے پر یہ ناقابلِ عمل بھی ہے، وسیع پیمانے کی قید اس لیے لگائی گئی ہے کہ چھوٹے چھوٹے گاؤں اور دیہات ہی میں جہاں برادریوں کی پنچایتیں سرگرم عمل رہتی ہیں وہاں اس تجویز پر عمل کرنا ممکن بھی ہے اور اسی محدود دائرے میں وہ مؤثر بھی ہوسکتی ہے، قصبوں اور شہروں میں اس پر عمل کرنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے، بائیکاٹ کی اس سزا کے مقابلے میں عوامی بیداری کی مہم سے اچھے نتائج نکل سکتے ہیں، مسلم پرسنل لا بورڈ کو اس سمت میں کام کرنے کی ضرورت ہے، دوسری تنظیموں کو بھی اس سے پیچھے نہیں رہنا چاہئے، مدارس اور مساجد کی شکل میں جو وسیع نیٹ ورک موجود ہے اس سے بڑا کام لیا جاسکتا ہے۔

آخری کوشش کے طور پر بورڈ کو اس تجویز کے ساتھ عدالت میں نظر ثانی کی اپیل کرنی چاہئے یا حکومت کو قانون سازی سے باز رکھنے کی کوشش کرنی چاہئے کہ تین طلاق کو تین طلاق رہنے دیا جائے یعنی اس کو منسوخ نہ کیا جائے اور نہ اس کو کسی قانون کے ذریعے کالعدم قرار دیا جائے، البتہ جو لوگ اپنی بیویوں کو تین طلاقیں دیں اس کو جرم سمجھا جائے اور ان کو اس جرم کی سزا دی جائے، شریعت میں اس کی گنجائش موجود ہے، جیسا کہ اہل علم پر مخفی نہیں ہے کہ خلیفہ ثانی امیر المؤمنین حضرت عمر فاروقؓ ایسے شخص کو جو اپنی بیوی کو تین طلاقیں دیتا کوڑوں کی سزا دیتے تھے۔ (شرح معانی الآثار: ۳۰/۲، مصنف ابن ابی شیبہ حدیث: ۱۷۸۹۱) حضرت عمرؓ کے اس طرزِ عمل سے یہ گنجائش نکلتی ہے کہ حاکمِ وقت کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ اس کو جرم سمجھے اور اس کے مرتکب کو کوئی مناسب سزا دے، پاکستان میں نافذ قوانین کو اسلامی شریعت کے سانچے میں ڈھالنے کے ذمہ دار آئینی ادارے ''اسلامی نظریاتی کونسل'' نے ۲۱/جنوری ۲۰۱۵ء کو ایک وقت میں اکٹھے تین طلاقوں کی حوصلہ شکنی کے لیے اس عمل کو قابلِ سزا جرم قرار دینے کی سفارش کی تھی، اگرچہ کونسل نے قید یا جرمانے کی سزا کا تعین نہیں کیا ہے بلکہ اسے متعلقہ عدالتوں کی صواب دید پر چھوڑ دیا ہے کہ وہ جو چاہیں سزا دیں، مجھے نہیں معلوم کہ پاکستان کی حکومت نے اسلامی نظریاتی کونسل کی اس سفارش پر عمل کیا ہے یا نہیں البتہ اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ تین طلاق ایک جرم ہے اور اس پر سزا دی جاسکتی ہے جو ظاہر ہے حکومت ہی دے سکتی ہے اور وہی اسے نافذ بھی کرسکتی ہے، رہی یہ بات کہ ہندوستان کے غیر مسلم جج بھی تین طلاق جیسے شرعی معاملات میں سزا دینے کے مجاز ہیں یا نہیں اس کا فیصلہ ہمارے مفتیانِ کرام ہی کرسکتے ہیں۔

آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے

شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندیؒ کے ایک شاگرد مولانا مناظر احسن گیلانیؒ لکھتے ہیں: ''حضرت الاستاذؒ نے میرے ایک سوال کے جواب میں فرمایا کہ دیوبند کا مدرسہ ۱۸۵۷ء کی ناکامی کی تلافی کے لیے قائم کیا گیا تھا، تعلیم وتعلم، درس وتدریس جن کا مقصد اور نصب العین ہے میں اُن کی راہ میں مزاحم نہیں ہوں لیکن میں نے اپنے لیے تو اسی راہ کا انتخاب کیا ہے جس کے لیے یہ نظام حضرت الاستاذ مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے قائم کیا تھا، فرائض الٰہیہ جس حد تک بن پڑا ادا کرتا رہا، اب آخری کام رہ گیا ہے جسے آخری حد تک گزار دوں گا (احاطۂ دار العلوم میں بیتے ہوئے دن، ص: ۱۷۱) وہ کام کیا تھا؟ ناکامی کے لفظ سے اس کی پوری وضاحت ہوتی ہے، وہ کام تھا غیر ملکی استعماریت پسندوں یعنی انگریزوں کو ارضِ وطن سے باہر نکال کر ملک کو آزاد کرانا، ۱۸۵۷ء میں یہ تحریک ناکام ہوگئی تھی لیکن اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ اب ہمیشہ کے لیے یہ باب بند کردیا جائے، اہل دانش ناکامی سے تحریک پاتے ہیں اور شکست کے ملبے میں دبے ہوئے تجربات سے فائدہ اٹھا کر کامیابی کی طرف قدم بڑھاتے ہیں، یہی تھا حضرت شیخ الہندؒ کا نصب العین اور اسی کی خاطر انہوں نے اپنی زندگی گزاری، انجمن ثمرۃ التربیت، جمعیت الانصار، نظارۃ المعارف، ریشمی رومال کی تحریک، مولانا عبید اللہ سندھیؒ کی جلاوطنی، ان کے ذریعے جلاوطن حکومت کا قیام، اسارتِ مالٹا، جمعیت علماء کا قیام، خلافت کمیٹی، ترکِ موالات، نمک سازی آندولن، سول نافرمانی تحریک، کوئٹ انڈیا تحریک یہ سب اسی مردِ فعال کی جدوجہد کے بال و پر ہیں، حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ نے اپنی ایک تقریر میں ارشاد فرمایا تھا کہ ''۱۸۵۷ء کے بعد صرف یہی جماعت تھی جس نے آزادی کے تصور کو زندہ رکھا اور بالآخر اس تصور کا سب کو دیوانہ بنا کر چھوڑا، علماء دیوبند نہ صرف تحریک آزادی کی جدوجہد کرنے والوں کی صف اوّل میں رہے ہیں بل کہ اکثر اوقات انہوں نے تحریک آزادی کی قیادت بھی کی ہے اور زیادہ غور سے دیکھا جائے اور انصاف سے کام لیا جائے تو اوّل اوّل یہ خیال انہوں نے ہی دیا، آزادی کے جذبے میں جو

حرارت، طاقت اور عمومیت پیدا ہوئی وہ انہی کی رہین منت تھی، ان میں سے متعدد حضرات نے انگریز حکومت کے خلاف علَمِ جہاد بلند کیا، انگریزی فوجوں سے دوبار جنگ کی، متعدد حضرات ایسے تھے جنہوں نے اپنی زندگی کا خاصہ حصہ جیلوں میں گزارا، حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان کی تحریک آزادی کی تاریخ علماء اور دینی شخصیتوں کی تاریخ کے ساتھ اس طرح گھل مل گئی ہے کہ ایک کو دوسرے کے ساتھ جدا کرنا بہت مشکل ہے۔'' (تاریخ دار العلوم دیوبند: ۱/ ۵۰۹،۵۱۰)

آج کے کالم میں یہ درد الفاظ بن کر اس لیے چھلک آیا کہ اگست کا مہینہ چل رہا ہے، پلاسی کے میدان سے انگریزوں کے خلاف جو مسلح جدو جہد شروع ہوئی تھی وہ سلطان ٹیپوؒ، سید احمد شہیدؒ، شاہ اسماعیل شہیدؒ اور حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ اور ان کے جانباز ساتھیوں کی قیادت میں مختلف میدانوں میں دوسو سال تک لڑی جاتی رہی، کبھی وہ جدو جہد حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کے فتویٰ جہاد کی صورت میں جلوہ گر نظر آئی، اور کبھی دار العلوم دیوبند کے در و دیوار پر قندیل بن کر روشن ہوئی، اور بالآخر اگست ۱۹۴۷ء پر پہنچ کر ختم ہوگئی، دوسو سال کی اس مدت میں لاکھوں علماء اور عوام کے خونِ شہادت سے ارضِ چمن لالہ زار ہوئی، ہم ہر سال اگست کو آزادی کا قومی دن مناتے ہیں، افسوس اس بات کا ہے کہ مسرت اور خوشی کے ان لمحات میں ہم انہیں بھول جاتے ہیں جنہوں نے لیلائے آزادی پر اپنی قیمتی جانوں کا نذرانہ پیش کیا، کسی صدر یا وزیر اعظم کو یہ توفیق نہیں ہوتی کہ وہ جنگ پلاسی کا ذکر کرے، سلطان ٹیپو شہیدؒ کو خراجِ عقیدت پیش کرے، سیدینؒ کی تحریک کا حوالہ دے، شاملی کے میدان میں خون کا دریا بہانے والوں کا ذکرِ خیر کرے، ۱۸۵۷ء کی جنگ میں شہید ہونے والوں کی یاد میں دو چار آنسو بہالے، دوسو سال کی یہ طویل جدو جہد داستانِ پارینہ بنتی جارہی ہے، دار العلوم دیوبند کی شکل میں مسلمانوں کی جدو جہد آزادی کا روشن مینار اور عظیم یادگار دیوبند میں قائم ہے، عوام اور حکومتوں کو چاہیے تھا کہ وہ اس یادگار پر ہر برس محبتوں اور عقیدتوں کے پھول نچھاور کرتیں کہ آج اقتدار اور اختیار کے جس نشے میں وہ بدمست ہیں اسی ادارے کے علماء کی جدو جہد کا رہین منت ہے، مگر افسوس

حکومتیں عقیدت اور محبت کا مظاہرہ تو کیا کرتیں الٹا وہ اس کے روشن کردار پر تہمتوں کے داغ لگانے میں زیادہ دلچسپی رکھتی ہیں۔

یوم آزادی سے ٹھیک ایک ہفتہ قبل دیو بند میں جس طرح دہشت گردی کے نام پر بے گناہ اور معصوم طلبہ مدارس کو ہراساں کیا گیا وہ آزاد ہندوستان کی حکومتوں کی بدنیتی کو اچھی طرح واضح کرتا ہے، اس سے پہلے بھی دیو بند پر یہ الزامات لگتے رہے ہیں کہ یہاں دہشت گردی پروان چڑھتی ہے، حالاں کہ الزام لگانے والے آج تک کوئی ایک ثبوت بھی پیش نہ کر سکے، سابق وزیر اعظم اٹل بہاری واجپئی کی حکومت میں وزیر داخلہ کی حیثیت سے لال کرشن اڈوانی نے صاف لفظوں میں یہ اعتراف کیا تھا کہ مدارسِ اسلامیہ کے خلاف دہشت گردی کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔

اس کے باوجود سرکاری ایجنسیوں کا رُخ دیو بند کی طرف رہتا ہے اینٹی ٹیررسٹ اسکواڈ کے مسلح دستوں نے سہارنپور پولیس کے ساتھ مل کر دیو بند سے تین اور رجال آباد سے دو طالب علموں کو گرفتار کیا، ان پر الزام تھا کہ وہ دہشت گردوں کے رابطے میں ہیں، بتلایا جاتا ہے کہ ان طلبہ سے سخت پوچھ گچھ کی گئی، مگر تفتیش کرنے والوں کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا، مجبوراً ان پانچوں طلبہ کو چوبیس گھنٹے حراست میں رکھنے کے بعد چھوڑ دیا گیا، عبد اللہ نامی جس بنگلہ دیشی کو دیو بند کے قریب ایک گاؤں سے گرفتار کیا گیا ہے اس کے بارے میں عدالت فیصلہ کرے گی کہ وہ فراڈی ہے یا آتنک وادی، چوبیس گھنٹے کے اس ڈرامے میں اے ٹی ایس نے گرفتار شدگان کو کلین چٹ دی مگر ہمارے ملک کے نیوز چینلوں نے اپنا تمام وقت طلبہ مدارس کو دہشت گرد ثابت کرنے میں لگا دیا، ہندی اخبارات بھی کب پیچھے رہتے؟ انہوں نے صفحے کے صفحے یہ ثابت کرنے کے لیے سیاہ کیے کہ دیو بند میں دہشت گردی فروغ پا رہی ہے، حکومتوں کا رُخ، سرکاری ایجنسیوں کا کردار اور میڈیا کا رویہ بہت سے سوال پیدا کرتا ہے، ہم ہندوستانی مسلمانوں کو ٹھنڈے دل کے ساتھ ان کا جواب تلاش کرنا ہے، آخر کب تک ملت کے معصوم نوجوان دہشت گردی کے الزام میں تختۂ مشق بنتے رہیں گے، یہ تو ان طلبہ کی خوش قسمتی تھی کہ وہ

اے ٹی ایس کے چنگل سے چوبیس گھنٹے کے بعد باعزت باہر نکل آئے، کتنے ہی نوجوان ناکردہ گناہوں کی سزا کاٹتے کاٹتے بڑھاپے کی دہلیز پر قدم رکھ چکے ہیں، کچھ جیلوں میں آج بھی بند ہیں اور کچھ عدالتوں کے ذریعے باعزت بری کیے جا چکے ہیں، مولانا سیّد ارشد مدنی کے علاوہ کسی قائد ملت کو حکومت سے یہ سوال کرنے کی جرأت نہیں ہوئی کہ آخر یہ سلسلہ کب تلک چلے گا؟ انہوں نے حکومت سے اس کا جواب بھی مانگا ہے کہ ان طلبہ کو گرفتار کرنے سے پہلے تحقیق کیوں نہیں کی گئی؟ محض شک کی بنیاد پر اتنا بڑا اقدام کیوں اٹھایا گیا، اس کا ذمہ دار کون ہے؟ ان طلبہ کی گرفتاری کی خبر جیسے ہی عام ہوئی ہر شخص کی زبان پر ان کی بے گناہی کا چرچا تھا، مگر کسی میں یہ جرأت نہ تھی کہ وہ ان گرفتاریوں کے خلاف آواز اٹھاتا، حکومتوں سے فریاد کرتا یا عدالتوں کے دروازے کھٹکھٹاتا، زیادہ تر مدرسے تو تمام دن یہ شکر ادا کرتے رہے کہ گرفتار ہونے والوں میں ان کے مدرسے کا کوئی طالب علم نہیں تھا، بے حسی اور بزدلی کے اس تناظر میں یہ یقین ہی نہیں آتا کہ ہم اس بوڑھے شیخ الہندؒ کی اولاد ہیں جس نے مالٹا کی قید قبول کی مگر انگریزوں کے سامنے جھکنا گوارا نہیں کیا، رہا ہونے کے بعد بھی اس نے جب کہ وہ مشت استخواں بن چکا تھا اور ضعیفی نے اس کے جسم کی ساری توانائی چھین لی تھی، اس کی جرأت و شجاعت اور ہمت کا عالم وہی تھا جب وہ دیوبند سے حجاز کے لیے رخت سفر باندھ رہا تھا بل کہ واپسی کے بعد اس کی جوشیلی تقریریں اور تحریریں بتلاتی ہیں کہ اسارتِ مالٹا سے پہلے انگریزوں سے نفرت کی جو آگ اس کے سینے میں دبی ہوئی چنگاری بن کر سلگ رہی تھی اسارت مالٹا سے واپسی کے بعد وہ شعلہ جوالہ بن کر استعماریت کے خرمن کو خاکستر کرنے کے لیے بے قرار نظر آئی، کیا واقعی ہم اسی بہادر شیخ الہندؒ کے بیٹے ہیں؟ یوم آزادی کے اس پُرمسرت ماحول میں اور معصوم طلبہ کی گرفتاریوں کے اُداس پس منظر میں کچھ ایسا ہی درد ہے جو آج چھلک کر لفظوں میں ڈھل گیا ہے۔

کچھ بات ہے کہ ہستی مٹتی نہیں ہماری

ڈاکٹر علامہ محمد اقبالؒ کے جس مصرع کو آج کے مضمون کا سرنامہ بنایا گیا ہے وہ ان کی شاہ کار تخلیق: ترانۂ ہندی کے آٹھویں شعر کا پہلا مصرع ہے، آج کے کالم میں اس ترانہ کا ذکر اس لیے آیا کہ یہ مہینہ اگست کا ہے، اور اس مہینہ میں ہمارا ملک آزادی کا جشن مناتا ہے جو ہمیں دوسو سال کی طویل جدو جہد کے بعد ۱۹۴۷ء میں نصیب ہوئی، بہت سے لوگ آج بھی آزادی کے دن کی تقریبات میں یہ ترانہ گاتے ہیں، اس کا ہر لفظ اتنا حسین وخوب صورت ہے جیسے آسمان پر ستاروں کے موتی ٹکے ہوں، یا زمین پر پھولوں کے دستے سجے ہوں، اور بامعنی اتنا کہ آزادی کے سارے ترانے اس کی معنویت کے سامنے ہیچ ہیں، چاہیے تو یہ تھا کہ یہی ترانہ ملک کا قومی ترانہ قرار پاتا، اس کے اشعار میں جو نغمگی ہے، اس کی تراکیب میں جو دِل کشی ہے اور اس کے لفظوں میں جو کھنکھناہٹ ہے وہ کسی دوسرے ترانے میں نہیں ملتی، مگر برا ہو تعصب کا کہ یہ ترانہ اس لیے انتخاب کے معیار پر پورا نہیں اترا کہ اس کی زبان اُردو ہے جس کو مسلمانوں کی زبان کہا جاتا ہے، اور اس کا تخلیق کار ایک مسلمان ہے، پھر مسلمان بھی وہ جو نام کا ہی مسلمان نہیں بل کہ اسلام اس کی روح کے اندر تک اترا ہوا ہے اور اس کی رگ وریشے میں بسا ہوا ہے، جس کا ہر شعر ملت اسلامیہ کے زوال کا نوحہ اور اس کے جمود کا ماتم ہے، جس کی شاعری نہ الفاظ کی تک بندی ہے اور نہ زلف ولب رخسار کی بے مقصد داستان، بل کہ اس میں شاعر کے دل کا سوز وگداز فکر وخیال کی نیرنگی سے جلا پا کر اشعار کے قالب میں ڈھلتا ہے، بھلا ایسے اسلامی شاعر کا لکھا ہوا ترانہ آزاد بھارت کا قومی ترانہ کیسے بن سکتا تھا؟ ٹھیک ہے اس نے اپنی مشہور نظموں، ہمالہ، پرندے کی فریاد، صدائے درد، تصویر درد، ترانۂ ہندی، نیا شوالہ جیسی نظمیں پیش کر کے حب الوطنی اور قومی یک جہتی کے تصور کو عام کیا ہے، یہ بھی صحیح ہے کہ اس نے شری رام کو اِمام ہند کہہ کر انہیں اپنی عقیدت کا نذرانہ پیش کیا ہے، مگر وہ شکوہ اور جوابِ شکوہ کا بھی خالق ہے، اس کے سینہ میں صقلیہ کے مجاہدین کا درد بھی پنہاں ہے، وہ اندلس کے زوال سے بھی افسردہ نظر آتا ہے، وہ سقوطِ خلافت عثمانیہ پر بھی آنسو بہاتا ہے، پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ اس شاعر کا لکھا ہوا ترانہ قومی ترانہ بن جائے، مگر جادو وہ جو سر چڑھ کر بولے، سابق وزیر اعظم

ڈاکٹر من موہن سنگھ نے حامد انصاری کو پارلیمنٹ کے ایوانِ بالا سے رخصت کرتے ہوئے اس ترانہ کے دو شعر پڑھ دیئے اور پورا ایوان تالیوں کی کھڑکھڑاہٹ سے گونج اٹھا، اس سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اقبال کی شاعری کا یہ پہلو جسے ہم حب الوطنی اور قومی یک جہتی سے تعبیر کر سکتے ہیں ہمارے احساسات میں آج بھی زندہ ہے۔

بھارت کے نائب صدر کے عہدہ سے حامد انصاری صاحب کی سبک دوشی کا ذکر ہوا اور ان کے آخری انٹرویو کا ذکر نہ ہو یہ ممکن ہی نہیں ہے، انٹرویو بھی ایسا جس نے اگر چہ سچائیوں کو بے نقاب کیا ہے مگر کچھ دیش بھکتوں کو آتش زیر پا بھی کر دیا ہے، مسٹر حامد انصاری نے اپنے ایک انٹرویو میں ملک کے حالات پر تفصیلی روشنی ڈالتے ہوئے کہا تھا کہ ملک کے مسلمانوں میں بے چینی پائی جاتی ہے، ان میں عدم تحفظ کا احساس نمایاں ہے، قبولیت کا ماحول خطرہ میں ہے، شہریوں کی ہندوستانیت پر سوال اٹھایا جا رہا ہے، بھیڑ کی طرف سے مار مار کر قتل کر دینے کے واقعات سے پتہ چلتا ہے کہ بھارت کی اقدار کمزور پڑتی جا رہی ہیں، قانون نافذ کرنے والے افسران کی اہلیت متاثر ہو رہی ہے، مسٹر حامد انصاری نے سچ کیا کہہ دیا، ملک کے تمام نیوز چینل بھڑک اٹھے، آر ایس ایس سے لے کر شیو سینا تک سب نے انھیں نشانہ بنانا شروع کر دیا، اندریش کمار نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ حامد انصاری کو جو ملک محفوظ لگے وہاں چلے جائیں، جمہوریت نے ہمیں جو حقوق عطا کیے ہیں ان میں اِظہارِ خیال کی آزادی کا حق بھی ہے، کیا اب اس حق پر پابندی اور دستورِ زباں بندی کے دن آنے والے ہیں، حامد انصاری صاحب نے ملک کے باوقار عہدہ پر رہتے ہوئے جو کچھ محسوس کیا وہ انہوں نے صاف صاف کہہ ڈالا، نہ اس میں کہیں اعتماد شکنی کارفرما ہے، نہ اس سے فرقہ واریت جھلک رہی ہے، یہ ایک درد ہے جو ان کے دل میں تھا اور جسے عہدہ کی نزاکتیں چھلکنے سے روکے ہوئیں تھیں، اس بارِ گراں سے سبک دوش ہوئے تو ان کا یہ درد چھلک پڑا، وہ نہ بھی کہتے تب بھی کچھ فرق نہ پڑتا، ملک کے حالات چیخ چیخ کر وہی سب کچھ کہہ رہے ہیں جو حامد انصاری صاحب کی زبان کہہ رہی ہے، کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ بھیڑ کے ذریعہ تشدد اور قتل کے واقعات بڑھتے جا رہے ہیں، کیا اس بات سے انکار کیا جا سکتا ہے کہ اخلاق احمد سے لے کر حافظ جنید تک قتل کے جو واقعات رونما ہوئے

ہیں وہ ظلم، ناانصافی، عدم برداشت، سفا کی اور بربریت کے استعاروں میں ڈھل چکے ہیں، اب قتل ناحق کی تفصیلات بتلانے یا لکھنے کی ضرورت نہیں ہے بل کہ اخلاق احمد، پہلو خاں اور جنید کا نام لینا ہی اس بات کے لیے کافی ہوگا کہ کہنے والا ظلم وستم کی کون سی داستان بیان کرنا چاہتا ہے، کیا ان واقعات سے مسلمانوں میں خوف ودہشت اور عدم تحفظ کا احساس پیدا نہیں ہورہا ہے، گئو رکشکوں کو پوری چھوٹ ملی ہوئی ہے، قانون نافذ کرنے والی ایجنسیاں، ادارے اور افراد سب ان واقعات کو اس طرح نظر انداز کررہے ہیں جیسے ان کی کوئی اہمیت ہی نہ ہو، اس صورت میں اگر مسٹر انصاری نے حکام کی اہلیت پر سوال اٹھایا ہے تو کیا غلط کیا ہے؟ مسلمانوں سے ان کی وفاداری کے ثبوت مانگے جارہے ہیں، ان سے پوچھا جارہا ہے کہ وہ پہلے مسلمان ہیں یا ہندوستانی؟ حالاں کہ بنیادی طور پر یہ سوال ہی غلط ہے، ایک شخص ایک ہی وقت میں مسلمان بھی ہوسکتا ہے اور ہندوستانی بھی، اس کی ذات میں عقیدہ اور وطن دونوں کی محبت ایک ساتھ جمع ہوسکتی ہے، اگر کوئی مسلمان یہ کہہ دیتا ہے کہ وہ پہلے مسلمان ہے پھر ہندوستانی تو سنبت پاترا جیسے لوگ اسے غدارِ وطن کے خطاب سے نواز کر ملک بدر کردینے کا مطالبہ کرتے ہیں لیکن یہی بات جب یوپی کے وزیرِ اعلیٰ مسٹر یوگی ایودھیا میں رام مندر کے درشن کے بعد کہتے ہیں کہ وہ پہلے رام بھگت ہیں پھر بھارتیہ ناگرک؛ تب انہیں کوئی کچھ نہیں کہتا، نہ انہیں غدارِ وطن کے خطاب سے نوازا جاتا ہے اور نہ انہیں نیپال یا بھوٹان بھیجنے کا مطالبہ کیا جاتا ہے، مسلمانوں سے وندے ماترم گانے کا مطالبہ وہ لوگ کررہے ہیں جو اس گیت کی ایک پنکھڑی بھی نہیں گا سکتے، مدارس میں قومی پرچم لہرانے کی بات وہ لوگ کررہے ہیں جنہوں نے اس ملک کو آزاد کرانے کے لیے کبھی کوئی قربانی نہیں دی، اور نہ کبھی قومی پرچم کو سلامی دے کر ملک کے تئیں اپنی وفاداری کا اظہار کیا، آج بھی ملک بھر کے ہزاروں لاکھوں مدرسوں نے اپنی عمارتوں پر قومی پرچم لہرا کر ملک سے اپنی محبت کا اظہار کیا ہے، اس لیے نہیں کہ وہ یوگی کے حکم نامہ سے خوف زدہ ہیں، بل کہ اس لیے کہ یہ آزادی انہی مدرسوں کی دین ہے، اس کی حفاظت بھی انہی مدرسوں کو کرنی ہے، اور اس سے وابستہ چیزوں کا احترام بھی انہی کو کرنا ہے، سراج الدولہ اور سلطان ٹیپو شہید نے وطن پر مرمٹنے کا سبق ان ہی مدرسوں میں بیٹھ کر پڑھا،

حضرت شاہ عبدالعزیز دہلویؒ کے فتویٰ جہاد سے مسلح تحریک آزادی کے دوسرے دور کا آغاز ہوتا ہے، یہ بھی مدرسہ کے پڑھے ہوئے تھے، سیّد احمد شہیدؒ اور شاہ اسماعیل شہیدؒ ان اوّلین علماء میں سے ہیں جنھوں نے حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کے تصورِ جہاد کو حقیقت کا رنگ دیا، یہ بھی مدرسہ ہی کے پڑھنے پڑھانے والے لوگ تھے، حاجی امداد اللہؒ، مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، حافظ ضامن شہیدؒ اور ان کی آواز پر لبیک کہنے والے ہزاروں افراد سب کے سب مدرسوں کے بوریہ نشیں ہی تو تھے، شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ اور ان کے سینکڑوں شاگردوں کو انگریزوں سے ٹکرانے کی تحریک اور حوصلہ مدرسوں ہی سے ملا، آج جب لاکھوں علماء کی بے مثال قربانیوں کے طفیل مادرِ وطن آزاد ہے تو ان مدرسوں سے وفاداری کے ثبوت مانگے جارہے ہیں، یہ مدرسے پہلے بھی یومِ آزادی کی تقریبات جوش وخروش سے مناتے تھے اس سال بھی انہوں نے اسی جوش وجذبے کا مظاہرہ کیا ہے، آئندہ بھی کرتے رہیں گے، اس کے لیے نہ کسی کے فرمان کی ضرورت ہے اور نہ کسی حکم نامے کی، اُمّ المدارس دارالعلوم دیوبند نے ناقدین مدارس کی زبان بند کرنے کے لیے اپنی تاریخ میں پہلی بار صدر دروازہ پر ترنگا لہرایا، اگرچہ اسے یہ سب کچھ کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی، کیوں کہ یہ آزادی تو اسی ادارہ کی رہین منت ہے۔ حق تو یہ تھا کہ مسٹر مودی اور مسٹر یوگی جیسے لوگ یہاں آکر اس ادارہ کے درودیوار کو سلامی پیش کرتے کہ قومی پرچم کے رنگوں کی بہار میں یہاں کے علماء کے خون کی خوش بو مہک رہی ہے، مگر تعصب، فرقہ واریت اور مسلم دُشمنی کے اس ماحول میں اس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا، ملک کے موجودہ حالات پر بھگوا ذہن کے لوگ خوشی سے بغلیں بجالیں مگر یہ آنے والے کل کے لیے اچھی علامت نہیں ہے، آزادی بڑی مشکل سے نصیب ہوئی ہے، اسے فرقہ واریت کی بھینٹ چڑھا کر ضائع کرنے کی کوشش نہ کی جائے، مسٹر حامد انصاری ہمارے قابل احترام رہنما اور تجربہ کار قائد ہیں، کچھ سوچ کر ہی انہوں نے اپنے درد کا اِظہار کیا ہے، اس سے پہلے کہ ان کا درد مسلمانوں کا غصہ بن جائے ہم سب کو مل کر ملک کے حالات کو سنبھالنا ہوگا۔

دیو بند ہے جس کا نام

مغربی یوپی کے جو قصبات اسلام اور مسلمانوں کے حوالے سے اپنی شناخت رکھتے ہیں ان میں قصبہ دیو بند سرفہرست ہے، ملک کے دار الحکومت دہلی سے ایک سو پچاس کلومیٹر کے فاصلے پر شمال میں واقع دیو بند کی شہرت دار العلوم دیو بند کی وجہ سے ہے جو اس سرزمین پر ۱۸۶۶ء میں قائم ہوا، ڈیڑھ سو سال کی طویل مدت پر محیط اس ادارے کی خدمات نے دیو بند کو عظمت وشہرت کی انتہائی بلندیوں پر پہنچا دیا ہے، سرحدوں کی قیدو بند سے ماوراء مسلمانوں کی دینی تعلیم کی یہ واحد درس گاہ ہے جو دنیا بھر کے مسلمانوں کے دلوں کی دھڑکن بنی ہوئی ہے، کڑوڑوں لوگ اس کی طرف اپنے انتساب کو باعث فخر سمجھتے ہیں، اب یہ کوئی مدرسہ، جامعہ یا درس گاہ ہی نہیں ہے بل کہ منہج بنوت سے اپنی انتہائی قربت، قرآن وسنت کی روشنی میں اسلام کے متوازن اور صحیح فکر کی ترجمانی اور اپنی علمی وعملی جامعیت اور اعتدال کے باعث اسے ایک مکتب فکر کی حیثیت حاصل ہوگئی ہے، دیو بند کی یہ لازوال شہرت اور سربلندی اس قصبے کے تمام باشندوں کے لیے باعث فخر ہونی چاہئے، مگر کچھ لوگوں کو یہ پسند نہیں کہ اس قصبے کو اسلام اور مسلمانوں کے حوالے سے پہچانا جائے اس لیے وہ چاہتے ہیں کہ اس کا نام ہی تبدیل کردیا جائے اور اس کو کوئی ایسا نام دے دیا جائے جس سے قصبے کی اسلامی شناخت ختم ہوجائے اور یہ قصبہ ہندو مذہب کے قدیم گہوارے کی شکل میں دنیا کے نقشے پر ابھرے، یوپی اسمبلی کے انتخابات میں بی جے پی کے امیدوار نے یہاں کامیابی حاصل کی ہے جسے عظیم تاریخی فتح سے تعبیر کیا جارہا ہے، میڈیا میں کئی دنوں تک یہ کامیابی زیر بحث رہی، دار العلوم دیو بند کی وجہ سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ دیو بند میں صرف مسلمان آباد ہیں، اور اگر کچھ غیر مسلم ہیں بھی تو ان کی تعداد بہت کم ہے، ذرائع ابلاغ میں تو یہاں تک آیا کہ دیو بند میں مسلمانوں کی آبادی اسّی نوّے فی صد سے بھی زیادہ ہے، جس نے بھی آبادی کے سلسلے میں اس نظریئے کی اشاعت کی ہے اس کی معلومات انتہائی ناقص ہیں، دیو بند قصبے کی بات کی جائے تو یہاں مسلمانوں کی آبادی کا تناسب ساٹھ سے پینسٹھ فی صد ہے اور اسمبلی حلقے کا ذکر ہو تو یہ تناسب گھٹ کر اڑتیس فی صد رہ

جاتا ہے، اس صورت حال میں اگر تمام برادران وطن متحد ہوجائیں تو وہ مسلم امیدوار کو آسانی کے ساتھ شکست دے سکتے ہیں، دو مسلم امیدوار مضبوطی کے ساتھ لڑ رہے ہوں تو یہ شکست اور بھی آسان ہوجاتی ہے، دیوبند میں یہی ہوا جس کی وجہ سے بی جے پی کے امیدوار کو کامیابی ملی، آزادی کے بعد سے اب تک یہاں سے صرف دو مسلم امیدواروں نے کامیابی حاصل کی ہے، ایک مرتبہ جنتا پارٹی کی لہر میں، اور دوسری مرتبہ ضمنی الیکشن میں، میں نہیں سمجھتا کہ بی جے پی امیدوار کی کامیابی کو کسی اور نظریئے سے دیکھنے کی ضرورت ہے، یہ اعداد و شمار کا کھیل تھا جس میں ایک فریق جیت گیا اور دوسرا فریق ووٹ کی تقسیم کے باعث مات کھا گیا، اس میں شک نہیں کہ یوپی میں تاریخی کامیابی سے ہم کنار ہونے کے بعد بی جے پی کے حوصلے بلند ہوئے ہیں، بی جے پی نے یہ الیکشن مسلمانوں کے خلاف لڑا، اس بے مثال کامیابی نے اسے موقع دیا ہے کہ اپنے مسلم مخالف جذبات کا طوفان تھامنے کے لیے جو کچھ وہ کرنا چاہتی ہے کرے، ہمارے قصبہ دیوبند کے کامیاب امیدوار نے پہلی ہی پریس کانفرنس میں اپنا رخ واضح کردیا ہے، انھوں نے اعلان کیا کہ وہ اسمبلی کے پہلے ہی سیشن میں دیوبند کا نام بدلنے کی تجویز پیش کریں گے، ان کا کہنا ہے کہ دیوبند کا اصل نام ''دیورند'' ہے، سینکڑوں سال پہلے یہ علاقہ اسی نام سے پہچانا جاتا تھا جس کے دستاویزی ثبوت جمع کئے جائیں گے، کنور برجیش کے اس بیان کے بعد میڈیا میں منفی اور مثبت ردّ عمل کا جو سلسلہ شروع ہوا تھا وہ ابھی تک جاری ہے، لوگ تبدیلی کے اس عزم وارادے کو دارالعلوم دیوبند کے تناظر میں دیکھنے کی کوشش کررہے ہیں۔

دیوبند ایک قدیم ترین بستی ہے، مولانا ذوالفقار علی دیوبندیؒ نے ''الہدیۃ السنیۃ'' میں لکھا ہے کہ اس کے آثار سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ بستی طوفان نوح کے بعد کی ابتدائی بستیوں میں سے ایک ہے'' ''ہندو سنسکرتی کا ایک کیندر'' کے مؤلف نے لکھا ہے کہ دیوبند کا ذکر پرانوں میں ملتا ہے، یہ بھی مشہور ہے کہ کوروں پانڈوں کے عہد حکومت میں دیوبند آباد تھا، بودھ مت کے عروج کے زمانے میں یہ بستی برہمنوں کی جدوجہد کا مرکز بنی رہی ہے، شہر سے باہر جنوب میں واقع محلہ سرائے پیرزادگان میں ایک کنواں واقع تھا جس میں ایک کتبہ لگا ہوا

تھا، ''تاریخ دیوبند'' کے مصنف جناب سید محبوب رضویؒ نے وہ کتبہ پڑھنے کی کوشش کی جو امتداد زمانہ کے باعث پڑھا نہ جاسکا البتہ نیچے کے جانب کسی قدر سن کا پتہ چلتا ہے غالباً ۱۱۹ بکر ماجیت سن درج ہے، اسی طرح ایک پرانے بند کنویں سے ایک سنگی کتبہ برآمد ہوا تھا جس کو سکندر اعظم کے زمانے کا بتلایا جاتا ہے، تمام تاریخی شواہد سے پتہ چلتا ہے کہ مسلمانوں کی آمد سے پہلے یہاں خالص ہندو آبادی تھی اور یہ علاقہ ہندوؤں کا مقدس مقام سمجھا جاتا تھا، مہابھارت کے مترجم منشی شری رام ماتھر دہلوی نے مہابھارت کے محاذ جنگ کا جو نقشہ تیار کیا ہے اس کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جے درتھ پر ارجن کا یہ حملہ دیوبند یا اس کے آس پاس سے کیا گیا ہوگا، کہتے ہیں کہ دیوبند کے قریب رن کھنڈی میں یہ محاذ قائم ہوا تھا، رن کھنڈی کے معنی ہی محاذ جنگ کے ہیں، دیوبند میں مسلمانوں کی آمد محمود غزنوی کے دور میں ہوئی جیسا کہ ''تاریخ سہارن پور'' میں مذکور ہے، بزرگان دین کے مزاروں پر لگے ہوئے کتبوں سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ یہاں مسلمان کم وبیش ایک ہزار سال سے آباد ہیں، سب سے قدیم بزرگ شیخ معز الاسلام ہیں، دیوبند کے صدیقی شیوخ کا سلسلہء نسب انہی سے چلا ہے، ان کے مزار پر لگے ہوئے کتبے پر ۶۶۱ھ (۱۲۶۲ء) تاریخ وفات درج ہے، مسلمانوں کے عہد حکومت کی کئی یادگار مساجد اس بستی میں موجود ہیں، دار العلوم دیوبند کے بالکل قریب ایک محلہ دیوان واقع ہے جس کا بلند و بالا پرشکوہ دروازہ ابھی تک سلامت ہے، یہ دروازہ دیوان لطف اللہ عثمانی کی یادگار ہے جو شاہ جہاں کے عہد میں دیوانی کے منصب پر فائز ہوئے، یہ دروازہ پانچ منزل کا تھا، اوپر کی دو منزلیں گر چکی ہیں، تین منزلیں شاہ جہانی دور کی یادگار کے طور پر آج بھی باقی ہیں۔

''تاریخ دیوبند'' اور ''تاریخ دار العلوم'' کے مؤلف جناب سید محبوب رضویؒ نے دیوبند کی وجہ تسمیہ کے ضمن میں لکھا ہے کہ دیوبند کو پہلے ''دیوی بلاس'' کہتے تھے، کیوں کہ یہاں پر سندری دیوی کا ایک مندر دیوی کنڈ کے نام سے تھا جو ابھی تک موجود ہے اور ایک جنگل ''بلاس'' کے نام سے تھا جو ختم ہو چکا ہے، بعض کا قول ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے اس

جگہ دیوؤں کو بند کیا ہے اس لیے اس کا نام دیو بند پڑ گیا ’’آئین اکبری‘‘ میں یہی نام لکھا گیا ہے، حضرت مجدد الف ثانی کی سوانح حیات ’’زبدۃ المقامات‘‘ میں جو گیارہویں صدی کی اوائل کی تصنیف ہے اس بستی کا نام دیبن لکھا گیا ہے بہ ہر حال تاریخی اور تحقیقی طور پر تین ناموں کا ذکر ملتا ہے، دیوی بلاس، دیبن، دیو بند، ان تین کے علاوہ کسی چوتھے نام کا کوئی ثبوت نہیں ملتا، اگر دیو بند کا نام بدل کر ’’دیورند‘‘ کیا گیا تو یہ ایک بالکل نیا نام ہوگا، نام کی تبدیلی کی اس مہم کے سلسلے میں عرض ہے کہ ’’دیو بند‘‘ نہ مسلمانوں کا رکھا ہوا نام ہے اور نہ یہ اسلامی نام ہے، بل کہ دیوی بلاس دیبن یا دیورند کی طرح یہ نام بھی ہندو تہذیب پر ہی دلالت کرتا ہے، اگر نام کی تبدیلی کا مقصد اسلامی نام بدل کر ہندو نام رکھنا ہے تو اس سے یہ مقصد حاصل ہونے والا نہیں ہے، جو لوگ تبدیلی کے علم بردار ہیں انہیں یہ سوچنا چاہئے کہ دار العلوم دیو بند نے ان کے تاریخی قصبے کی شہرت اور عظمت میں چار چاند لگائے ہیں، اس کو نقصان نہیں پہنچایا، صدیوں سے یہاں ہندو اور مسلمان شیر وشکر ہو کر رہتے ہیں، دار العلوم دیو بند کے قیام سے ہندو مسلم ہم آہنگی کو اس قصبے میں ہی نہیں بل کہ پورے ملک میں تقویت ملی ہے جیسا کہ دار العلوم دیو بند کی تاریخ سے اس کا ثبوت ملتا ہے، پھر ملک کی آزادی کے لیے دار العلوم دیو بند نے جو طویل جدو جہد کی ہے وہ بھی برادران وطن کے لیے فخر کا سبب ہونا چاہئے، نہ کہ نفرت کا باعث، میں نہیں سمجھتا کہ نام کی تبدیلی سے دار العلوم دیو بند کی تاریخ یا اس کے آنے والے کل کو کوئی نقصان پہنچنے والا ہے، اس لیے کہ دیو بند اس کے نام کا ایک مستقل جزء بن چکا ہے، اگر اس کا نام بدل کر کوئی دوسرا نام رکھ بھی دیا جائے تو دار العلوم دیو بند؛ دار العلوم دیو بند ہی رہے گا، دار العلوم دیورند یا دار العلوم دیبن یا دار العلوم دیوی بلاس نہیں ہوگا، میری ناقص رائے میں ہمارے محترم ایم ایل صاحب کو اس طرح کی سرگرمیوں میں حصہ لینے کے بجائے علاقے کی ترقی اور ہندو مسلم اتحاد کے لیے جدو جہد کرنی چاہئے، اس طرح وہ اپنے قصبے کی زیادہ بہتر خدمت انجام دے سکتے ہیں۔

ملّی قیادت کا امتحان

دونو عمر لڑکے اپنے گاؤں جانے کے لئے ٹرین پر سوار ہوتے ہیں، انہیں ہریانہ کے بلبھ گڑھ اترنا ہے جہاں سے وہ اپنے گاؤں کھنڈاولی جائیں گے، دو دن بعد عید ہے، اسی دن کے لئے نئے کپڑے اور نئے جوتے خریدنے کے لئے وہ دہلی گئے تھے، انہیں کیا خبر تھی کہ یہ ٹرین ان میں سے ایک کا مقتل بن جائے گی، جس منزل کے لئے وہ اس پر سوار ہو رہے ہیں وہ منزل کبھی نہیں آئے گی، دہلی کے صدر بازار اسٹیشن سے وہ دونوں بھائی ٹرین میں بیٹھے، دونوں روزے سے تھے، ٹرین خالی تھی، دونوں بھائی وقت گزاری کے لئے لڈو کھیلنے لگے، اسٹیشن آتے رہے، مسافروں کی تعداد بڑھتی رہی، اوکھلا سے کافی لوگ سوار ہوئے، ایک عمر رسیدہ شخص نے ان دونوں سے جگہ دینے کے لئے کہا، سادہ لوح معصوم جنید جو عمر کے سولہویں سال میں تھا اپنی جگہ سے اسی وقت کھڑا ہو گیا اور اس شخص کو اپنی جگہ دے دی، اسی دوران کسی نے اسے دھکا دیا، پہلے تو وہ یہ سمجھا کہ شاید غلطی سے ایسا ہوا ہے، دوبارہ پھر اسے دھکا دیا گیا، تب اس نے نرمی سے کہا کہ ہمیں دھکا کیوں دے رہے ہو، اس کا یہ کہنا تھا کہ دونوں بھائیوں کی داڑھی اور ٹوپی کو لے کر لعن طعن شروع ہو گئی، دیش دروہی، پاکستانی، کٹ ملا، کٹر وغیرہ خطابوں سے انہیں نوازا گیا، کہا گیا کہ تم گائے ماتا کا گوشت کھاتے ہو، تم بھارت میں کیوں ہو، پاکستان جاؤ، کچھ ''بہادروں'' نے زبان ہی سے ان کی دل چھلنی نہیں کئے بلکہ ہاتھوں سے بھی ان کو مارنا شروع کردیا، ان کے سر کی ٹوپی گرادی، ان کی داڑھی کھینچی، صورت حال بگڑتی دیکھ کر جنید نے زنجیر کھینچنی چاہی، لیکن گاڑی نہیں رکی، شاکر نے گھبرا کر اپنے بھائی ارشاد کو فون کیا کہ وہ بلبھ گڑھ اسٹیشن پر آجائے، گاڑی کے بلبھ گڑھ اسٹیشن تک پہنچتے پہنچتے پندرہ بیس لوگ ان کو اچھی طرح سبق سکھا چکے تھے، کئی لوگوں نے چاقو نکال لئے، جنید کو کافی زخم لگے، زخمی شاکر بھی ہوا، دونوں کے خون سے بوگی کا فرش لالہ زار بن گیا، باقی لوگ تماشائی بنے رہے، کسی ایک نے بھی مارنے والوں کا ہاتھ پکڑنے کی کوشش نہیں کی، ہاتھ پکڑنا تو دور کی بات ہے انہیں زبان سے روکنے کی بھی ہمت نہیں کی، اگر ان میں سے کوئی دوسری طرف گرتا تو وہاں بیٹھے ہوئے یا

کھڑے ہوئے لوگ انہیں پھر بھیڑ کی طرف دھکیل دیتے گویا وہ بھی یہی چاہتے تھے کہ ان کٹ ملاؤں، ان پاکستانیوں کو آج اچھی طرح سبق سکھا دیا جائے، بلبھ گڑھ اسٹیشن پر ان کا تیسرا بھائی منتظر تھا، یہ دونوں بھائی ٹرین سے اترنا چاہتے تھے مگر بھیڑ نے انہیں اترنے نہیں دیا، یہاں تک کہ تیسرا بھائی بھی تلاش کرتا ہوا ان تک پہنچ گیا، ان ''وطن پرست جانبازوں'' نے اس کو بھی ٹرین کے اندر گھسیٹ لیا، اور اس کو بھی پیٹنا شروع کردیا، جب تک گاڑی اگلے اسٹیشن تک پہنچ چکی تھی اور یہ تینوں بچے بھی اچھی طرح لہولہان ہو چکے تھے، جنید کچھ زیادہ ہی زخمی تھا، بھیڑ نے تینوں کو ٹرین سے پلیٹ فارم پر پھینک دیا، انھوں نے مدد کے لئے آواز لگائی، نہ اسٹیشن کے عملے کا کوئی فرد آیا، نہ پولیس آئی، نہ عام آدمیوں میں سے کوئی شخص آگے بڑھا، شاکر نے کانپتے ہاتھوں سے ایمبولینس کو فون کیا، آدھے گھنٹے بعد اس کے دیدار ہوئے، اس وقت تک جنید زخموں کی تاب نہ لاکر دم توڑ چکا تھا، شاکر بھی زخمی تھا، مقتول بھائی کا سر اس کی گود میں تھا، وہ پانی پانی کے لئے چلا رہا تھا، کباڑ چننے والے ایک لڑکے کے دل میں ان کے حال پر رحم آیا اور وہ پانی کا ایک پاؤچ خرید کر ان کے پاس لایا، شاکر نے اپنے بھائی کو پانی پلانے کی کوشش کی مگر وہ تو اس سے بے نیاز ہو چکا تھا، یہ کوئی فرض کہانی یا افسانہ نہیں ہے، نہ کسی فلمی سین کی منظر کشی ہے بل کہ اسی دھرتی کا سچا اور حقیقی واقعہ ہے جہاں انسان بستے ہیں، یہ واقعہ اس سرزمین پر پیش آیا جسے گنگا جمنی تہذیب اور ہندو مسلم بھائی چارے کا گہوارہ کہا جاتا ہے، یہ واقعہ راجدھانی دہلی کی ناک کے نیچے پیش آیا جہاں صدر جمہوریہ، وزیر اعظم، جج، وزراء، ممبران پارلیمنٹ، ممبران اسمبلی، سیاسی پارٹی کے قدر آور لیڈر، اور سول اور فوجی حکام کی بڑی تعداد رہتی ہے۔

بھیڑ کے ذریعے بے قصور مسلمانوں کی پٹائی، اور قتل کی یہ وحشیانہ واردات نئی نہیں ہے، بل کہ دادری کے اخلاق سے قتل کا جو سلسلہ شروع ہوا تھا چھبیس بے گناہ اور معصوم انسانوں کے قتل کے بعد بھی وہ سلسلہ جاری ہے، آج بھی اخبارات میں دو خبریں ہیں، ایک بہار سے جہاں ایک انیس سالہ مسلم نوجوان کو پولیس کے بہادر جوان نے گھر سے گھسیٹ کر

گولی ماردی، دوسری خبر مغربی بنگال سے آئی ہے جہاں تین مسلمانوں کو جانوروں کی چوری کے شبہے میں گاؤں والوں نے پیٹ پیٹ کر ہلاک کرڈالا، ان تمام واقعات میں چند باتیں قدر مشترک کے طور پر قابل غور ہیں، ایک تو یہ کہ داڑھی، کرتے اورٹوپی والوں کے دیکھ کر ہندو شدت پسندوں کے جذبات ان کے قابو میں نہیں رہتے، ان کی زبانیں بے لگام ہوجاتی ہیں، یہاں تک کہ ان کے ہاتھ بھی ان کے بس میں نہیں رہتے، گالم گلوچ اور مار پیٹ کے واقعات تو اکثر پیش آتے ہی رہتے ہیں، کبھی کبھی ان واقعات میں بے قصور لوگوں کی جانیں بھی چلی جاتی ہیں، دوسری بات یہ ہے کہ نہتے اور بے قصور لوگوں کی مدد کے لئے کوئی شخص آگے نہیں بڑھتا، بل کہ اکثر لوگ کھڑے ہوکر تماشہ دیکھتے ہیں یا موبائل سے ویڈیو بنانے میں لگ جاتے ہیں، پولیس بھی اپنا رول صحیح طور پر ادا نہیں کرتی، بعض جگہوں پر پولیس کو موجود پایا گیا لیکن اس نے مارنے والوں کو روکنے کی یا گرفتار کرنے کی کوشش نہیں کی، قتل کے واقعات رونما ہونے کے بعد بھی مجرموں کو گرفتار نہیں کیا جاتا اور اگر کوئی گرفتار بھی ہوجائے تو چشم دید گواہوں کے فقدان کی وجہ سے یا رپورٹ میں قانونی خامیوں اور کمزوریوں کی بنیاد پر اسے رہا کردیا جاتا ہے، سب سے زیادہ تکلیف دہ بات یہ ہے کہ ہمارے ملک کے وزیر اعظم اور ان کے ساتھی وزراء، اور صوبوں کے وزراء اعلا سب مہر بہ لب رہتے ہیں، کسی کی زبان سے مذمت کا ایک لفظ بھی نہیں نکلتا، بل کہ بعض واقعات میں تو مجرمین کی ہمنوائی تک کی جاتی ہے، مرکزی وزارت داخلہ کے سکریٹری راجیو مہرشی کہتے ہیں کہ اس طرح کے واقعات کو میڈیا بڑھا چڑھا کر پیش کرتا ہے ان کا کہنا ہے کہ اس طرح کے واقعات کو اتنی اہمیت نہیں دینی چاہئے، گویا ان کے نزدیک کسی بے قصور انسان کا قتل کوئی معنی ہی نہیں رکھتا، جنید کے معاملے میں ہریانہ کے وزیر اعلا نے لب کشائی کی ہے، دیکھتے ہیں ان کی حکومت مجرمین کو کیفر کردار تک پہنچانے کے لئے کیا اقدامات کرتی ہے۔

بھیڑ کے ذریعے قتل کے واقعات نے ہندوستان کے مسلمانوں کو خاص طور پر نوجوانوں کو جس کرب اور تکلیف میں مبتلا کیا ہے ماضی میں اس کی کوئی نظیر نہیں ملتی، سب سے

پہلے ہمیں اپنے نوجوانوں کو سمجھانا ہوگا کہ وہ صبر واستقامت سے کام لیں اور جوش وجذبات پر قابو رکھیں، اس کے ساتھ ہی ملّی جماعتوں کی یہ ذمہ داری بنتی ہے کہ وہ ان حالات سے نمٹنے کے لئے کوئی لائحہ عمل تیار کریں، مولانا سیّد محمود اسعد مدنی کی جمعیت علمائے ہند نے اپنا عید ملن پروگرام منسوخ کر کے سمجھداری کا ثبوت دیا ہے، واقعے کے فوراً بعد جمعیت کی قیادت نے کھنڈاولی پہنچ کر مقتول کے غم زدہ والدین اور اہل خاندان کے ساتھ جس ہمدردی اور غم گساری کا برتاؤ کیا ہے وہ بھی فرض شناسی اور ذمہ داری کی ادائیگی کا ایک حصہ ہے، حکام سے مل کر انھوں نے جنید کے کنبے کے لئے دو سرکاری ملازمتیں اور دس لاکھ روپے نقد دینے کا جو وعدہ لیا ہے اس سے اگر چہ جنید کی کمی پوری نہیں ہوسکتی مگر متاثرین کی کچھ اشک سوئی ضرور ہوسکتی ہے، جمعیت کا یہ اعلان بھی قابل تعریف ہے کہ وہ اس مقدمے میں مقتول کے کنبے کی طرف سے وکیل کھڑا کرے گی اور اس واقعے کے ملزموں کو کیفر کردار تک پہنچا کر دم لے گی، لیکن مسلم نوجوان اپنی جماعتوں سے کچھ زیادہ چاہتے ہیں، وہ چاہتے ہیں کہ تمام ملّی جماعتوں کے قائدین اپنے گروہی اور مسلکی اختلافات بھلا کر بیٹھیں، اور سوچیں کہ انہیں اب کیا کرنا ہے، بے قصور مسلم نوجوانوں کو سسک سسک کر مرنے کے لئے چھوڑ دیا جائے یا ان کے تحفظ کے لئے عملی اقدامات کئے جائیں، اگر عملی اقدامات پر اتفاق ہوتا ہے تو فوری طور پر ان اقدامات کی نوعیت بھی زیر غور لانی ہوگی، اور اگر کوئی فیصلہ ہوجاتا ہے تو اس پر عمل کا نقشہ بھی طے کرنا ہوگا، اس سے پہلے کہ مسلم نوجوانوں کے جذبات لاوا بن کر پھوٹیں مسلم قائدین کو اپنی جماعتوں کے خول سے نکل کر باہر آنا ہوگا، دیر ہوگئی تو یہ بپھرے ہوئے نوجوان ان کی قیادت کا تار وپود بھی بکھیر سکتے ہیں اور ان کے برانگیختہ جذبات کے لاوے میں ان کا وجود خس وخاشاک کی طرح بہہ بھی سکتا ہے۔

پہلو خاں کی موت: غور وفکر کے چند پہلو

راجستھان کے ضلع الور کے گاؤں بہڑوڑ میں گؤ رکشا کے نام پر ایک پچاس سالہ مسلمان تاجر پہلو خاں کو نہایت بے دردی اور سفا کی کے ساتھ مار مار کر ہلاک کر دیا گیا، مقتول کے ساتھ پندرہ لوگ اور بھی تھے، ان سب کو بھی ظلم وتشدد کا نشانہ بنایا گیا، ان لوگوں کا قصور یہ تھا کہ وہ جانوروں کے ہفتہ واری بازار سے کچھ گائے دودھ نکال کر بیچنے کے لئے لے کر آ رہے تھے، ان کے پاس خریداری کی رسیدیں اور جانوروں کو اپنے ساتھ لے کر جانے کے سرکاری اجازت نامے موجود تھے، راستے میں مسلح حملہ آوروں نے ان کی گاڑیوں کو روک لیا، ان کو بے رحمی کے ساتھ زدوکوب کیا اور اس وقت تک پیٹتے رہے جب تک وہ بے ہوش نہیں ہو گئے، ظالموں نے ان کی جیبوں سے لاکھوں روپے بھی نکال لئے، پولیس نے دعوی کیا ہے کہ ان حملہ آوروں کا تعلق وشو ہندو پریشد اور بجرنگ دل جیسی تنظیموں سے تھا، اس پورے واقعے کے دوران پولیس خاموش تماشائی بنی کھڑی رہی، گؤ رکشک دل کے انچارج پروین سوامی نے اس قتل کو جائز ٹھہراتے ہوئے کہا ہے کہ اگر گؤ اسمگلنگ کرنے والے ہمارے عقیدے کے ساتھ کھلواڑ کریں گے تو ان کے ساتھ ایسا ہی سلوک کیا جائے گا، سب سے زیادہ افسوس ناک بیان راجستھان کے وزیر داخلہ گلاب چند کٹاریہ کا ہے جنھوں نے کہا ہے کہ پہلو خاں کو اس کی غلطی کی سزا ملی ہے اس کے پاس گائے لے جانے کے قانونی دستاویزات نہیں تھیں، وزیر داخلہ نے یہ نہیں بتلایا کہ کسی غلطی کی سزا دینا عدالت کا کام ہے یا عام لوگ بھی سزا دینے کے مجاز ہیں؟

جہاں تک گائے کاٹنے کا تعلق ہے مسلمان پہلے ہی سے اس سلسلے میں احتیاط کا دامن تھامے ہوئے ہیں اگر چہ دوسرے مذاہب کی طرح اسلام میں گائے کا ذبیحہ جائز اور حلال ہے، دوسرے ملکوں میں یہاں تک کہ امریکہ اور یورپ میں بھی گائے کے گوشت پر کوئی پابندی نہیں ہے، لیکن کیوں کہ ہندوستان میں برادران وطن نے گائے کے ساتھ اپنی عقیدت کو جوڑ دیا ہے اس لئے ان کی دل دہی اور دل داری کے لئے ہندوستانی مسلمان گائے کاٹنے اور اس کا گوشت کھانے سے گریز کرتے ہیں، اب رہا یہ سوال کہ ہندو بھائیوں کی یہ عقیدت مبنی بر

حقیقت ہے یا محض افسانوی تصور وخیال یا صرف سیاست، اس سوال کا جواب تلاش کرنا ہوتو مشہور مؤرخ پروفیسر ڈی این جھا کی مشہور کتاب cowholyofmythThe کا مطالعہ مفید ثابت ہوگا۔ پروفیسر صاحب نے اس موضوع پر بڑی تفصیل کے ساتھ گفتگو کی ہے، ان کا کہنا ہے کہ پراچین کال ہی سے بھارت میں گائے کے گوشت کا استعمال عام تھا، بل کہ خاص خاص موقعوں پر گائے کی قربانی بھی دی جاتی تھی، بہت سی مذہبی رسومات میں گائے کی بلی دینا ضروری تصور کیا جاتا تھا، پروفیسر صاحب کے مطابق چندر گپت موریہ کے عہد حکومت (322 م ق 298 ق م) سے پانچویں چھٹی صدی عیسوی تک بھارت میں گؤ ہتھیا پر پابندی نہ نظریاتی طور پر موجود رہی اور نہ عملی طور پر، جب چھوٹی چھوٹی ریاستیں وجود میں آئیں اور افتادہ زمینیں راجوں مہاراجوں کی طرف سے عام وخاص میں تقسیم کی گئیں تب زراعت کے نقطہ نظر سے جانوروں کی اہمیت اور ضرورت محسوس کی گئی، لوگ ان کو پالنے پوسنے لگے، خاص کر گائے کی اہمیت میں اضافہ ہوا کیوں کہ یہ جانور کاشت کے کاموں میں مدد دینے کے ساتھ ساتھ اپنے پالنے والوں کو دودھ بھی دیتا ہے، تب گائے کی نسل کو باقی رکھنے اور بڑھانے کی ضرورت محسوس کی گئی اور دھرم شاستروں میں یہ ذکر آنے لگا کہ گائے کی ہتھیا نہیں کرنی چاہئے، آہستہ آہستہ گائے کو نہ مارنے کا نظریہ عقیدے کی شکل اختیار کرتا چلا گیا اور ہندوستان میں زراعت کی ترقی کے ساتھ ساتھ گائے کے تئیں خصوصی عزت واحترام کا احساس بھی بڑھتا چلا گیا، سب سے پہلے برہمنوں کے مطالبے پر مغل بادشاہ بابر نے گؤکشی پر پابندی لگائی، اس نے اپنے بیٹے ہمایوں کو بھی وصیت کی کہ وہ گائے کاٹنے پر پابندی لگائے رکھے، اکبر اور جہاں گیر نے بھی اپنے پیش رو بادشاہوں کی تقلید کی، انگریزوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں کو لڑانے کے لئے اس عقیدے کو خوب ہوا دی اور اس کا بے جا استعمال کیا یہاں تک کہ انیسویں صدی میں اس عقیدت کو سیاست کا محور بنادیا گیا، اسی دوران پنڈت دیانند سرسوتی نے گؤرکشا سمیتی بنائی اور گائے کے تحفظ کی عوامی تحریک کا آغاز کیا، یہ وہی مہاشے ہیں جن کے ساتھ دارالعلوم دیوبند کے بانی حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے گوشت خوری سمیت بہت سے موضوعات پر

مناظرے کئے ہیں، پنڈت دیانند سرسوتی نے اپنی تحریک کے نشانے پر مسلمانوں کو رکھا، اس تحریک سے ملک میں فرقہ واریت کو زبردست فروغ ملا، جس وقت یہ تحریک شباب پر تھی اس وقت ویرساورکر جیسے انقلابی ہندو مفکر نے اپنی تحریروں میں گائے کو ایک کارآمد جانور سے زیادہ اہمیت نہیں دی، آزادی سے پہلے ایک وقت ایسا بھی آیا کہ خلافت تحریک کے دوران جب گاندھی جی نے مسلمانوں کا ساتھ دیا، اسی طرح جب ہندوؤں اور مسلمانوں نے مل کر انگریزوں کے خلاف تحریک عدم تعاون کا بگل بجایا تو مسلمانوں نے اپنے ہندو بھائیوں کے تئیں اظہار تعلق کی خاطر اور قومی یک جہتی کو تقویت دینے کی غرض سے رضا کارانہ طور پر گائے کاٹنی بند کردی، آج بھی مسلمان اسی پر کار بند ہیں، جن ریاستوں میں گائے کاٹنے پر قانوناً پابندی ہے وہاں کا مسلمان قانون پر عمل کرنا اپنا فرض سمجھتا ہے، حیرت کی بات یہ ہے کہ اس ملک میں بعض ریاستیں ایسی بھی ہیں جہاں قانونی طور پر گائے کاٹی جاتی ہے، بنگال، آسام، کیرالہ، منی پور اور گوا کا شمار ایسی ہی ریاستوں میں ہوتا ہے، دوسری طرف بعض ریاستیں گؤکشی کے خلاف سخت قوانین بنانے میں لگی ہوئی ہیں، گجرات میں یہ مطالبہ زور پکڑتا جارہا ہے کہ جو لوگ گائے کاٹیں ان کو سرِ عام پھانسی دے دی جائے، مہاراشٹر میں گائے کاٹنے کی سزا جرمانہ اور پانچ سال کی قید متعین کی گئی ہے، ریاست ہریانہ میں قید کی یہ سزا دس سال ہے، یہ عجیب بات ہے کہ ملک ایک ہے مگر گائے کے سلسلے میں حکومتوں کا طرز عمل مختلف ہے، کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ مرکزی حکومت پورے ملک کے لئے یکساں قانون بنا کر نافذ کردے تاکہ ہندو بھائیوں کے عقیدے کے مطابق گائے کا مکمل تحفظ ہوسکے۔

اسلام اگرچہ گائے کاٹنے اور اس کا گوشت کھانے کے خلاف نہیں ہے مگر برادران وطن کی خاطر دار العلوم دیوبند نے ایک سے زائد بار مسلمانوں سے یہ اپیل کی ہے کہ وہ ملکی قانون اور ہندو بھائیوں کے مذہبی جذبات کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے عید الاضحیٰ کے موقع پر بھی گائے نہ کاٹیں، دار العلوم دیوبند کی کوئی بھی اپیل مسلمانان ہند کے لئے حکم کا درجہ رکھتی ہے اور وہ اس حکم پر عمل کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔

اب تک صرف گؤکشی پر پابندی رہی ہے اور مسلمان اس پر عمل بھی کرتے رہے ہیں، مگر اب گائے رکھنا بھی جرم کے دائرے میں آنے لگا ہے، مرکز اور بعض ریاستوں میں بی جے پی کے برسر اقتدار آنے کے بعد اس جرم کا دائرہ وسیع ہوتا جارہا ہے، گؤ رکشا سمیتیوں اور منڈلوں کے لوگ جہاں کسی مسلمان کو گائے کے ساتھ دیکھتے ہیں اس پر گائے کی اسمگلنگ اور ہتھیا کا الزام لگا کر مار پیٹ شروع کردیتے ہیں، بل کہ اسے قتل بھی کر دیتے ہیں، جیسا کہ الور میں پہلو خاں کے ساتھ یہ واقعہ پیش آیا، اس سے پہلے دادری میں اخلاق احمد کو بھی محض اس شبہے میں ہلاک کیا گیا تھا کہ اس کے فریج میں گائے کا گوشت رکھا ہوا ہے، ہندو بھائیوں کی طرح مسلمان بھی گائے پالتے ہیں، اور ان کی خرید وفروخت کرتے ہیں، ریاست ہریانہ اور راجستھان میں ہزاروں مسلمان اس کاروبار سے وابستہ ہیں، یہاں تک کہ راجستھان کے راٹھ مسلمانوں کے ذریعے پالی جانے والی گائے کے نام ہی راٹھی گائے پڑ گیا ہے، گائے پالنے کے خلاف فرقہ پرستوں کی تازہ مہم نے خوف کا ماحول پیدا کردیا ہے، یوپی کے سابق وزیر محمد اعظم خاں جن کے طویلے میں گوردھن پیٹھ کے شنکرآچاریہ کی دی ہوئی گائے پل رہی تھی اتنے خوف زدہ ہوئے کہ انھوں نے یہ گائے شنکرآچاریہ جی کو واپس کرنے ہی میں عافیت سمجھی، اعظم خاں نے اپنے اس طرزِ عمل سے ہندوستان کے مسلمانوں کو ایک خاموش پیغام دینے کی کوشش کی ہے جس کو سمجھنے اور عمل کرنے کی ضرورت ہے، موجودہ حالات میں دارالعلوم دیوبند کو بھی پہل کرنی چاہیے اور مسلمانوں کے نام اپیل جاری کرنی چاہیے کہ وہ ان حملوں سے سبق لیں، اور اپنی جان ومال اور عزت وآبرو کی حفاظت کی خاطر گائے کی خرید وفروخت اور اس کی نقل وحمل اور پرورش وغیرہ سے خود کو دور ہی رکھیں اس طرح فرقہ پرست تنظیموں کے پاس مسلمانوں کے خلاف فتنہ انگیزی کرنے کا یہ بہانہ بھی باقی نہیں رہے گا۔

جنید کے لہو کی خوش بو

دادری کے اخلاق سے لے کر جنید تک بل کہ اس کے بعد بھی کئی بے گناہ، بے قصور مسلمانوں نے ہندوشدت پسند جنونیوں کے ہاتھوں جام شہادت نوش کیا ہے، ان میں سے ہر واقعہ دردناک، دلوں کو جھنجھوڑنے والا اور جگر خون کرنے والا ہے مگر حافظ جنید کی شہادت نے لوگوں کو جس طرح بے قرار کیا ہے اور ان کی سوچ کو جس طرح نئی جہت دی ہے، دوسرے واقعات نے اس طرح بے چین ومضطرب نہیں کیا اور ان کی سوچ کو اس قدر متاثر نہیں کیا، اس کی وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ وہ معصوم بچہ روزے سے تھا، اس کے سینے میں اللہ کے کلام کی دولت محفوظ تھی، اور وہ چند دن پہلے ہی تراویح کی نماز میں قرآن کریم سنا کر فارغ ہوا تھا، عید میں دو دن باقی تھے اور وہ اپنے بڑے بھائی کے ساتھ عید کی خریداری کر کے خوشی خوشی گھر واپس لوٹ رہا تھا، اس کی آنکھوں میں عید کی خوشی کے سچے خوابوں کی چمک تھی کہ جنونیوں کی ایک بھیڑ نے اس معصوم اور نہتے بچے کے خوابوں کی وہ چمک اس کی آنکھوں سے چھین لی، اور اسے زخموں سے چور اور زندگی سے دور کر کے اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر پھینک دیا، واقعہ شہادت کے ان پہلوؤں نے ان گنت لوگوں کے دلوں کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا ہے، اور وہ مذہب، زبان، نسل اور علاقے کے امتیاز وتفریق کو بالائے طاق رکھ کر سڑکوں پر اتر آئے ہیں، ان کے دلوں میں اضطراب ہے، ان کی آنکھوں میں نمی ہے، ان کی زبانوں پر نعرے ہیں، ان کے ہاتھوں میں دفتیاں ہیں جن پر اس واقعے کی مذمت میں دلوں کو چھو لینے والے جملے لکھے ہوئے ہیں، انسانی ضمیر کی بیداری کا یہ واقعہ بلاشبہ حافظ جنید کی شہادت سے رونما ہوا، اس کے خون کی خوشبو صرف دلّی میں ہی نہیں مہکی، صرف ہندوستان کے شہروں ہی میں نہیں پھیلی بل کہ یورپ اور اور امریکہ کے بڑے شہروں میں بھی اس کا اثر محسوس کیا گیا، ملک میں جاری بھگوا دہشت گردوں کی انسانیت سوز حرکتوں کے خلاف پہلا احتجاج راجدھانی دہلی کے جنتر منتر پر ہوا، اس میں ہزاروں کی تعداد میں لوگوں نے حصہ لیا، یہ کوئی عام آدمیوں کی بھیڑ نہیں تھی جنہیں یومیہ مزدوری پر لا کر دھرنوں میں بٹھا دیا جاتا ہے، بل کہ یہ ملک کے چنیدہ شہریوں کا اجتماع تھا، امن پسند اور سیکولر ذہن رکھنے والوں کا ایک زبردست ہجوم تھا، اس میں ہر طبقے کے لوگ شامل تھے،

شاعر، ادیب، قلم کار، صحافی، پروفیسر، فلم ساز، تاجر، سماجی کارکن، کئی نامی گرامی ہستیاں بھی تھیں جو صرف انسانیت کے نام پر جمع ہوئیں اور جنھوں نے namemy in not کے عنوان سے احتجاجی مظاہرہ کرکے ان جنونیوں کے خلاف اپنی ناراضگی کا اظہار کیا اور حکومت کی بے حسی کے خلاف اپنی آواز بلند کی، اسی طرح کی ریلیاں بمبئی، دہلی، کلکتہ، حیدرآباد، تروانتاپورم اور بنگلور میں بھی منعقد کی گئیں، اور ملک سے باہر واشنگٹن، نیویارک، لندن اور سڈنی جیسے عالمی شہروں میں بھی انصاف اور امن پر یقین رکھنے والوں نے اس طرح کے اجتماعات منعقد کرکے دنیا کو یہ باور کرایا کہ انسانیت ابھی زندہ ہے، ظلم اور ناانصافی کے خلاف آواز اٹھانے والے ابھی باقی ہیں، اور مظلوموں کا ساتھ دینے والوں کی آج بھی کمی نہیں ہے۔

جنید سے پہلے کے واقعات پر مہر بہ لب رہنے والے بے حس حکمرانوں نے بھی احتجاج کی یہ دھمک محسوس کی ہے، اطلاعات ونشریات کے مرکزی وزیر وینکیا نائڈو نے کہا کہ اس طرح کی حرکتیں ہرگز برداشت نہیں کی جاسکتیں، جنید کے ساتھ پیش آنے والا واقعہ انتہائی افسوس ناک ہے، مرکزی وزیر قانون روی شنکر پرساد نے بھی اس قتل کو انتہائی شرمناک اور دردناک قرار دیا اور کہا کہ حکومت ایسے حملوں کو ہرگز برداشت نہیں کرے گی، ہریانہ کے وزیر اعلا بھی بولے جن کے قلمرو میں یہ وحشت ناک واقعہ پیش آیا، ہمارے ہر دل عزیز وزیر اعظم جناب نریندر مودی جی نے بھی مہاتما گاندھی اور ونوبا بھاوے جیسے امن پسندوں کا حوالہ دے کر بے گناہوں کے خون ناحق سے اپنے ہاتھ رنگنے والے دہشت پسندوں کو آئینہ دکھلانے کی کوشش کی، مگر ایسا لگتا ہے کہ وزیر اعظم سمیت کسی بھی وزیر باتدبیر نے دل سے نہیں چاہا کہ ملک کو ان جنونیوں سے نجات ملے، اور یہ تمام لوگ جو عرصۂ دراز سے مذہب کے نام پر آتنک پھیلانے میں مصروف ہیں کیفر کردار کو پہنچیں، ورنہ کیا وجہ ہے کہ وزیر اعظم کی وارننگ کے بعد بھی یہ خونی کھیل برابر جاری ہے اور آج بھی آتنکیوں کی یہ بھیڑ معصوم لوگوں کو نشانہ بنارہی ہے۔

جنید کی شہادت کے بعد احتجاج کا جو سفر شروع ہوا تھا وہ ابھی منزل تک نہیں پہنچا، روز کسی نہ کسی شہر سے خبر آرہی ہے کہ امن وانصاف کے نام پر لوگ جمع ہوکر احتجاج کررہے ہیں،

خاص بات یہ ہے کہ ان اجتماعات میں یہ مصروف لوگ محض اپنے جذبے سے شرکت کر رہے ہیں، اور اس میں مسلمانوں کی کسی جماعت یا تنظیم کا کوئی رول نہیں ہے، جنید کے آبائی گاؤں اور اس سے ملحقہ علاقوں کے ہندو اور مسلمان بھی جنتر منتر پر پہنچے ہیں اور انہوں نے بھی اس ظلم کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی ہے، دوسری طرف سوشل میڈیا پر مسلم نوجوانوں کا غم وغصہ کم ہونے کا نام نہیں لے رہا ہے، انہیں اپنی قیادت سے شکایت ہے کہ آخر وہ کیوں خاموش ہے، اسی تناظر میں جامعہ نگر دہلی کے بعض مایوس مسلم نوجوانوں نے دین پسندوں کے مقابلے میں دین بیزاروں کو جوڑنے کی کوشش کی ہے، اپنی اس تحریک کو انہوں نے لال سلام کا نام دیا ہے، جس سے صاف ظاہر ہے کہ انہیں اپنی مذہبی قیادت پر اعتماد نہیں رہا، اس طرح کے حالات میں مایوسی کی یہ کیفیت نہ غیر فطری ہے اور نہ حیرت انگیز، مگر اسے جذباتی ضرور کہا جاسکتا ہے، اور بغیر سوچے سمجھے اٹھایا گیا ایک قدم بھی، جامعہ نگر میں جہاں تقریباً تمام مسلم تنظیمیں آن بان شان کے ساتھ قائم ہیں اس طرح کی کسی تحریک کا طلوع ان تنظیموں کے لئے نیک فال نہیں ہے۔

لیکن ملّی جماعتوں کی بھی اپنی مجبوریاں ہیں، آپس کے اختلافات انہیں ایک دوسرے سے جڑنے نہیں دے رہے ہیں، انفرادی حیثیت سے وہ جو کچھ کرسکتی ہیں کر رہی ہیں، جمعیت علمائے ہند (مولانا سیّد محمود اَسعد مدنی گروپ) نے عید ملن کا پروگرام منسوخ کرکے بپھرے ہوئے نوجوانوں کے جذبات کو سرد کرنے کی جو کوشش کی ہے اس میں اسے کامیابی ملی ہے، کئی جماعتوں کے وفود غم زدہ خاندان سے مل کر آئے ہیں، جس سے اس خاندان کو حوصلہ ملا ہے، تازہ خبر یہ ہے کہ جمعیت علماء نے جنید کا کیس لڑنے کا فیصلہ کیا ہے اور اس کی تیاری بھی مکمل کرلی ہے، جمعیت کا خیال ہے کہ موجودہ حالات میں جذبات کی رو میں بہنے کے بجائے قانونی چارہ جوئی کے لئے سنجیدہ ہونے کی ضرورت ہے، بلاشبہ قانونی کاروائی ضروری ہے، اور اس سلسلے میں مضبوط قدم اٹھانا وقت کا تقاضا ہے، جذبات میں بہنا بھی غلط ہے، مگر ملک میں اس وقت خوف وہراس کا جو ماحول ہے، اور وزیر اعظم کی وارننگ کے بعد بھی بے گناہ مسلمانوں کے قتل کا جو سلسلہ چل رہا ہے اس سے نمٹنے کے لئے بھی تو ہماری جماعتوں کو کوئی

لائحہ عمل طے کرنا ہوگا، جمہوریت میں اپنی بات منوانے کے جو جائز طریقے ہیں ہم ابھی تک وہ طریقے بھی اختیار نہیں کر پارہے ہیں، بھلا ہو سیکولر مزاج انصاف پسندوں کا کہ وہ اس معاملے میں ہم سے بازی لے گئے، ہم نے اپنے گذشتہ ہفتے کے کالم میں بھی لکھا تھا اور آج پھر لکھتے ہیں کہ سب سے پہلے تو ہماری جماعتوں کو اپنے گروہی مفادات اور مسلکی اختلافات کو بالائے طاق رکھ کر ایک دوسرے کے قریب آنا ہوگا اور کسی ایک شخصیت کو اپنا قائد تسلیم کرکے اپنی جدوجہد کا آغاز کرنا ہوگا، جب سب مل کر بیٹھیں گے تو جدوجہد کا راستہ خود بہ خود ہموار ہوگا اور کامیابی کے امکانات بھی روشن ہوں گے، ہم سے بعض دوستوں نے سوال کیا ہے کہ آپ صرف ملّی قیادت کو للکارتے رہتے ہیں خود کچھ کیوں نہیں کرتے، اس کا جواب بالکل واضح ہے کہ قیادت ہر شخص نہیں کرسکتا، جو لوگ پہلے سے اس میدان میں ہیں یہ کام ان کا ہے، یہ ذمہ داری ان کی ہے کہ وہ کچھ کریں، صحافی اور قلم کار تو ان کے حوصلوں کو مہمیز کرسکتے ہیں سو وہ ہم کرتے رہتے ہیں، بعض دوستوں نے یہ بھی پوچھا ہے کہ جدوجہد کا نقطۂ آغاز کیا ہونا چاہئے؟ اس کا جواب بھی اتحاد میں مضمر ہے، جب سب مل جل کر غور کریں گے تو جدوجہد کا نقطۂ آغاز بھی طے ہوگا، ہمارے ذہن میں ایک خیال آیا تھا اور وہ ہم نے جمعیت کے ذمہ داروں تک پہنچا بھی دیا تھا کہ اس کی تاریخ جدوجہد سے بھری ہوئی ہے، اسی جدوجہد کا ایک روشن باب تحریکِ ملک وملت بھی ہے جس میں اپنے مطالبات منوانے کے لئے جمعیت کے اراکین جیلیں بھرا کرتے تھے، موجودہ حالات میں اس طرح کی تحریک سے اپنی جدوجہد کا آغاز کیا جاسکتا ہے، فیصلہ تو جمعیت ہی کو کرنا ہے ہم صرف مشورہ دے سکتے ہیں، البتہ اس مشورے میں یہ اضافہ ضرور کریں گے کہ اگر جمعیت کوئی تحریک چلاتی ہے تو وہ تنہا جمعیت کی تحریک نہ ہو، بل کہ اس میں تمام ملّی جماعتوں کو شریک کیا جائے، ملک کے تمام سیکولر طبقوں کو ساتھ لایا جائے، مذہبی اور غیر مذہبی ہر طرح کی طاقتوں سے اس تحریک میں تعاون لیا جائے، اور سب کے تعاون سے اس چیلنج کا بھرپور جواب دینے کی کوشش کی جائے، یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ اتحاد ہی کامیابی کی طرف پہلا قدم ہے۔

لہو پکارے گا آستیں کا

لکھنؤ کی سی بی آئی عدالت نے بابری مسجد شہادت کیس میں اڈوانی، جوشی، اوما بھارتی، ونے کٹیار، سادھوی رتمبرا اور ڈالمیا سمیت بارہ ملزمین کو عدالت میں طلب کر کے ان پر فرد جرم عائد کردی ہے، سمجھ میں نہیں آتا اس خبر پر خوشی کا اظہار کیا جائے یا افسوس کا، بہ ظاہر تو یہ خوشی کی خبر معلوم ہوتی ہے کہ پچیس سال کے طویل اور تھکا دینے والے انتظار کے بعد اب جا کر یہ امید بندھی ہے کہ شاید بابری مسجد کو انصاف مل جائے، لیکن اس میں افسوس اور دکھ کا پہلو یہ ہے کہ حکومتوں نے اتنے نازک اور حساس معاملے میں جس سرد مہری کا ثبوت دیا ہے، عدالتوں اور کمیشنوں نے جس بے حسی کے ساتھ اس کیس کو نظر انداز کیا ہے اس سے انصاف کا تقدس داغ دار ہوا ہے، یہ داغ موجودہ کارروائی سے دھلنے والا نہیں ہے، یہ عجیب بات ہے کہ بابری مسجد کی شہادت کا معاملہ برسوں سے انصاف کا منتظر ہے اور اس کے ردّ عمل میں ہونے والے بعض واقعات منطقی انجام کو پہنچ چکے ہیں اور ان کے مجرمین کو سزا بھی ہو چکی ہے، انصاف کا یہ دوہرا پیمانہ ایک ایسے ملک میں جہاں قانون کی حکمرانی ہو اور جسے جمہوریت اور سیکولرزم کا سب سے بڑا علمبردار کہا جاتا ہو بہت کچھ سوچنے اور کہنے پر مجبور کرتا ہے، ان حالات میں یقین کے ساتھ یہ کہنا مشکل ہے کہ جن ملزمین پر فرد جرم عائد کی گئی ہے ان کو سزا بھی ملے گی یا نہیں، کہا جا رہا ہے کہ سیاسی طالع آزماؤں نے اپنے حقیر مفادات کی خاطر اس مقدمے کو متحرک کیا ہے، جب یہ مفادات پورے ہو جائیں گے صورت حال پھر وہی ہو جائے گی جو آج سے ایک ماہ پہلے تھی۔

بابری مسجد مغل بادشاہ ظہیر الدین محمد بابر (۱۴۸۳ء-۱۵۳۱ء) کے دربار سے منسلک ایک معروف شخص میر باقی نے ۱۵۲۷ء میں اتر پردیش کے قصبہ اجودھیا میں تعمیر کرائی تھی، یہ مسجد اسلامی مغل فن تعمیر کا شاہ کار تھی، تین سو پچیس سال تک مسجد کی آئینی حیثیت کو عوامی، حکومتی یا عدالتی سطح پر چیلنج نہیں کیا گیا، ۱۸۵۳ء میں پہلی بار ہندوؤں کی طرف سے یہ دعوی کیا گیا کہ بابری مسجد کے احاطے میں کسی جگہ رام چندر جی کا جنم استھان اور سیتا جی کی رسوئی ہے، یہ دور

ہندوستان میں انگریزوں کے عروج کا دور تھا، مسلمانوں کی حکومت ختم ہو چکی تھی مسلم ریاستیں اپنے وجود کے لیے انگریزوں کی کاسہ لیسی پر مجبور تھیں، نواب واجد علی شاہ اس علاقے کا حکمراں تھا، برطانوی استعمار کے خلاف مسلمانوں کی مزاحمت کا زور توڑنے کے لیے انگریزوں نے یہ پالیسی اپنائی تھی کہ ہندو اور مسلمانوں کو ایک دوسرے کے ساتھ الجھا دیا جائے، بابری مسجد کی زمین پر رام جنم بھومی اور سیتا رسوئی کا تصور اسی پالیسی کا شاخسانہ ہے، حیرت انگیز بات یہ ہے کہ ہندوؤں کے پاس اپنے دعوے کے حق میں کوئی دستاویزی ثبوت نہیں تھا، ایک بدھسٹ نجومی کے ذریعے ان دونوں جگہوں کی نشان دہی کرائی گئی، اور نقی علی خاں کو واسطہ بنا کر جو واجد علی شاہ کا خسر اور حکومت میں وزیر تھا انگریزوں نے نواب کو اس بات پر آمادہ کرلیا کہ بابری مسجد کے احاطے میں رام جنم استھان اور سیتا کی رسوئی کی جگہ دیدی جائے تاکہ ہندو مسلم جھگڑوں کا جو سلسلہ شروع ہوا ہے وہ رُک جائے، چنانچہ مسجد کے مسقّف حصّے کے بالمقابل صحن مسجد سے باہر مشرق کی جانب اکیس فٹ لمبی اور سترہ فٹ چوڑی جگہ دیدی گئی جس پر اسی وقت سے پوجا پاٹ کا سلسلہ شروع ہو گیا، ۱۹۴۹ء تک صورت حال میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی، ۲۲ دسمبر ۱۹۴۹ء کی رات میں جب کہ مسجد پوری طرح بند تھی ہنومان گڑھی کا مہنت آبھے رام داس اپنے پچاس ساٹھ چیلوں کے ساتھ احاطے کی دیوار پھاند کر مسجد میں داخل ہوا اور اس نے رام کی مورتی جسے وہ اپنے ساتھ لے کر آیا تھا مسجد کی محراب میں رکھدی، اگلی صبح ایودھیا میں یہ مشہور کر دیا گیا کہ رام جی مسجد میں پرکٹ ہوئے ہیں، اس لیے وہی جگہ رام جی کا جنم استھان ہے، تھانے میں ایف آئی آر درج ہوئی، اس میں صاف لکھا ہے کہ پچاس ساٹھ افراد قفل توڑ کر، دیواروں اور سیڑھیوں کو پھاند کر مسجد کے اندر داخل ہوئے اور انھوں نے مسجد کے اندر شری رام جی کا بت رکھ کر مسجد کی پوترتا کو نقصان پہنچایا، اس وقت مرکز میں جواہر لال نہرو وزیر اعظم اور یوپی میں پنڈٹ گووند بلبھ پنت وزیر اعلی تھے، دونوں جگہ کانگریس کی حکومت تھی، مولانا ابوالکلام آزاد، رفیع احمد قدوائی، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی جیسے بھاری بھرکم مسلم لیڈر موجود تھے، ان حضرات نے کوشش بھی کی، لیکن نہ پنڈت نہرو نے دلچسپی دکھائی

اور نہ بلبھ پنت نے انصاف کا ساتھ دیا، اس کے بجائے مسجد کو متنازعہ قرار دے کر تالا ڈال دیا گیا، یہ مسجد اسی وقت سے ناانصافی کا شکار ہے۔

۱۹۸۰ء کے دہے تک آر ایس ایس اور دوسری بھگوا تنظیمیں محراب مسجد میں رام جی کے پرکٹ ہونے کے جھوٹے دعوے کو معجزے کے طور پر پھیلاتی رہیں، آر ایس ایس کے ترجمان ہفتہ وار ''آرگنائزر'' نے اپنے ۲۹/ مارچ کے شمارے میں لکھا تھا کہ ''۲۳ دسمبر ۱۹۴۹ء کی تاریخی صبح شری رام چندر اور سیتا دیوی کی مورتیاں معجزاتی طور پر ظاہر ہوئیں، ہندو عقیدت منداس واقع پر خوشی اور مسرت کے جذبات ظاہر کرنے کے لیے ہزاروں کی تعداد میں اس مقام پر جمع ہوئے لیکن بدقسمتی سے حکومت نے فرقہ وارانہ فسادات پھوٹ پڑنے کے خوف سے اس جگہ کو متنازع قرار دے دیا اور اس کے دروازوں پر تالا ڈال دیا'' حالاں کہ یہ ایک منصوبہ بند سازش تھی اور اس سازش کے تحت رام کی مورتی باہر سے لاکر رکھی گئی تھی، مشہور سیاست داں اور رام مندر بنائے جانے کے بڑے حامی ڈاکٹر سبرا نیم سوامی نے ۱۳ مارچ ۱۹۹۳ء کو حیدرآباد میں اپنی تقریر کے دوران کہا تھا کہ ''۲۲/ دسمبر ۱۹۴۹ء کی رات مورتیوں کا رکھنا ایک مجرمانہ حرکت تھی، جنھوں نے یہ کام کیا وہ مجرم تھے'' سابق وزیر اعظم پی وی نرسمہاراؤ نے بھی جنھوں نے بابری مسجد کی شہادت میں اہم کردار ادا کیا تھا اور جو اس کی جگہ رام مندر دیکھنا چاہتے تھے اس واقعے پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ ''اس سرد رات ایک تھیلا جس میں دریائے سرجو کا پانی تھا اور رام لالہ کے بت تھے رام چبوترے سے بابری مسجد کی جانب لے جایا گیا'' جسٹس سدھیر اگروال جو بابری مسجد کے مقدمے کی سماعت کررہے تھے وہ اپنے فیصلے میں لکھ چکے ہیں ''ہم کو یہ فیصلہ تحریر کرنے میں کوئی پس وپیش نہیں ہے کہ متنازعہ عمارت کے درمیانی گنبد کے نیچے ۲۲/۲۳ دسمبر ۱۹۴۹ء کی رات مورتیاں لاکر رکھی گئیں'' (ایودھیا کا تنازعہ مصنفہ عبدالرحیم قریشی، ص: ۸، ۹، ۱۱۷) افسوس! اکثریت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اس مجرمانہ فعل کو عقیدے اور استھا سے جوڑ دیا گیا اور سارے حقائق نظر انداز کردئے گئے۔

۱۹۸۴ء میں وشو ہندو پریشد کی جانب سے رام کی جائے پیدائش کو آزاد کرانے کے لیے تحریک کا اعلان کیا گیا، بی جے پی کے لیڈر ایل کے اڈوانی نے اس تحریک کی قیادت سنبھالی،

کانگریسی حکومت کے وزیر اعظم راجیو گاندھی نے ۱۹۸۶ء میں ہندوؤں کو پوجا پاٹ کی اجازت دیدی اور مسلمانوں کو نماز سے محروم رکھا، نتیجہ یہ نکلا کہ رام مندر کی تحریک زور پکڑتی چلی گئی اور ۶/ دسمبر۱۹۹۲ء کو ہزاروں شر پسندوں نے ایودھیا میں جمع ہو کر مسجد کو شہید کر دیا، اس وقت یہ تمام لوگ وہاں موجود تھے جن پر فرد جرم عائد کی گئی ہے، وہ چاہتے تو شر پسندوں کو روک بھی سکتے تھے، پولیس اور پی اے سی کے ہزاروں افراد وہاں ڈیوٹی پر تھے لیکن سب کھڑے تماشا دیکھتے رہے، مرکز میں کانگریس کی حکومت تھی نرسمہاراؤ وزیر اعظم تھے، یوپی میں بی جے پی کی حکومت تھی اور کلیان سنگھ وزیر اعلی تھے، دونوں حکومتوں نے اپنی ذمہ داری نہیں نبھائی، یہ تاریخ کا سیاہ ترین دن تھا، اگلے دن کے ہندی اور انگریزی اخبارات نے اپنی روایتی تعصب کے باوجود اس طرح کی سرخیاں لگائیں قوم کے لیے شرمناک (انڈیا ٹوڈے) بہت بڑا فریب (دی ویک) ایودھیا میں حقوق کی پامالی (دی ہندو ڈیلی) قومی دھوکہ (دی انڈین ایکسپریس) جمہوریت کے نام پر داغ (دی ٹائمز آف انڈیا) باعث شرم (دی ہندوستان ٹائمز) وزیر اعظم نرسمہاراؤ نے قوم کو یقین دلایا تھا کہ مسجد اسی جگہ بنائی جائے گی، لیکن وہ اپنا وعدہ نبھانے میں ناکام رہے، اس کے بجائے ان کی حکومت نے لبراہن کمیشن قائم کر کے معاملے کو طول دینے کی کوشش کی، ۱۷/ سال بعد اس کمیشن نے اپنی رپورٹ پیش کی جس میں اس نے آر ایس ایس اور دوسری ہندو تنظیموں کو ذمہ دار ٹھہرایا لیکن منموہن حکومت نے چار ماہ تک اس رپورٹ کو دبائے رکھا، عدالتوں میں مقدمے کی رفتار چیونٹی کی چال سے آگے بڑھی، سی بی آئی کی عدالت نے ۲۰۰۱ء میں اس کیس سے مجرمانہ سازش کی دفعہ نکال دی، اور مقدمے کو بے جان کر دیا، اب ۲۰۱۷ء میں سپریم کورٹ کی مداخلت پر یہ دفعہ دوبارہ شامل کی گئی ہے، اور ملزمین کو عدالت میں طلب کیا گیا ہے، سپریم کورٹ کا حکم تو یہ ہے کہ مقدمہ دو سال میں نمٹا دیا جائے لیکن کیا ایسا ہوگا، اور اگر ایسا ہو بھی گیا تو کیا واقعی ملزمین کے خلاف کیس ثابت ہو پائے گا؟ اگر ۱۹۴۹ء سے ۲۰۱۷ء تک کے حالات پر نظر ڈالی جائے تو ان سوالات کا جواب نفی میں ہوگا، اس کے باوجود ہمیں سی بی آئی عدالت کی اس کاروائی کا خیر مقدم کرنا چاہئے، مایوسی کے اندھیروں میں امید کی ایک ہلکی سی کرن چمکی تو سہی!

مشکلیں امت مرحوم کی آساں کردے

مغربی یوپی کے ایک مشہورومعروف مدرسے کے بارے میں خبرآئی ہے کہ وہاں نماز فجر میں قنوت نازلہ پڑھنے کا سلسلہ شروع کردیا گیا ہے، اچھی خبر ہے، قنوت نازلہ کی مشروعیت کچھ اسی طرح کے احوال وظروف کے لئے ہے، امام ابوجعفر طحاویؒ فرماتے ہیں کہ کسی مصیبت کے وقوع اور بلا کے نزول کے وقت صرف فجر کی نماز میں آخری رکعت کے رکوع کے بعد قنوتِ نازلہ پڑھی جائے، امام بلند آواز سے یہ قنوت پڑھے اور مقتدی آہستہ آہستہ آمین کہیں، مصیبتوں اور بلاؤں سے حفاظت کے لئے یہ مؤثر روحانی تدبیر ہے، اور ایک مسنون عمل بھی، موجودہ حالات میں اس کونظر انداز نہ کرنا چاہئے، راقم نے اپنی طالب علمی کے زمانے میں حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کودارالعلوم دیوبند کی مسجد میں قنوت نازلہ پڑھتے ہوئے سنا ہے، یہ ان دنوں کی بات ہے جب ملک میں اس وقت کی وزیراعظم مسز اندرا گاندھی نے ایمرجنسی نافذ کردی تھی، اور ولی عہد سلطنت سنجے گاندھی نے خاندانی منصوبہ بندی کے عنوان پر مسلمانوں کی جبری نس بندی کا سلسلہ شروع کرکے ان کا ناطقہ بند کردیا تھا، چاروں طرف خوف کا عالم طاری تھا، لوگ دھڑ ادھڑ داخلِ زنداں کئے جارہے تھے، ان مشکل حالات میں دارالعلوم دیوبند نے پہل کی اور اپنی مسجد میں قنوت نازلہ کا سلسلہ شروع کیا، راقم نے دو تین ماہ پہلے ایک بڑے مدرسے کے ذمہ دار سے ان کے دفتر میں جاکر قنوتِ نازلہ کی تجویز رکھی تھی، اس وقت مدرسے کے ایک استاذ بھی وہاں تشریف فرماتھے، میری تجویز سے انہوں نے اس حد تک تو اتفاق کیا کہ واقعتاً ایسے حالات میں قنوت نازلہ پڑھی جانی چاہئے، لیکن یہ کہہ کر معذرت بھی کردی کہ ہم ہی میں سے کچھ لوگ اس کی خبر حکومت تک پہنچادیں گے، اس سے مدرسے کے لئے مشکلات بھی پیدا ہوسکتی ہیں، اس وقت مجھے احساس ہوا کہ ان دنوں ہم خوف، مایوسی اور بزدلی کے کس قدر نازک دور سے گزر رہے ہیں، میرا خیال ہے کہ خوف کی یہ کیفیت تو شاید ۱۹۴۷ء میں بھی پیش نہ آئی ہوگی، حالاں کہ وہ وقت بھی بڑا سخت تھا، ملک تقسیم ہورہا تھا، نقل مکانی کا سلسلہ شروع ہوچکا تھا، لوگ اجڑ کر اِدھر سے اُدھر بھاگ رہے تھے،

مسلمان مہاجرین پر حملے ہو رہے تھے، مگر ان حالات میں بھی مسلمان مایوسی اور خوف میں مبتلا نہیں ہوئے، اس کا ثبوت یہ ہے کہ مسلمانوں کی جتنی تعداد مملکت خداداد گئی اس سے کہیں بڑی تعداد یہیں رہ گئی، حالاں کہ اس وقت سرحدیں کھلی ہوئی تھیں، یہ لوگ جو آج تقسیم وطن کے ناکردہ گناہ کی سزا بھگت رہے ہیں ترکِ وطن کر کے پاکستان جاسکتے تھے، لیکن وطن کی محبت ان کے پاؤں کی زنجیر بن گئی، انھوں نے خلوص دل کے ساتھ یہ فیصلہ کیا کہ وہ زندگی بھر یہیں رہیں گے، مرنے کے بعد بھی اسی کی خاک کا پیوند بن جائیں گے، ستر سال میں پہلی بار ایسا ہو رہا ہے کہ ان کے پیروں میں بندھی زنجیر توڑنے کی کوشش کی جارہی ہے، انہیں پاکستانی ہونے کا طعنہ دیا جارہا ہے اور ان سے کہا جارہا ہے کہ وہ اس ملک سے چلے جائیں، حالاں کہ یہ بات بالکل طے ہے کہ حب الوطنی کی جو زنجیر ان کے پاؤں میں پڑی ہے وہ کسی کو توڑنے سے ٹوٹنے والی نہیں ہے۔

اس وقت پورے ملک میں مسلم دشمنی کی لہر چل رہی ہے، شاید ہی ارضِ وطن کا کوئی خطہ ایسا ہو جہاں مسلمان امن وسکون کے ساتھ رہ رہے ہوں، حالات اس قدر خراب ہیں کہ مسلم شناخت کے ساتھ سفر کرنا دشوار ہوگیا ہے، فقرہ کشی سے بڑھ کر نوبت اب زدوکوب تک جا پہنچی ہے، بعض اوقات تشدد کا نشانہ بننے والے افراد زندگی سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں، جیسا کہ اخلاق کے ساتھ ہوا، پہلو خاں کے ساتھ ہوا، علیم الدین اور عثمان کے ساتھ ہوا، حافظ جنید کے ساتھ ہوا، یہ وہ لوگ ہیں اور ان کے علاوہ بھی کئی لوگ ہیں جنہوں نے بھیڑ کے ذریعے تشدد میں اپنی جان گنوائی ہے، زخمی ہونے والوں کی تعداد تو شمار بھی نہیں کی جاسکتی، یہ بے رحم قاتل درندے عورتوں اور بچوں کو بھی نہیں بخش رہے ہیں، مین پوری میں چلتی ٹرین کے اندر سفر کے دوران ایک مسلم کنبے کے ساتھ مار پیٹ کا واقعہ اس کا ثبوت ہے، مسلم دشمنی اس حد تک بڑھ چکی ہے کہ معمولی معمولی بات پر لوگ آستینیں سونت لیتے ہیں، اور خنجر نکال لیتے ہیں، بات اخلاق کے گھر میں بیف کی افواہ سے شروع ہوئی تھی، بڑھتے بڑھتے ٹرین کی سیٹ تک پھیل چکی ہے، آپ پہلے سے اپنی نشست پر بیٹھے ہوئے ہیں، اچانک چند لوگ ٹرین میں سوار ہوتے

ہیں اگر آپ نے ان کو اپنی سیٹ پیش نہ کی تو وہ آپ کے ساتھ کچھ بھی کر سکتے ہیں، بل کہ بعض اوقات تو سیٹ دینے کے باوجود بھی ان لوگوں کے تشدد کا شکار ہو سکتے ہیں، جیسا کہ حافظ جنید کے ساتھ ہوا کہ وہ خالی ٹرین میں اپنے بھائی کے ساتھ سوار ہوا، جب بھیڑ بڑھنے لگی تو اس نے ایک شخص کو اس کی طلب پر اپنی سیٹ بیٹھنے کے لئے دے دی، اس کے باوجود وہ ان لوگوں کے غصّے کا نشانہ بن گیا، کیوں کہ وہ اور اس کا بھائی سر سے پاؤں تک اسلامی شناخت لئے ہوئے تھے، صورت حال اس حد تک بگڑ چکی ہے کہ اگر آپ جنید شہید کی یا کسی اخلاق اور پہلو خاں کی حمایت میں کوئی لفظ بولیں گے تب بھی آپ بھیڑ کے عتاب کا شکار ہو جائیں گے، مین پوری میں یہی ہوا، شدت پسند جنونی اب ان لوگوں کو بھی نہیں چھوڑ رہے ہیں جو سیاست میں ان کا ہم رکاب ہیں مگر کیوں کہ وہ مسلمان ہیں، اس لئے ان کا قصور قابل معافی نہیں ہے، ان کے اسکوٹر کی ڈگی کھلوا کر دیکھی جا رہی ہے اور اس میں رکھے ہوئے مٹن کو بیف کہہ کر بی جے پی کے مسلم کارکن کو عبرت ناک سزا بھی دی جا رہی ہے۔

تشویش کی بات یہ ہے کہ اب موب لنچنگ کا نشانہ وہ لوگ بن رہے ہیں جو مذہبی شناخت رکھتے ہیں، امرناتھ یاترا پر حملے کے خلاف احتجاج کے دوران ہریانہ کے حصار میں ایک مسجد کے امام کو ان کے حجرے سے نکال کر لایا گیا اور ان کے ساتھ بدسلوکی کی گئی، اسی طرح بھاگلپور سے خبر آئی ہے کہ ٹرین میں بیٹھے ہوئے ایک امام گلزار احمد کو ان کی سیٹ سے بھیڑ نے یہ کہہ کر اٹھا دیا کہ مسلمانوں کو سیٹ پر بیٹھنے کا کوئی حق نہیں ہے، صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا گیا بل کہ امام صاحب کو مار پیٹ کر ٹرین سے باہر نکال دیا گیا، مجبوراً وہ دوسرے ڈبے میں گھسے اور دروازے سے لٹک کر انھوں نے اپنا باقی سفر پورا کیا، ملک کی موجودہ صورت حال پر بنگال کی وزیر اعلا ممتا بنرجی کا یہ تبصرہ کہ پورے ملک میں انارکی، ناانصافی اور لاقانونیت کا بول بالا ہے؛ حالات کی صحیح منظر کشی ہے، اگر چہ وزیر اعظم بھی اب بولنے لگے ہیں مگر بھگوا غنڈوں پر ان کی فہمائش بالکل بے اثر ثابت ہو رہی ہے، پارلیمنٹ کے رواں اجلاس سے قبل اپنی پارٹی کی میٹنگ میں انہوں نے گائے ماتا کی حفاظت کے جذبے کو سراہا لیکن اس کی آڑ میں قانون

شکنی کو نا قابل برداشت بھی قرار دیا، انہوں نے ریاستی حکومتوں سے کہا کہ گئو رکشا کے نام پر تشدد پھیلانے والوں کو بخشا نہیں جانا چاہئے، اس طرح کے بیانات پہلے بھی دیئے جا چکے ہیں اور آئندہ بھی دئے جائیں گے، لیکن گئو رکشکوں پر یا دوسرے شدت پسند عناصر پر ان بیانات کا کوئی اثر ہونے والا نہیں ہے، کیوں کہ وہ یہ بات اچھی طرح جانتے ہیں کہ ان کے خلاف کوئی کاروائی نہیں ہوگی، اور اگر کسی وجہ سے کہیں کوئی تشدد پسند گرفت میں آ بھی گیا تو جیل سے لے کر عدالت تک کے کسی بھی مرحلے میں اس کو کسی پریشانی کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا، پولیس تفتیش میں رپورٹ کی خامیاں، گواہوں کے فقدان اور عدالت کے نرم رویّے انہیں باعزت بری کر دیں گے، اخلاق اور پہلو خاں کے معاملے میں یہی ہوا، کچھ وقت کے لئے ملزمین بند ضرور ہوئے مگر اب آزاد گھوم رہے ہیں، حالات نہایت حوصلہ شکن ہیں، مسلمانوں کی ہمت جواب دیتی جارہی ہے، مزاحمت اور دفاع کی سکت بھی اب ان میں باقی نہیں رہی، ان حالات میں صرف یہی ایک تدبیر باقی رہ جاتی ہے کہ مسلمان اللہ کی طرف رجوع کریں، اور اس کی بارگاہ میں عاجزی اور فروتنی کے ساتھ گڑ گڑائیں، قنوت نازلہ ایسے ہی ہمت شکن حالات کے لئے مسنون ہوئی ہے، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اجتماعی مصیبت کے وقت قنوت نازلہ کا اہتمام فرمایا ہے، بخاری شریف میں حضرت انس بن مالکؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مہینے تک فجر کی نماز میں قنوت نازلہ پڑھی اور بعض قبائلِ عرب کے خلاف بد دعا فرمائی، قنوت نازلہ صرف مساجد ہی میں نہیں گھروں میں بھی پڑھی جاسکتی ہے، اس کے لئے نماز باجماعت بھی شرط نہیں، مقیم، مسافر، امام، مقتدی، منفرد، مرد، عورت سب لوگ اس دعا کا اہتمام کرسکتے ہیں، اور امت مرحوم کے لئے مشکلات سے گلو خلاصی کی دعا مانگ سکتے ہیں۔

عرصۂ حیات تنگ کرنے کی کوشش

یوپی کا انتخاب جیتنے کے بعد بے جے پی اور اس سے ملتے جلتے نظریات کی حامل تنظیموں کے حوصلے بلند سے بلندتر ہوتے جارہے ہیں، وزیراعلا آدتیہ ناتھ یوگی نے اپنے اقتدار کے آغاز میں ہی یہ واضح کردیا تھا کہ ان کی سمت سفر کیا ہے اور منزل کونسی ہے، سب سے پہلے انھوں نے گوشت کے کاروبار کو نشانہ بنایا جو مسلمانوں کے ایک بڑے طبقے کے لیے اقتصادی شہ رگ کی حیثیت رکھتا ہے، یہ صحیح ہے کہ ذبیحہ خانوں کے سلسلے میں پچھلی حکومتوں کی لاپرواہی نے یوپی میں گوشت کا بحران پیدا کیا ہے، آج پورے صوبے کے بڑے سے بڑے شہر اور چھوٹے سے چھوٹے قصبے کے تمام ذبیحہ خانے غیر قانونی قرار دے کر بند کئے جا چکے ہیں، اس کے نتیجے میں ہزاروں دکانوں پر قفل لگ چکا ہے اور لاکھوں لوگ جن کی روزی روٹی اس کاروبار سے وابستہ تھی بے روزگاری کی مار جھیل رہے ہیں، حکومت نے جو اصولی اور رہنما ہدایات ذبیحہ خانوں اور گوشت کی دکانوں کے لیے جاری کی ہیں وہ اگرچہ حفظان صحت کے نقطہ نظر سے درست ہیں لیکن سردست ان پر عمل کرنا مشکل ہی نظر آرہا ہے، ایسا لگتا ہے کہ یوگی حکومت اس شہ رگ کو ہی کاٹ دینا چاہتی ہے، اس صورت میں وہ اپنے ہندو ووٹروں کو یہ یقین دلانے میں کامیاب ہوگئی ہے کہ اس نے اپنے مینوفسٹو میں کئے گئے وعدے کے مطابق ”قتل خانے“ بند کردئے ہیں اور ”جیوہتھیا“ پر پابندی لگادی ہے، اگر گوشت بندی کا سلسلہ اسی طرح جاری رہا تو یوپی کی وہ اڑتیس کمپنیاں اپنا کام اور زیادہ سہولت اور منفعت کے ساتھ انجام دیتی رہیں گی جن میں سے پینتیس ہندو گھرانوں کی ملکیت ہیں، گوشت کی آڑ میں جس طرح قریشی بھائیوں کے گھروں پر چھاپہ ماری کی جارہی ہے اور ان کے نوجوان لڑکوں کو پابہ جولاں کیا جارہا ہے یہ بڑی تشویش ناک صورت حال ہے، اس سے پتہ چلتا ہے کہ حکومت کا مقصد ذبیحہ کاروبار کو قانون کے دائرے میں لانا نہیں ہے بل کہ اس کو ختم کرنا ہے، مسٹر یوگی اپنے ایک انٹرویو میں صاف کہہ چکے ہیں کہ لوگوں کو شاکاہاری (سبزی خور) ہونا چاہئے، میرے خیال سے وہ مستقبل کے اترپردیش کو گوشت سے پاک دیکھنے کی خواہش رکھتے ہیں، گوشت کے

معاملے میں سنبھل میں فساد ہو چکا ہے اور حسب سابق مورد الزام مسلمان ہی ٹھہرے ہیں، رات کی تاریکی میں ایک درجن مسلم نوجوانوں کو گرفتار کر کے جیل بھیج دیا گیا ہے، ہاپوڑ اور رامپور میں بھی پولیس کو ان قریشیوں کی تلاش ہے جو ممنوعہ جانور کاٹنے کے ''جرم'' میں ملوث رہے ہیں، اگر واقعتاً حکومت اس کاروبار کو قانون کے دائرے میں لانا چاہتی ہے اور ذبیحہ خانوں کو ماحولیات سے ہم آہنگ کرنا چاہتی ہے تو اسے چاہئے کہ وہ کو ذبیحہ خانوں کے قیام کے لیے مالی امداد فراہم کرے اور نوکر شاہوں کو اس بات کے لیے پابند کرے کہ وہ پرانے اجازت ناموں کی تجدید اور نئے اجازت ناموں کے اجراء کے عمل کو ممکنہ حد تک آسان بنائیں تاکہ جلد سے جلد یہ تعطل دور ہو سکے، ابھی گوشت کے سلسلے میں وزیر اعلا یوگی کے نادر شاہی فرمان کی صدائے بازگشت تھمنے بھی نہ پائی تھی کہ بی جے پی کے ممبر پارلیمنٹ مسٹر سبرا نیم سوامی بابری مسجد کے معاملے کو لے کر سپریم کورٹ جا پہنچے، حالاں کہ وہ نہ اس مسئلے میں فریق ہیں، اور نہ گواہ ہیں، سپریم کورٹ نے ان کی اس دخل اندازی پر ناگواری کا اظہار بھی کیا ہے مگر سپریم کورٹ کے معزز جج یہ مشورہ بھی دے بیٹھے کہ بابری مسجد کا مسئلہ باہمی گفت وشنید کے ذریعے حل کرلیا جائے، اس سلسلے میں وہ ثالثی کا رول بھی ادا کرنے کے لیے تیار ہیں، سپریم کورٹ کے اس مشورے پر تمام ہندو تنظیموں نے اپنی رضامندی ظاہر کی ہے، یہاں تک کہ یو پی کے نئے وزیر اعلا مسٹر یوگی بھی کہہ رہے ہیں کہ یہ مسئلہ بات چیت سے حل ہونا چاہئے، انھوں نے یہ بھی کہا ہے کہ وہ اس طرح کی ممکنہ بات چیت کے عمل میں اپنا پورا تعاون پیش کریں گے، حسب توقع مسلمانوں کا ردّ عمل ویسا ہی رہا جیسا ہونا چاہئے تھا، مسلمانوں کی بدقسمتی یہ ہے کہ ملت کے قائدین خالص ملّی مسائل پر بھی ذاتی مصلحتوں کی چادر تان دیتے ہیں، اس معاملے میں بھی کچھ ایسا ہی ہوا، قاعدے کی بات یہ تھی کہ تمام قائدین کو صرف ایک بات کہنی تھی کہ یہ معاملہ پچیس برسوں سے عدالت میں ہے، کئی مرتبہ دونوں فریق مذاکرات کی میز پر بیٹھ کر ناکام اٹھ چکے ہیں، اب یہ مناسب نہیں ہے کہ عدالتی کارروائی کو روک کر پھر بات چیت کی جائے، یوں بھی بات چیت وہاں کامیاب ہوتی ہے جہاں فریق مخالف کے رویّے میں لچک ہو، جہاں

آستھا کا سوال ہو وہاں لچک ممکن ہی نہیں، پھر بات چیت سے کیا حاصل ہوگا، اب تو صرف ایک ہی راستہ بچتا ہے کہ عدالت اپنا فیصلہ سنا دے، مسلمان پہلے ہی ملک کو اور عدالت کو یہ یقین دلا چکے ہیں کہ بابری مسجد کے سلسلے میں کورٹ کا فیصلہ کچھ بھی ہو مسلمان اس کو قبول کریں گے، مسئلے کی حساسیت کے باوجود بعض قائدین ملت کی یہ رائے کہ بابری مسجد کے قضیے میں گفت وشنید کی جاسکتی ہے مسلمانوں کے متحدہ موقف کو کمزور کرنے والی ہے، سیدھی سچی بات یہ ہے کہ اب بات چیت کا وقت گزر چکا ہے اور ماضی کے تجربات کی روشنی میں کوئی بات چیت مفید ثابت ہونے والی نہیں ہے، موجودہ حالات میں صرف عدالت عالیہ ہی فیصلہ کرسکتی ہے جو اسے جلد از جلد کر دینا چاہئے تاکہ ملک بابری مسجد اور رام مندر کے قضیے سے نکل کر کچھ اور سوچنے کے قابل ہو سکے۔

تین طلاق کا مسئلہ بھی ملت اسلامیہ کے لیے سوہانِ روح بنا ہوا ہے، اس مسئلے میں حکومتوں یا عدالتوں کی مداخلت کا کوئی اخلاقی یا قانونی جواز نہیں ہے، آئین ہند نے ہمیں اپنے پرسنل لا پر عمل کرنے کی اجازت دی ہے، یہ ہمیں طے کرنا ہے کہ ہم کس سے نکاح کریں، کیسے نکاح کریں، کس کو طلاق دیں اور کس طرح طلاق دیں، چودہ سو سال سے تین طلاقوں کو تین مانا جارہا ہے، مسلمانوں کے چاروں فقہی مسلک تین طلاقوں کو تین مانتے ہیں، غیر مقلدین عمل کی حد تک تین کو ایک مانتے ہیں لیکن دوسرے مسلکوں میں اس کے وجود کی نفی وہ بھی نہیں کرتے، ان حالات میں حکومت کی غیر ضروری دلچسپی سے یہ معاملہ بھی الجھتا جارہا ہے، اب معاملہ یہاں تک آپہنچا ہے کہ دو تین عورتیں کسی صوبائی وزیر اعلا کے دربار میں پہنچ کر تین طلاقوں کے خلاف واویلا مچاتی ہیں ان کا قانون فوراً حرکت میں آجاتا ہے، حالاں کہ ابھی عدالت نے اس کے قانونی یا غیر قانونی ہونے کا فیصلہ بھی نہیں سنایا کہ تین طلاق دینے والے شوہر قانون کی گرفت میں آگئے، یہ کہاں کا انصاف ہے، چند نام نہاد خواتین کی فریاد اتنی مؤثر ثابت ہورہی ہے، اور وہ محضر نامے وزارت قانون نے ردّی کی ٹوکری میں ڈال دئے ہیں، جن پر دو کروڑ سے زیادہ مسلم خواتین نے دستخط کئے ہیں اور ان کے ذریعے حکومت پر واضح کردیا ہے کہ وہ

شریعت اسلامیہ پر مکمل یقین رکھتی ہیں اور انہیں اسلام کے نظام نکاح وطلاق کی معقولیت پر پورا اطمینان ہے، مسلم تنظیموں کی ہزار وضاحتوں کے بعد بھی حکومت ہند نے سپریم کورٹ میں طلاق ثلاثہ کے حوالے سے رٹ داخل کر دی، عدالت کو بھی اس مسئلے سے اس قدر دلچسپی ہے کہ وہ گرمیوں کی تعطیلات میں بھی ۱۱/ مئی سے ہر روز اس کی سماعت کرنا چاہتی ہے، کیا واقعی اس ملک میں مسلم خواتین کا صرف یہی ایک مسئلہ ہے جو لاینحل رہ گیا ہے، یا کچھ اور مسائل بھی ہیں جن پر حکومتوں کی نظر کرم ہونی چاہئے، سب سے زیادہ اہم مسئلہ تو سماجی تحفظ کا ہے جو بلاتفریق مذہب اس ملک کی خواتین کو حاصل ہی نہیں ہے، اس کے بعد تعلیم کا مسئلہ ہے، آج بھی لاکھوں مسلم بچیاں تعلیم سے محض اس لیے محروم ہیں کہ انہیں سازگار ماحول اور مالی وسائل میسر نہیں ہیں، حکومتوں اور عدالتوں کو چاہئے کہ پہلے وہ اس طرح کے سماجی مسئلوں پر توجہ دے، تین طلاق تو کوئی مسئلہ ہے ہی نہیں، ایک سروے کے مطابق مسلمانوں میں تین طلاق کے معاملات کا تناسب تین فی صد سے بھی کم ہے، ظاہر کچھ ایسا کیا جارہا ہے کہ شاید ہر مسلم شوہر اپنی منکوحہ کو تین طلاقوں کی تیز چھری سے ذبح کرنے میں لگا ہوا ہے۔

یوپی میں یوگی کے وزیر اعلا بننے کے بعد آر ایس ایس کی آئیڈیالوجی پر چلنے والی تنظیموں کے کارکن خود کو بے تاج بادشاہ سمجھنے لگے ہیں، غیر قانونی ذبیحہ خانوں کی بندش کے بعد چکن، مٹن، اور فش حتی کہ انڈے کی دکانوں پر ان بے تاج بادشاہوں کے قہر سے تو کچھ ایسا ہی اشارہ ملتا ہے کہ اب پولیس کا کام یہ لوگ کریں گے، ان کی جسارت یہاں تک بڑھ گئی ہے کہ وہ عدالتی کارروائی کے لیے لائے گئے ایک ملزم پر پولیس کے موجودگی میں محض اس لیے حملہ کر دیتے ہیں کہ ملزم کا تعلق دیوبند جیسے شہر سے ہے، اور وہ ایک مشہور سیاسی اور دینی گھرانے کا فرد ہے، اگرچہ پولیس نے حملہ آوروں کے خلاف سنگین دفعات میں رپورٹ درج کر لی ہے لیکن ابھی تک ایک کے علاوہ کوئی اور ملزم گرفت میں نہیں آسکا، دوسری طرف مظفر نگر کے ایک اسکولی طالب علم ذاکر علی کو محض اس لیے گرفتار کر لیا گیا کہ اس نے اپنے فیس بک اکاؤنٹ پر ایک شہید پولیس اہلکار کی ڈی پی لگا رکھی تھی اور اس نے وزیر اعلا یوگی کے متعلق کچھ لکھ دیا تھا،

ان حالات میں اس کے علاوہ اور کیا کہا جاسکتا ہے کہ اس ملک میں مسلمانوں پر عرصۂ حیات تنگ کرنے کی کوشش کی جارہی ہے، اب یہ ہمارے قائدین کو سوچنا ہے کہ وہ ان نازک حالات سے نکلنے کے لیے کیا مشترکہ حکمت عملی تیار کرتے ہیں، ویسے اس طرح کی امید کم ہی ہے کہ قائدین ملت کسی ایک مشترکہ حکمت عملی تک پہنچنے میں کامیاب ہوجائیں گے، اس سلسلے میں مجلس مشاورت کی اوّلین کوشش ناکام ہوچکی ہے، دوسری اور تیسری کوششیں بھی ناکام ہی رہیں گی، ماضی سے تو کچھ ایسا ہی سبق ملتا ہے۔

مولانا اسرار الحق قاسمی کا سیاسی کارنامہ

یہ کہنا کہ موجودہ سیاست کے لیے اسلام میں کوئی رہ نمائی نہیں ہے غلط ہے، اسلام جامع اور مکمل دین ہے، اس کی تعلیمات عام ہیں، نہ کسی خاص مدت کے لیے ہیں اور نہ کسی خاص طبقے تک محدود ہیں، زمان ومکان کی لامحدود وسعتوں تک اسلامی تعلیمات کا دائرہ وسیع ہے، اگر دیکھا جائے تو شریعت کا تنہا یہ اصول ہی موجودہ انتخابی منظر نامے میں ہماری رہ نمائی کے لیے کافی ہے اور ہم اس کی بنیاد پر اپنے لیے صحیح راستہ منتخب کر سکتے ہیں۔

یہ صحیح ہے کہ موجودہ سیاست میں کچھ خرابیاں ہیں، مگر ہمیں اس ملک میں رہنا ہے، اس لیے اس ملک کی جمہوری سیاست کو اس کی خرابیوں کے ساتھ اپنائے بغیر چارہ نہیں ہے، علمائے کرام کو چاہیے کہ وہ اپنی ذمہ داری سمجھیں اور مسلمانوں کی رہ نمائی کے لیے سامنے آئیں اور انہیں یہ بتلائیں کہ مسلمانوں کے لیے خیر کا اور بھلائی کا راستہ وہ ہے جو اس ملک کی آئینی جمہوریت اور دستوری سیکولرزم کا ہے اور ظلم کا راستہ وہ ہے جس پر مسلمانوں کے کھلے دشمن چل رہے ہیں، موجودہ انتخابی منظر نامے میں ہمیں ان دو راستوں میں سے صحیح راستے کا انتخاب کرنا ہے، اسی میں مسلمانوں کی بقا ہے اور اسی میں ملک کی سیکولر روایات کا تحفظ ہے۔

یہ بڑی خوش آئند بات ہے کہ ہمارے بعض علماء اس ضمن میں نہ صرف یہ کہ مسلمانوں کی شرعی رہ نمائی کر رہے ہیں، بلکہ عملی طور پر بھی سیاست کے اس کارزار میں حصہ لے کر جد جہد کرنے میں مصروف ہیں، ان علماء میں ایک اہم ترین نام حضرت مولانا اسرار الحق قاسمی کا ہے، جو اپنے ضعف، پیرانہ سالی، اور گونا گوں امراض کے باوجود نوجوانوں کا سا حوصلہ رکھتے ہیں، مولانا عُمر کی اس منزل میں ہیں جہاں راہی تھک کر بیٹھ جاتا ہے، لیکن ان کا عزم ابھی جوان ہے، ملت کے لیے کچھ کرنے کا جذبہ انھیں آرام سے بیٹھنے نہیں دیتا، ان کی پوری زندگی جہد مسلسل سے عبارت ہے، ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ وہ ان علاقوں کے مسلمانوں میں تعلیمی بیداری پیدا کرنے کی کامیاب کوششوں میں مصروف ہیں، جہاں تعلیمی اور اقتصادی پس ماندگی ملک کے باقی علاقوں کے مقابلے میں کچھ زیادہ ہی پائی جاتی ہے، مولانا کا حلقہ انتخاب کشن گنج بھی ایسے ہی پس ماندہ علاقوں میں سے ایک ہے، سیمانچل کا یہ وہ خطہ ہے جہاں مسلمانوں کی بڑی تعداد رہتی ہے، لیکن یہ مسلمان تعلیمی اور اقتصادی اعتبار سے انتہائی بچھڑے

ہوئے ہیں، مولانا نے اس علاقے میں تعلیمی بیداری کی مہم چلا کر یہاں کے مسلمانوں کی زندگی کو ایک نیا رُخ عطا کیا ہے، ضرورت تھی اس بات کی کہ اس علاقے کے مسلمانوں کی تعلیمی اور اقتصادی پس ماندگی دور کرنے کے لیے کوئی ایسا کام کیا جائے جس کے اثرات وسیع تر بھی ہوں اور دیر پا بھی، سیمانچل کے مسلمانوں کو مولانا اسرار الحق قاسمی کا شکر گزار ہونا چاہئے کہ انھوں نے اس علاقے میں اے ایم یو (علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی) کی شاخ قائم کرانے میں کامیابی حاصل کر لی ہے، یہ مولانا اسرار الحق قاسمی کا ایسا کارنامہ ہے جسے ملت اسلامیہ ہند کی تاریخ کبھی فراموش نہیں کر سکتی، یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ اگر مولانا اسرار الحق قاسمی اپنی اس تحریک کو پورے خلوص اور مکمل ایمان داری کے ساتھ اپنے منطقی انجام تک نہ پہنچاتے تو کشن گنج میں اے ایم یو سینٹر کا قیام کبھی عمل میں نہ آتا، مسلمانوں کو مولانا کے اس کارنامے کی قدر کرنی چاہئے، انھوں نے نہ صرف یہ کہ مسلمانوں میں بیداری پیدا کی، بلکہ علاقے کے مسلمانوں کے درمیان جو مسلکی اور نظریاتی اختلاف ترقی اور اتحاد کی راہ میں سنگ گراں بنا ہوا تھا اپنی کوششوں سے اسے بھی ہٹا دیا، آج الحمد للہ کشن گنج بلکہ پورے سیمانچل کا مسلمان مولانا قاسمی کی قیادت میں بلا اختلاف مسلک ومشرب آگے بڑھ رہا ہے، کشن گنج کو یہ تعلیمی تحفہ مل چکا ہے، لیکن وہاں کے بہت سے لوگوں کو شاید اس کا احساس نہ ہو کہ اس عظیم مقصد کے لیے مولانا نے کس قدر قربانیاں دی ہیں، انھوں نے اس مقصد کو عظیم عوامی تحریک کی شکل دی، ایک وقت ایسا بھی آیا کہ بہار کی نتیش حکومت نے ان کے خلاف گرفتاری کا وارنٹ جاری کر دیا، لیکن مولانا اس وارنٹ سے نہ ڈرے، نہ گھبرائے، نہ انھوں نے ہمت ہاری، نہ کوئی دباؤ قبول کیا، نہ اپنے مقصد سے پیچھے ہٹے، بلکہ انھوں نے ببانگ دہل یہ اعلان کیا کہ جہاں تک وہ پہنچ چکے ہیں وہاں سے ان کی واپسی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، حکومت چاہے تو وہ انھیں گرفتار کر کے جیل کی سلاخوں کے پیچھے ڈال سکتی ہے، قید زنداں ان کے لیے کوئی نئی بات نہ ہوگی، ان کے سلف، ان کے اکابر ملی اور قومی مقاصد کے لیے جیل جا چکے ہیں، وہ بھی جانے کے لیے تیار ہیں۔

مولانا اسرار الحق قاسمی کی اس جرأت کو بھی ہمیں سلام کرنا چاہئے کہ انھوں نے خود اپنی پارٹی کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی، یہ واقعہ تاریخ سیاست کا بالکل انوکھا واقعہ ہے،

کسی پارٹی کا کوئی ادنیٰ ممبر بھی اپنی حکومت کے خلاف آواز بلند نہیں کرتا، چہ جائے کہ پارلیمنٹ کا ممبر اپنی منتخب حکومت کے خلاف آواز اٹھائے، اس طرح کی آوازیں ہمیشہ بغاوت سمجھی جاتی ہیں، ان کی پارٹی انھیں اس جرأت پر سزا دے کر پارٹی سے باہر بھی کرسکتی تھی، یا کم از کم انھیں الیکشن کے ٹکٹ سے محروم کرسکتی تھی، لیکن مولانا نے نہ حال کی پرواہ کی اور نہ مستقبل کی، مولانا چاہتے تھے کہ اے ایم یو سینٹر کا قیام جلد از جلد عمل میں آجائے، لیکن نوکر شاہی ذہنیت اس سلسلے میں رکاوٹیں پیدا کررہی تھی، ایک مرحلے پر جب اس کی فائل راشٹر پتی بھون میں کہیں جاکر دب گئی تو مولانا کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوا اٹھا، اور وہ کشن گنج کے ہزاروں عوام کو لے کر دہلی پہنچ گئے، جہاں انھوں نے جنتر منتر پر خود اپنی حکومت کے خلاف دھرنا دے کر سچی جمہوریت اور بے مثال جرأت کا قابل تقلید نمونہ پیش کیا، اس تحریک کے دوران مولانا دل کی بیماری میں بھی مبتلا تھے، اور انہی دنوں اوپن ہارٹ سرجری کے مرحلے سے بھی گزر رہے تھے، ڈاکٹروں کی ہدایت تھی کہ وہ آرام کریں مگر انھوں نے کسی کی ایک نہ سُنی، بلکہ صرف اپنے دل کی آواز سنی اور اسی حالت میں کشن گنج جا پہنچے، انھوں نے اس تحریک کو گاؤں گاؤں پہنچا دیا، اور لاکھوں کی بھیڑ کو سڑکوں پر لاکر حکومت کو مجبور کردیا کہ وہ سنٹر کے قیام میں حائل تمام مالی اور قانونی رکاوٹیں دور کرے، بالآخر حکومت مولانا کی تحریک کے آگے مجبور ہوگئی، تمام رکاوٹیں دور ہوئیں اور ۳ جنوری ۲۰۱۴ء کو یہ تحریک اس وقت کامیابی سے ہم کنار ہوگئی جب یو پی اے کی چیئر پرسن مسز سونیا گاندھی نے کشن گنج پہنچ کر اے ایم یو کے سنٹر کا سنگ بنیاد رکھا اور لاکھوں کی بھیڑ نے تالیاں بجا کر اس بوڑھے، بیمار اور ضعیف مرد آہن کے فولادی ارادوں کو سلام کیا۔

آج وہی مرد آہن پھر کشن گنج کے مسلمانوں اور سیکولر عوام کے درمیان موجود ہے، الیکشن کی ہماہمی ہے غلط فہمیوں اور مغالطہ انگیزیوں کا بازار گرم ہے، یہاں کے سیکولر لوگوں کو ایک بار پھر یہ فیصلہ کرنا ہے کہ وہ اپنے مستقبل کی باگ ڈور کس کے ہاتھ میں دینا چاہتے ہیں، کیا کسی ایسے شخص کے ہاتھ میں جو علاقے میں فرقہ پرستی کی آگ بھڑکا کر اتحاد کو پارہ پارہ کرنا چاہتا ہے، یا ایسے شخص کے ہاتھوں میں سونپنا چاہتے ہیں جس کی بے داغ اور صاف ستھری سیاست اور آئینے کی طرح صاف ستھرے کردار نے علاقے کو تعمیر وترقی کی راہ پر گامزن کردیا ہے۔

مثبت سوچ یا خاموشی؟

ہمارے ملک کے سب سے بڑے اور سیاسی اعتبار سے نہایت اہمیت کے حامل صوبے اتر پردیش میں اسمبلی انتخابات کے نتائج آ چکے ہیں، یہ نتائج کافی کچھ چونکا دینے والے ہیں، کسی کو بھی بل کہ خود بی جے پی کو بھی یہ امید نہیں رہی ہوگی کہ وہ تین چوتھائی نشستیں حاصل کر کے تاریخی فتح سے ہم کنار ہوگی، بلاشبہ یہ کامیابی تمام امیدوں اور توقعات کے برخلاف حاصل ہوئی ہے، تمام سیاسی پارٹیاں مودی لہر میں خس وخاشاک کی طرح بہہ گئی ہیں، جب الیکشن کا عمل شروع ہوا تھا اس وقت ان کالموں میں کئی مرتبہ لکھا گیا کہ ہوا کا رُخ صحیح نہیں ہے، سماج وادی پارٹی ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہے، اکھلیش نے باپ اور چچا کے خلاف بغاوت کا جو بگل بجایا ہے آنے والے انتخابات میں اسے اس بغاوت کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا، وہ وقت کی نبض نہ پہچان پائے، انہیں یہ خوش گمانی رہی کہ انھوں نے صوبے میں جو ترقیاتی کام کرائے ہیں وہ ان کو دوبارہ وزیر اعلا کی کرسی پر بٹھا دیں گے، کنبے میں ٹوٹ پھوٹ سے ہونے والے نقصان کی تلافی کے لیے انھوں نے کانگریس کا ہاتھ تھاما، اور اس پارٹی کے شہزادے راہل گاندھی کے ساتھ روڈ شو کر کے صوبے کے عوام بالخصوص نو جوانوں کو یہ پیغام دینا چاہا کہ اب بوڑھوں کا زمانہ لد چکا ہے اور آنے والے دن نو جوانوں کے ہیں، انھوں نے اپنی بیوی ڈمپل یادو کو بھی تشہیری مہم میں لگایا تا کہ ان کی موجودگی سے خواتین میں سماج وادی پارٹی کے تئیں نرم گوشہ پیدا ہو، مگر یہ تمام کوششیں رائگاں ہوگئیں، کام بولتا ہے اور ہاتھ کا ساتھ جیسے دلکش نعرے ہوا میں تحلیل ہو گئے، اکھلیش نے اور ان کو بغاوت پر اُکسانے والے چچا رام گوپال یادو نے خواب میں بھی نہ سوچا ہوگا کہ ان کی پارٹی کی یہ درگت بنے گی، وہ خود تو ڈوبے ہی ہیں کانگریس کو بھی انھوں نے گہری کھائی میں دھکیل دیا ہے، یہاں تک کہ وہ امیٹھی اور رائے بریلی جیسے روایتی حلقوں میں بھی شکست فاش سے دو چار ہوگئی ہے۔

ان حالات میں ہماری سوچی سمجھی رائے یہ تھی کہ مسلمانوں کو اس بار اپنا رُخ بدلنا چاہئے اور مایاوتی کی اپیل پر کان دھرنے چاہئیں جو برابر مسلمانوں کو بہوجن سماج پارٹی کی

طرف مائل کرنے کی کوشش کررہی تھیں، اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اپنے پانچ سالہ دور حکومت میں اکھلیش نے مسلمانوں کے لیے کچھ نہیں کیا، مسلمانوں کو چاہئے تھا کہ وہ اکھلیش کو اس کی بے عملی کی سزا دیتے، مگر ایسا نہ ہوسکا، اس الیکشن میں مسلمان جس بے سمتی کا شکار ہوئے ہیں اور جس طرح ان کے ووٹ بے اثر ہوئے ہیں اس کی کبھی امید نہیں کی جاسکتی تھی، اس کی بڑی وجہ ہمارے علماء کرام اور قائدین عظام کی وہ مختلف اپیلیں تھیں جو مسلمانوں میں کنفیوژن پیدا کررہی تھیں، مسلمان آخر تک یہ کنفیوژن دور نہیں کرپائے اور جس نے جدھر بہتر سمجھا اُدھر اپنا رخ کرلیا، ان حالات میں یہی ہونا تھا جو ہوا، لیکن اتنا طے ہے کہ کوئی بھی نام نہاد سیکولر جماعت اس مرتبہ اپنی شکست کا ٹھیکرا مسلمانوں کے سر پر نہیں پھوڑ پائے گی، کیوں کہ جو کچھ ہوا اس میں مسلمانوں کے بہ جائے خود ان کا قصور زیادہ ہے، اس پورے دورانیے میں سماج وادی پارٹی اپنی مسلم نواز شبیہ سے پیچھا چھڑانے میں لگی رہی، یہاں تک کہ اکھلیش کے اسٹیج پر کہیں بھی کوئی داڑھی ٹوپی والا نظر نہیں آسکا، حد تو یہ ہے کہ انھوں نے اپنا اسٹیج اعظم خاں سے بھی شیئر کرنے کی کوشش نہیں کی، مسلمانوں کے لیے ان کی زبان سے کوئی ایک لفظ نہیں نکلا، پارٹی کے مینوفسٹو میں بھی مسلم کے بجائے اقلیت کا لفظ استعمال کیا گیا اس کے باوجود مسلمان سماج وادی کے پیچھے لگا رہا، اکھلیش اور ڈمپل کی ریلیوں میں بھی بھیڑ مسلمانوں سے رہی اور ان کا بڑا ووٹ سماج وادی کو پڑا، دوسری طرف مایاوتی نے مسلمانوں کو اپنی طرف راغب کرنے کا کام دیر سے شروع کیا، مسلمانوں کا بڑا طبقہ اکھلیش کو ان داتا سمجھ کر اپنا ذہن سماج وادی پارٹی کے حق میں بنا چکا تھا اس کے باوجود ان سیٹوں پر مسلمان دو حصوں میں تقسیم نظر آئے جہاں بہوجن سماج پارٹی نے مسلم امیدوار کھڑے کئے تھے، اس کا مطلب یہ ہوا کہ مسلم ووٹ اگرچہ بھاری تعداد میں سماج وادی/کانگریس امیدواروں کے حق میں گیا ہے مگر بہوجن سماج پارٹی بھی ان کے ووٹوں سے محروم نہیں رہی۔

مسلمانوں نے اپنا کردار ادا کیا ہے، اگرچہ ان کا کچھ ووٹ منتشر بھی ہوا، مگر زیادہ تر ووٹ سماج وادی کے حق میں اس کی تمام تر کج ادائیوں کے باوجود گیا ہے، اس کے باوجود ان

پارٹیوں کوشکست فاش ہوئی، اس کی مختلف وجوہات سامنے آرہی ہیں، سیاسی بصیرت رکھنے والوں کا کہنا یہ ہے کہ سماج وادی کے پاس دو بنک ووٹ تھے، یادو اور مسلمان، اس مرتبہ بی جے پی یادو ووٹ بنک میں نقب لگانے میں کامیاب رہی ہے، دوسری طرف بی جے پی کا یہ بھی دعوی ہے کہ اس الیکشن میں دلت بھی بڑی تعداد میں پھول کی طرف گیا ہے، جاٹ بیلٹ پر اجیت سنگھ بھی ناکام رہے، کیوں کہ جاٹ بھی بی جے پی میں چلے گئے ہیں، اس صورت حال نے بی جے پی کو تین سو چوبیس سیٹوں پر پہنچادیا اور باقی تمام پارٹیوں کو سو سے بھی کم سیٹوں کے اندر سمیٹ کر رکھ دیا، ان حالات میں کسی پارٹی کی یہ ہمت نہیں ہے کہ وہ مسلمانوں کو مورد الزام ٹھہرائے، مسلمان ہمیشہ کی طرح اس مرتبہ بھی سیکولرزم کا جھنڈا اتھامے کھڑے رہے، لیکن یادو، دلت اور جاٹ اپنی اپنی پارٹیوں سے باغی ہو گئے، دوسری بڑی وجہ یہ رہی کہ سماج وادی پارٹی اور کانگریس اگرچہ بہ ظاہر ایک ساتھ الیکشن لڑ رہی تھیں مگر زمینی سطح پر صورت حال دوسری تھی، متعدد سیٹوں پر ان دونوں پارٹیوں میں دوستانہ مقابلہ ہوا، اور بہت سی سیٹوں پر سماج وادیوں نے کانگریس کو اور کانگریسیوں نے سماج وادی کو ہرانے میں ایڑی چوٹی کا زور لگادیا، گویا دونوں پارٹیوں کے کارکنان نے اس ملاپ کو غیر فطری سمجھ کر مسترد کرنے کی کوشش کی۔

اس صورت حال سے اگرچہ مسلمان ووٹ بے اثر ہوا ہے، اور ستر برسوں میں پہلی دفعہ ایسا ہوا ہے کہ بادشاہ گر ہونے کی ان کی حیثیت ختم ہوئی ہے، سماج وادی اور بہوجن کے چکر میں پڑ کر مسلمانوں نے اپنے ہی پچاسی امیدواروں کو دوسرے نمبر پر پہنچا دیا ہے، مگر یہ صورت حال مسلمانوں سے زیادہ ان پارٹیوں کے لیے لمحۂ فکر ہے جو ہمیشہ مسلمانوں کو ووٹ بنک کی طرح استعمال کرتی آئی ہیں، اور بی جے پی کا ہوا دکھا کر ان کا ووٹ لے کر اقتدار کی دہلیز تک پہنچتی رہی ہیں، اقتدار پر قابض ہونے کے بعد مسلمانوں کو ان پارٹیوں نے جس طرح نظر انداز کیا تاریخ سیاست میں اس کی نظیر نہیں ملتی، برسہا برس تک کانگریس یہی کرتی رہی، بل کہ یہ کہنا زیادہ بہتر ہے کہ مسلمانوں کی لاشوں پر راج کرتی رہی، کانگریس سے مایوس ہونے کے بعد مسلمانوں نے کبھی سماج وادی کو نجات دہندہ سمجھا اور کبھی بہوجن سماج پارٹی کو اپنا

مسیحا جانا، وہ باری باری ان کو اقتدار کے ذائقے چکھاتے رہے، اور بدلے میں صرف وعدے پاتے رہے، مسلمان آج بھی ان کے ساتھ کھڑا ہے، اگر چہ جن طبقات کو ان پارٹیوں نے اپنے دور حکومت میں انعامات سے نوازا وہ بی جے پی کی تیز رو میں بہہ گئے، ان پارٹیوں کو سوچنا چاہئے کہ اپنے سیاسی وجود کی بقا کے لیے انہیں آگے کیا کرنا ہے، سیکولرزم کو بچانے کی ذمہ داری صرف مسلمانوں پر ہی کیوں ڈالی جائے۔

یوپی میں بی جے پی کے اقتدار میں آنے سے مسلمانوں کا خوف اور مایوسی فطری ہے، کیوں کہ بی جے پی کی پوری سیاست کا محور مسلم دشمنی ہے، مسلمانوں کو ڈر ہے کہ بی جے پی اپنے سیاسی ایجنڈے پر عمل کرے گی، اس سلسلے میں ہمیں یہ کہنا ہے کہ مسلمانوں کو مایوس ہونے اور ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، قوموں کی زندگی میں اس طرح کے مراحل آتے رہتے ہیں، بہادر اور سمجھ دار قوم وہی ہے جو وقت کی نزاکتوں کو سمجھے اور ان مرحلوں سے سلامتی کے ساتھ گزرنے کے طریقے تلاش کرے، اب تک ہم نے بی جے پی کو شجر ممنوعہ سمجھا ہے، مگر اب جب کہ بی جے پی اقتدار پر قابض ہوتی چلی جارہی ہے اور مرکز سے لے کر ریاستوں تک تیزی کے ساتھ اس کے اقتدار کا دائرہ وسیع تر ہوتا چلا جارہا ہے بی جے پی کے بارے میں مسلمانوں کو اپنے نقطۂ نظر میں کچھ نہ کچھ مثبت تبدیلی لانی پڑے گی، ماضی میں جو کچھ ہوا وہ یقیناً بہت برا تھا، لیکن مستقبل میں ایسا کچھ نہ ہو اس پر بھی نظر رہنی چاہئے، سوشل میڈیا پر آج کل جس طرح کے تبصرے چل رہے ہیں، اور بعض لوگ جس طرح کے منفی بیانات دے رہے ہیں وہ کچھ زیادہ بہتر نہیں ہیں، اب مسلمان یا تو خاموش رہیں یا پھر مثبت سوچ کا مظاہرہ کریں، بی جے پی کو کوسنا، اس پر تبرّا بھیجنا یا شکست سے مایوس ہوکر سینہ کوبی کرنا مناسب نہیں ہے، مرکز میں بی جے پی کے برسر اقتدار آنے کے بعد ہی صورت حال میں تبدیلی لانے کی کوشش کرنی چاہئے تھی، جو بعض قائدین ملت کے سخت رویّے کے باعث ممکن نہ ہوسکی، اب یوپی میں اس کے مکمل طور پر آجانے کے بعد اس تبدیلی کی کچھ زیادہ ہی ضرورت محسوس ہورہی ہے، میں یہ نہیں کہتا کہ مسلمان بی جے پی میں شامل ہوجائیں، اور جے شری رام کے نعرے لگائیں، بل

کہ صرف اتنی درخواست ہے کہ بی جے پی کو بھی باقی پارٹیوں کے نظریئے سے دیکھنے کی کوشش کریں، آخران پارٹیوں نے ہمیں دیا ہی کیا ہے ہم ان کی محبت کے جوش میں بی جے پی کی مخالفت کیوں کرتے رہیں، مدھیہ پردیش اور گجرات کے مسلمانوں کا عمل لائق تقلید نہ سہی غور وفکر کے لائق ضرور ہے کہ وہ لوگ انتخابی سیاست میں بی جے پی کو اب اچھوت خیال نہیں کرتے، حال ہی میں مہاراشٹر میں بھی مسلمانوں نے شیوسنا کو ووٹ دے کر باقی ملک کے مسلمانوں کو مثبت سوچ کی دعوت دی ہے ہمیں بھی اپنی سوچ میں اس طرح کی تبدیلی لانی ہوگی۔

تسلی کی بات یہ ہے کہ یوپی کا الیکشن جیتنے کے بعد وزیر اعظم مودی اور بی جے پی صدر امت شاہ کچھ بدلے بدلے سے نظر آرہے ہیں، انتخابی عمل کے دوران جن لوگوں نے قبرستان، شمشان، دیوالی اور عید کی بات کی تھی وہ ہماری سرکار سب کی سرکار کے نعرے کے ساتھ سامنے آئے ہیں، ہمیں اس تبدیلی کو خوش آمدید کہنا چاہئے، ہوسکتا ہے ہمارا یہی عمل مستقبل میں مثبت تبدیلی کا نقطۂ آغاز بن جائے۔

بہار کی سیاست اور فتوے کی طاقت

سیاست میں کب کون کس کا ساتھ چھوڑ دے اور کس کے ساتھ چل دے اس کے متعلق یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا، سیاست دانوں کی نہ دوستی میں بوئے وفا ہوتی ہے اور نہ دشمنی میں پائے داری اور استواری، یہ صرف مفادات کا کھیل ہے، اس میدان میں بازی وہی شخص مار سکتا ہے جس نے اپنی آنکھوں پر بے شرمی کے ٹھیکرے رکھ لیے ہوں اور ضمیر کو کسی سردخانے کے حوالے کر دیا ہو، بہار کے وزیر اعلیٰ نتیش کمار ابن الوقتی، خودغرضی اور ضمیر فروشی کی تازہ مثال ہیں، حالاں کہ وہ پہلے بھی فرقہ پرستوں کے زیر سایہ حکومت کر چکے ہیں، مگر گذشتہ الیکشن میں انھوں نے سیکولر جماعتوں کے ساتھ مل کر ایک ''مہا گٹھ بندھن'' قائم کر لیا تھا، تمام لوگ نتیش کے اس قدم کو گھر واپسی سمجھ رہے تھے لیکن جہاں دیدہ اور تجربہ کار لوگوں کی نظر میں ان کا یہ اقدام بھی ان کی دیرینہ فطرت کا غماز تھا، انہیں پتہ تھا کہ فرقہ پرستوں سے ہاتھ ملا کر جو غلطی وہ کر چکے ہیں اس غلطی کو سدھارنے کے لئے انہیں نام نہاد سیکولرزم کا مکھوٹا لگا کر سامنے آنا ہوگا، انھوں نے سیکولر طاقتوں کے ساتھ مل کر کامیابی تو حاصل کر لی اور وہ بہار میں دوبارہ وزارت اعلا کے منصب پر متمکن بھی ہوگئے، لیکن ان کی فطرت کا جو رنگ ڈھنگ تھا وہ نہیں بدلا، آج وہ پھر بی جے پی کے ساتھ کھڑے ہوئے ہیں، حالاں کہ انہیں جو مینڈیٹ ملا تھا وہ بی جے پی کے خلاف ملا تھا، اگر ان میں غیرت کی ذرا سی بھی رمق ہوتی یا ان کے پاس ضمیر نام کی کوئی چیز ہوتی تو وہ دوبارہ قوم کے پاس جاتے اور ان سے بی جے پی کے حق میں تائید چاہتے، کتنی عجیب بات ہے کہ وہ کل تک مودی کو ہٹلر اور ظالم جیسے خطابات سے نواز رہے تھے اور آج انہیں قوم کا مسیحا اور ملک کا مستقبل کہہ کر یاد کر رہے ہیں، انہیں اپنے اس فعل پر نہ کوئی پشیمانی ہے نہ ندامت، اسی لئے ہم کہہ چکے ہیں کہ سیاست خودغرضی کا کھیل ہے، پچھلی چند دہائیوں سے ملکی سیاست سے اخلاقی قدروں کا پورے طور پر خاتمہ ہو چکا ہے، چور، اچکے، غنڈے، قاتل، زانی اس میدان میں سرگرم عمل ہیں، حکومتیں، قیادتیں، وزارتیں سب ان کے پاس ہیں، شاید ہی کوئی شریف انسان محض قوم اور وطن کی خدمت کے جذبے سے سرشار ہو کر

سیاست داں بنتا ہو، خود مسٹر نتیش جن کی شبیہہ سیاست دانوں میں بہت بہتر بتلائی جاتی ہے قتل کے ایک مقدمے میں نامزد کئے گئے ہیں، انھوں نے لالو یادو کے بیٹے نائب وزیر اعلا تیجسوی سے نجات پانے کے لئے وزیر اعلا کا عہدہ چھوڑنے کا ڈرامہ کیا، اور وجہ یہ بیان کی کہ وہ تیجسوی جیسے بے ایمانوں کے ساتھ نہیں چل سکتے، مگر انھوں نے اپنی نئی کابینہ میں جن ممبران اسمبلی کو وزارتیں بخشی ہیں ان میں سے بہت سوں پر تعزیرات ہند کی سنگین دفعات میں کئی کئی مقدمات قائم ہیں اور وہ خود بھی قتل کے مقدمے میں ماخوذ ہیں، اسے سیاست کی بوالعجبی نہیں تو کیا کہیں گے۔

لوگ وزارت کی شکل میں حاصل ہونے والی چند روزہ عزت کے عوض ایمان تک کا سودا کر لیتے ہیں، یہ بھی موجودہ دور کی سیاست کا ایک غلیظ اور تاریک پہلو ہے، حالاں کہ ایمان سے بڑھ کر نہ کوئی دولت ہے اور نہ کوئی نعمت ہے، نتیش کی جماعت کے ایک مسلم ممبر اسمبلی نے محض اس لئے کہ اسے نئی کابینہ میں کوئی اچھی وزارت حاصل ہو جائے اور وہ اپنے پرانے آقا کے ساتھ ساتھ نئے آقاؤں کا بھی منظور نظر بن جائے اپنے ایمان کو جس طرح رسوا کیا اس نے ہندوستان کے تمام مسلمانوں کا سر شرم سے جھکا دیا ہے، پٹنہ کے ایک مفتی صاحب نے ان کے خلاف فتوی دیا تب بھی وہ یہی کہتے رہے کہ انھوں نے رام رحیم کے حوالے سے جو کچھ کہا ہے اور جے شری رام کا نعرہ لگا کر انہوں نے ملک وقوم کو جو پیغام دینا چاہا ہے وہ اس پر قائم ہیں، وہ فتوی کے بعد بھی میڈیا کے سامنے آئے اور انہوں نے یہی کہا کہ وہ ایک بار نہیں ہزار بار جے شری رام کا نعرہ لگائیں گے، انہوں نے یہ بھی کہا کہ وہ رام و رحیم میں کوئی فرق نہیں کرتے، وہ یہ بھی کہتے سنے گئے کہ انہوں نے مختلف مٹھوں اور ہندو مندروں میں جا کر ماتھا ٹیکا ہے اور منت مانی ہے، میڈیا کے روبرو ہونے تک فتوی کا کوئی اثر خورشید عرف فیروز احمد پر نظر نہیں آیا، البتہ مسٹر نتیش جیسے گرگ جہاں دیدہ کو نظر آ گیا کہ اس شخص کی بے وقوفی سے مسلمان ناراض ہوں گے اس لئے انھوں نے خورشید کو جم کر ڈانٹ پلائی اور حکم دیا کہ وہ اپنی اس حرکت کے لئے معافی مانگے، بہ ہر حال خورشید احمد مفتی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے معافی مانگی اور

دوبارہ کلمہ پڑھ کر اسلام میں داخل ہوئے، اب یہ تو وہ ہی جانتے ہوں گے کہ انہوں نے سچے دل سے کلمہ پڑھا ہے یا تنیش کی ناراضگی دور کرنے کے لیئے تائب ہوئے ہیں، اس کا فیصلہ نہ ہم کر سکتے ہیں، نہ کرنا چاہئے کیوں کہ یہ صرف ان کے اور اللہ کے درمیان کا معاملہ ہے، کوئی شخص کسی کا دل چیر کر نہیں دیکھ سکتا۔

منتری مہودے کی نعرہ بازی پر بھگوا میڈیا کا رویہ حسب معمول افسوس ناک رہا، پہلے تو اس نے خوشی سے بغلیں بجائیں، اور جب فتوی آیا تو آسمان سر پر اٹھالیا، خورشید کی توبہ تلّا سے اس کا پارہ ساتویں آسمان پر پہنچ گیا، میڈیا مذہب کو فرد کا حق سمجھتا ہے، بلاشبہ یہ فرد کا حق ہے کہ وہ کوئی بھی دین اختیار کرے، اس سلسلے میں اسلام کسی جبر اور زور وزبردستی کا قائل نہیں لیکن اگر کوئی شخص اسلام قبول کرلیتا ہے تو اسے اب مذہب کے اصولوں پر چلنا ہوگا، انہی اصولوں میں سے ایک اصول یہ ہے کہ وہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرے، یہ وہ عقیدۂ توحید ہے جو دین اسلام کو دوسرے ادیان سے ممتاز کرتا ہے، جیسے ہی کوئی شخص اس بنیادی عقیدے سے انحراف کرتا ہے دائرۂ اسلام سے باہر نکل جاتا ہے، آپ خورشید کی ویڈیو دیکھیں وہ کھلم کھلا رحیم کے ساتھ رام کو شریک کررہا ہے، اس نے مندروں میں ماتھا ٹیکنے اور بتوں کے سامنے منتیں ماننے کا اعتراف کیا ہے، اس صورت میں وہ مسلمان کب رہ جاتا ہے، مفتی صاحب نے صحیح کیا کہ جو اس کے خلاف ارتداد کا فتوی جاری کرکے اسے آئینہ دکھادیا، یہ دین ہے، مذاق نہیں ہے، کسی کو حق نہیں کہ وہ رام کا جاپ جپے اور مسلمان کہلائے، مندروں میں جا کر منت مانے اور اسلام پر چلنے کا دعوی کرے، ہم یہ وضاحت بھگوا میڈیا کے لیئے نہیں کررہے ہیں کہ نہ اس تک ہماری بات پہنچ سکتی ہے اور نہ ہماری وضاحت سے اس کے موقف میں کسی مثبت تبدیلی کی امید کی جاسکتی ہے، یہ وضاحت ان سادہ لوح مسلمانوں کے لیئے ہے جو سمجھتے ہیں کہ دین ایک مضبوط عقیدے کا نام ہے جو اس طرح کی خرافات سے کمزور نہیں پڑتا، بلاشبہ دین ایک مضبوط عقیدے کا نام ہے، مگر یہ اسی وقت تک مضبوط ہے جب تک آپ اسے دین کے بنیادی اصولوں کی قوت سے استحکام بخشے ہوئے ہیں، جیسے ہی کسی مسلمان کا قول وفعل ان

بنیادی اصولوں کے دائرے سے نکلتا ہے یہ عقیدہ کمزور پڑ جاتا ہے، بل کہ کمزور ہوکر زمین بوس ہو جاتا ہے۔

قرآن کریم میں صاف اعلان ہے کہ کلمہ کفر کہنے سے بھی کوئی شخص مسلمان باقی نہیں رہتا، چہ جائیکہ عملِ کفر کرے، ایمان کے بعد کفر اختیار کرنا بہت بڑا جرم ہے، قرآن کریم میں جگہ جگہ اس حوالے سے وعیدیں آئی ہیں، یہ بہت نازک اور حساس معاملہ ہے، مذاق میں بھی آدمی کوئی ایسا لفظ نہ کہے، یا کوئی ایسا عمل نہ کرے جس سے عقیدۂ توحید پر ضرب پڑتی ہو، رواداری اپنی جگہ ہے مگر دین کی قیمت پر کسی طرح کی رواداری قابل تعریف نہیں ہے، دائرۂ اسلام سے نکلنے کے بعد سب سے پہلی زد اس کے رشتہ ازدواج پر پڑتی ہے، شریعت کا ایک اصول جو قرآن کریم سے ثابت ہے یہ بھی ہے کہ کوئی مسلمان عورت کسی غیر مسلم مرد کے نکاح میں نہیں رہ سکتی، یہی حکم مسلمان مرد اور غیر مسلم عورت کے لئے بھی ہے، خورشید کے تجدید نکاح کے حوالے سے بھی میڈیا زہر اگل رہا ہے، اسے اگلنے دیجئے، اس کے چیخنے چلانے سے قرآن وحدیث کے احکام نہیں بدل سکتے، مفتی صاحب نے خورشید کے فسخ نکاح کے سلسلے میں جو فتوی جاری کیا تھا وہ بالکل درست تھا، خورشید کی بیوی نے شریعت کے حکم کی تعمیل میں اس سے علیحدگی اختیار کی، سسرال والوں نے خورشید سے تعلق منقطع کرنے کا اعلان کیا، خورشید کی توبہ اور اسلام میں اس کی واپسی یہ سب وہ واقعات ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ اس گئے گزرے دور میں بھی مسلمان کو اسلام سے زیادہ کوئی چیز عزیز نہیں ہے، بھگوا میڈیا کتنا بھی شور مچائے اس پورے واقعے سے یہ ثابت ہو گیا ہے کہ فتوے میں بڑی طاقت ہے، حالاں کہ یہ کسی بڑے ادارے کا فتوی نہیں تھا بل کہ صرف ایک مفتی کا فتوی تھا جو انھوں نے اپنی ذاتی حیثیت میں دیا تھا، مگر اس فتوے نے بھی نتیش جیسے چالاک سیاست داں کو بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا، اس سے بڑھ کر فتوے کی کامیابی اور کیا ہو سکتی ہے۔

ہوئے تم دوست جس کے

اِسلامی ملکوں میں سعودی عرب کواس لیے اہمیت حاصل ہے کہ وہاں حرمین شریفین ہیں، جن سے دنیا کا ہر مسلمان عقیدت ومحبت رکھتا ہے، وہاں کے فرماں رواؤں کوعزت وتوقیر کی نظر سے دیکھا جاتا ہے کیوں کہ وہ ان دونوں مقدس مقامات کے نگہبان ہیں، یہی وجہ ہے کہ دنیا بھر کے مسلمان سعودی عرب کے ہر اقدام کی تائید کرتے ہیں، اس کی انگلی میں ایک کانٹا بھی چبھ جائے تو وہ اپنے دل میں اس کی ٹیس محسوس کرتے ہیں، یمن کی آئینی حکومت کے تحفظ کی خاطر حوثی باغیوں کی سرکوبی کے لیے سعودی فوجی اتحاد کے جنگی جہاز جب تک یمن کی فضاؤں میں محو پرواز رہے تمام مسلمانوں کے ہاتھ دعا کے لیے اٹھے رہے، سعودی حکومت نے ایران سے اپنے دوطرفہ تعلقات منقطع کیے تو ہر مسلمان نے خوشی کے شادیانے بجائے، پاکستان کے ریٹائرڈ جنرل راحیل شریف کی قیادت میں پینتس اسلامی ملکوں کا عظیم تر فوجی اتحاد بنایا گیا تو شاید ہی کوئی مسلمان ایسا ہوگا جس نے سعودی حکومت کے اس فیصلے کا استقبال نہ کیا ہو اور اسے شاہ سلمان کی دانش مندی اور بصیرت سے تعبیر نہ کیا ہو، امریکہ کے نئے صدر ڈونلڈ ٹرمپ کی مسلم دشمنی عالم آشکارا ہے، اس کے باوجود سعودی عرب کی راجدھانی ریاض میں ان کا پرجوش استقبال کیا گیا، ان کی ضیافت پر ملینوں ڈالر خرچ کردیے گئے اور ان سے اربوں ڈالرز کے سودے کرلیے گئے، مسلمانان عالم نے اسے بھی سعودی عرب کی ڈپلومیسی پر محمول کیا، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ سعودی عرب کے ہر اقدام کی تائید وتحسین کی جائے خواہ وہ امت مسلمہ کے مفاد میں ہو یا نہ ہو، دودن پہلے سعودی عرب نے اچانک ہی اپنے پڑوسی ملک قطر سے اپنے تمام سفارتی اور تجارتی تعلقات منقطع کرنے کا اعلان کردیا، یہاں تک کہ اس نے قطر سے ملنے والی اپنی زمینی اور آبی سرحدیں بھی بند کردیں خاص بات یہ ہے کہ قطر کی زمینی سرحد صرف سعودی عرب سے ملتی ہے، اس اعلان کے چند منٹ بعد ہی بحرین، متحدہ عرب امارات، یمن اور مصر نے بھی قطر سے اپنے تعلقات ختم کرلئے، شام ہوتے ہوتے مالدیپ بھی تعلقات توڑنے والے ملکوں کی صف میں آکر کھڑا ہوگیا اور اب مشرقی لیبیا کی حکومت بھی اسی راہ پر گامزن ہے، خبر آئی ہے کہ موریطانیہ بھی اس فہرست میں شامل ہوچکا

ہے، امریکہ کے تلوے چاٹنے والے مسلم ملکوں کی یہ فہرست ابھی اور لمبی ہوسکتی ہے۔

سعودی عرب اور متحدہ عرب امارات کا شمار قطر کے اہم تجارتی شراکت داروں میں ہوتا ہے، سال گزشتہ کے اعداد وشمار بتلاتے ہیں کہ قطر کے کل تجارتی تبادلے کی مجموعی مالیت پینتالیس ارب قطری ریال رہی، اس میں سینتیس ارب قطری ریال کی تجارت صرف خلیجی ملکوں بالخصوص سعودی عرب اور عرب امارات سے ہوئی، بائیکاٹ کے اس فیصلے سے یقینی طور پر قطر کو بڑا نقصان ہونے والا ہے، یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس چھوٹے سے ملک میں جس کا کُل رقبہ گیارہ ہزار چار سو پینتس مربع کلومیٹر ہے اور جس کی کل آبادی ستائیس لاکھ افراد پر مشتمل ہے غذائی بحران کا شکار ہو جائے، خبر ہے کہ قطر کے شہریوں نے غذائی اشیاء کی ذخیرہ اندوزی شروع کر دی ہے، اس سے ملک میں غذائی اشیاء کی قلت کا خطرہ پیدا ہو گیا ہے، یقینی طور پر ملک میں افراط زر کی شرح بھی بڑھے گی اور شہریوں میں خوف وہراس بھی پیدا ہوگا، سعودی عرب اور اس کے اتحادیوں کا مقصد بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ قطر میں اقتصادی اور غذائی بحران پیدا کیا جائے اور وہاں کے شہریوں کو قطر کے موجودہ حکمرانوں کے خلاف سڑکوں پر اترنے کے لیے مجبور کیا جائے، قطر کی گھیرابندی اتنی مکمل ہے کہ ان تمام ملکوں نے اس کے لیے اپنی فضائی حدود تک بند کر دی ہیں، یعنی قطر کے مسافر طیارے نہ ان ملکوں میں سے کسی ملک کے ائرپورٹ پر اتر سکیں گے اور نہ کسی ملک کی فضائی حدود عبور کر کے دوسرے ملکوں تک رسائی حاصل کر پائیں گے، کہا جا رہا ہے کہ قطری حکومت شاید یہ جھٹکا برداشت نہ کر سکے، کیوں کہ قطر ایئر ویز اان ملکوں کی فضائی حدود عبور کئے بغیر ایشیا، افریقہ، یورپ اور امریکہ تک نہیں پہنچ سکتی، اگر وہ دوسرا کوئی متبادل راستہ اختیار کرتی ہے تو اس کے لیے منزل تک پہنچنے میں وقت بھی زیادہ درکار ہوگا اور ایندھن بھی زیادہ خرچ ہوگا، اور اب یہ مسافروں کے صواب دید پر منحصر ہوگا کہ وہ سفر کا فاصلہ کم وقت میں طے کرنا پسند کرتے ہیں یا زیادہ وقت میں طے کرنے کو ترجیح دیتے ہیں، بہ ہر حال اس فیصلے سے قطر کا بہت کچھ داؤ پر لگ چکا ہے، اگر یہ بائیکاٹ برقرار رہتا ہے تو قطر کی رفتار ترقی کو بریک بھی لگ سکتا ہے، مصر نے اعلان کیا ہے کہ وہ اپنے ایک لاکھ اسی ہزار افراد کو قطر

سے واپس بلا رہا ہے، یہ لوگ قطر میں انجینئرنگ، تعمیرات، طب اور قانون کے شعبوں سے وابستہ ہیں اور وہاں ریڑھ کی ہڈی سمجھے جاتے ہیں، ایک دم اتنے لوگوں کے انخلاء سے تمام سرگرمیاں ٹھپ پڑسکتی ہیں، اور کاروبار زندگی متاثر ہوسکتا ہے، ۲۰۲۲ء میں فٹبال کا ورلڈ کپ قطر میں ہونا ہے، اس کی تیاری زور وشور سے جاری ہے، اس صورت حال میں قطر ورلڈ کپ کی میزبانی سے بھی ہاتھ دھوسکتا ہے۔

سوال یہ ہے کہ اس چھوٹے سے ملک قطر سے کیا غلطی سرزد ہوگئی جو اس کو اتنی بڑی سزا دی گئی ہے، یہ بھی کہا جارہا ہے کہ جو ممالک آج تک اپنے ازلی دشمن اسرائیل کا بائیکاٹ نہ کرسکے وہ قطر جیسے چھوٹے سے ملک کے بائیکاٹ پر کس طرح متفق ہوگئے، بعض لوگ تو یہ سوال بھی کررہے ہیں کہ سعودی عرب ایران کو اپنا دشمن سمجھتا ہے، اور قطر کے بائیکاٹ کے پیچھے ایران کے لئے قطری حکومت کے نرم رویّے کو بھی منجملہ اسباب میں سے ایک سبب قرار دیا جارہا ہے، سب سے پہلے تو ایران کا مکمل بائیکاٹ ہونا چاہئے تھا، آخر اسے کیوں چھوڑا جارہا ہے، اور ایران کی طرف جھکاؤ کا الزام لگا کر قطر کو کیوں نشانہ بنایا جارہا ہے، حالاں کہ ایران کے لیے نرم رویہ تو کویت اور سلطنت عمان کا بھی ہے، آخر ان کو کیوں بخشا گیا، سعودی عرب کے خبررساں ادارے نے 5 جون کو اپنی خبر میں بتلایا ہے کہ سعودی حکومت نے اپنے اتحادی قطر کے ساتھ دہشت گردوں کی مبینہ معاونت کے باعث سفارتی تعلقات ختم کرلئے ہیں، کیا واقعی قطر دہشت گردوں کی مدد کرتا ہے، ابھی تک سعودی عرب سمیت کسی بھی ملک نے اس حوالے سے کوئی مستند دستاویز جاری نہیں کی ہے، اور جاری ہو بھی نہیں سکتی، کیوں کہ کسی کے پاس بھی قطر کے خلاف اس طرح کا کوئی ثبوت موجود ہی نہیں ہے کہ وہ دہشت گردوں کی مالی یا اخلاقی مدد کرتا ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ قطر کے امیر شیخ تمیم الثانی اپنی تقریروں میں ایران کے خلاف امریکی دھمکیوں پر نکتہ چینی کرتے رہے ہیں، حالاں کہ انھوں نے کبھی یہ نہیں کہا کہ وہ ایران کے ساتھ ہیں، بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ وہ یمن کے حوثی قبائل کے خلاف مسلح جدو جہد میں سعودی

عرب کے شانہ بہ شانہ کھڑے ہیں جن کی پشت پناہی ایران کررہا ہے، اب قطر کو اس اتحاد سے بھی باہر کردیا گیا ہے، اور پینتس اسلامی ملکوں کے عسکری اتحاد سے بھی اس کو الگ کردیا گیا ہے، صدر ٹرمپ ریاض آئے اور انہوں نے پچاس اسلامی ملکوں کی نمائندہ ہستیوں سے خطاب کیا، اس موقع پر صدر ٹرمپ، سعودی شاہ سلمان اور مصر کے ڈکٹیٹر جنرل سیسی کی باہمی ملاقات سے لوگوں نے اندازہ لگالیا تھا کہ مشرق وسطی میں کوئی نیا شگوفہ کھلنے والا ہے، اس ملاقات کو دو ہفتے بھی نہیں گزرے تھے کہ وہ شگوفہ سامنے آگیا، صدر ٹرمپ نے ٹوئیٹ کرتے ہوئے کہا کہ ''ان کے دباؤ سے عرب اقوام نے انسداد دہشت گردی کا مقابلہ کرتے ہوئے خلیجی ریاست قطر کو تنہا کیا ہے، کیوں کہ انتہا پسندی کی عملی حمایت کے تمام اشارے قطر کی جانب ہیں'' حقیقت یہ ہے کہ جنرل سیسی کو ساری پریشانی اخوان المسلمین سے ہے، یہ وہ جماعت ہے جس نے ساٹھ سال تک مصر میں آمریت کے خلاف جدو جہد کی اور ۲۰۱۳ء میں وہ انتخابات کے ذریعے عوامی مینڈیٹ حاصل کرکے ایوان اقتدار میں پہنچی: مگر مغربی ملکوں اور اسلام دشمن طاقتوں کو ان اسلام پسندوں سے خطرہ نظر آیا تو انہیں فوجی طاقت کے بل بوتے پر اقتدار سے محروم کردیا، اس کے رَدّ عمل میں مظاہرے کئے گئے تو چھ ہزار پر امن مظاہرین کو شہید کردیا گیا اور پانچ سو انتیس افراد کو سزائے موت سنادی گئی، قطر واحد ایسا ملک تھا جس نے اخوان المسلمین کو اخلاقی مدد فراہم کی اور دنیا کے سامنے اپنا موقف رکھنے کے لئے اسے پلیٹ فارم مہیا کیا، بس قطر کی یہی بات جنرل سیسی کی آنکھوں میں کھٹکتی رہی ہے، سعودی فرماں روا شاہ سلمان کی پریشانی قطر کا آزاد میڈیا ہے جو اکثر وبیشتر سعودی عرب سمیت خلیجی ملکوں کی پالیسیوں کو تنقید کا نشانہ بناتا ہے، ایران تو ایک بہانہ ہے، قطر کی حماس دوستی اور فلسطینی کاز کے لیے اس کی حمایت بھی ڈھکی چھپی چیز نہیں، قطر ۱۹۶۷ء سے فلسطینیوں کے ساتھ کھڑا ہے،، حقیقت میں تو یہ لوگ قطر کے کندھے پر بندوق رکھ کر اخوان کو دنیا سے ختم کرنا چاہتے ہیں، اور اس میڈیا کا گلا گھونٹنا چاہتے ہیں جو خلیجی ملکوں کے فرماں رواؤں کے لیے چیلنج بنا ہوا ہے، اگر قطر نے اس سلسلے میں پس وپیش کیا تو بہت ممکن ہے اس کا حشر بھی عراق، لیبیا اور شام جیسا ہو، شاہ سلمان اور جنرل سیسی کی ٹرمپ دوستی سے اب ترکی کو بھی ہوشیار رہنا ہوگا کیوں کہ اگلا نمبر اسی کا ہے۔

فکرِ عرب کودے کے فرنگی تخیلات

سعودی عرب سمیت سات ملکوں نے برادر ملک قطر سے اپنے تمام سفارتی اور تجارتی تعلقات منقطع کر لئے ہیں، بل کہ اگر یہ کہا جائے کہ اپنے انسانی رشتے بھی توڑ لئے ہیں تو زیادہ غلط نہ ہوگا، کویت کے امیر شیخ صباح احمد الصباح نے مصالحت کی کوشش کی تھی لیکن ابھی اس کا کوئی نتیجہ سامنے نہیں آیا، دنیا بھر کے مسلمانوں کی بڑی تعداد نے سعودی حکومت کے اس اقدام کو پسند نہیں کیا، اگرچہ مسلم ملکوں کی حکومتیں لب کشائی نہیں کررہی ہیں مگر سوشل میڈیا کے ذریعے عام آدمی کے دل کی پوری ترجمانی ہورہی ہے، صرف ترکی کے صدر طیب اردگان کا استثناء کیا جاسکتا ہے جنھوں نے پوری جرأت کے ساتھ قطر کی حمایت کی اور اس کی مدد کرنے کا اعلان بھی کیا، یوں تو ایران بھی مدد دینے کو بے قرار ہے مگر اصل جھگڑے کی جڑ ہی ایران ہے، اس لئے اس کی پیش کش کی کوئی اہمیت نہیں ہے، افسوس کی بات یہ ہے کہ اس پورے قضیے کو مسلکی اختلاف کے آئینے سے بھی دیکھنے کی کوشش ہورہی ہے، سوشل میڈیا پر جہاں قطر کی حمایت میں لوگ کھل کر اظہار خیال کررہے ہیں وہاں کچھ لوگ ایسے بھی سامنے آئے ہیں جنھوں نے اس حمایت کو مسلکی اختلاف کا شاخسانہ قرار دے کر سعودی عرب کی بے جا حمایت کا آغاز کردیا ہے، حقیقت تو یہ ہے کہ حرمین شریفین کے حوالے سے عالم اسلام کا ہر فرد سعودی عرب سے محبت رکھتا ہے، اور سعودی حکمرانوں کے لئے بھی ان کے دلوں میں نرم گوشہ موجود ہے، مگر قطر کے ساتھ جو کچھ ہوا اسے سند جواز عطا کرنے کا حوصلہ کسی میں نہیں ہے۔ سعودی عرب کی ہمدردی کی آڑ میں مسلکی منافرت پھیلانے والوں کو چاہئے کہ وہ اس پورے معاملے میں ٹھنڈے دل و دماغ سے غور کرکے کوئی رائے قائم کریں، قطر پر ایران نوازی، اور دہشت گردی کی پشت پناہی کے دو سنگین الزامات لگائے گئے ہیں، ہوسکتا ہے ایسا ہو، مگر کیا قطر نے یہ کام ابھی دو چار ہفتوں یا دو چار مہینوں سے شروع کیا ہے یا وہ برسہا برس سے ایران کے ساتھ دوستی کی پینگیں بڑھانے میں مصروف ہے اور دہشت گردوں کی مالی اور اخلاقی مدد کررہا ہے اور انہیں پناہ بھی دے رہا ہے، یقینی طور پر یہی کہا جائے گا کہ اس طرح کے معاملات ایک دم وجود

میں نہیں آتے ، اور نہ اس طرح کی چیزیں چھپ کر کی جاتی ہیں، اگر ایسا ہے تو سعودی عرب نے آج سے پہلے اس کی خبر کیوں نہیں لی، قطر اس کے ساتھ اسلامی ملکوں کے بلاک میں بھی ہے، عرب ملکوں کے اتحاد میں بھی شریک ہے، تیل پیدا کرنے والے ملکوں کی فیڈ ریشن میں بھی شامل ہے، آخر کسی جگہ اور کسی موقع پر تو اس کا اظہار ہوتا اور کبھی تو پتہ چلتا کہ قطر ایسا کر رہا ہے، یہ سوال اس وقت اور زیادہ اہم ہو جاتا ہے جب ہم قطر کو یمن کے حوثی باغیوں کی سرکوبی کے لئے سعودی عرب کے شانہ بہ شانہ کھڑا دیکھتے ہیں، سب جانتے ہیں کہ حوثی باغی ایران کی مدد سے برسر پیکار ہیں گویا ان کی آڑ میں ایران ہی جنگ لڑ رہا ہے، اس صورت میں یہ کیسے ممکن ہے کہ قطر ایران نواز بھی ہو اور ایران کے خلاف جنگ میں حصہ بھی لے رہا ہو، اور اگر قطر کا کردار مشکوک تھا بل کہ دوغلا تھا تو اسے آج سے پہلے ہی اتحاد سے باہر کیوں نہیں کیا گیا، بلاشبہ قطر کا نقطہ نظر ایران کے سلسلے میں سعودی عرب سے مختلف ہے، وہ یہ سمجھتا ہے کہ ایران اسٹراٹیجک اعتبار سے ایک اہم ملک ہے اسے اس طرح نظر انداز کرنا صحیح نہیں ہے، لیکن اپنے اس نقطہ نظر کے باوجود وہ اس جنگ میں سعودی عرب کے ساتھ ہے تو اس کا مطلب اس کے سوا کیا ہو سکتا ہے کہ وہ ایران نواز نہیں ہے، چلئے ہم مان لیتے ہیں قطر ایران نواز ہے مگر خلیج میں کچھ اور ملک بھی ایران کے سلسلے میں بعینہ یہی نقطہ نظر رکھتے ہیں، ان میں سرفہرست کویت ہے، سوال یہ ہے کہ اس طرح کی کاروائی قطر کے خلاف ہی کیوں کی گئی، کویت یا کسی دوسرے ملک کے خلاف کیوں نہیں کی گئی، صاف ظاہر ہے کہ ایسا اس لئے کیا گیا کہ امریکہ ایسا چاہتا تھا۔

ریاض سے واپسی کے بعد امریکی صدر صاف لفظوں میں کہہ چکے ہیں میں نے سعودی عرب سے ایسا کرنے کے لئے کہا تھا، سوچنے کی بات یہ ہے کہ امریکہ قطر کو الگ تھلگ کیوں کرنا چاہتا ہے، جواب کے لئے بہت زیادہ دماغ کھپانے کی ضرورت نہیں ہے، افغانستان، عراق، لیبیا اور شام کا حشر ہمارے سامنے ہے، آج یہ تمام ملک اپنی رونقیں کھو کر کھنڈر بن چکے ہیں، اب امریکہ کو نئے شکار کی تلاش ہے، قطر سے اچھا شکار ملنا مشکل ہے، کیوں کہ وہ خلیجی ملکوں میں معاشی ترقیات اور فی کس آمدنی کے لحاظ سے سرفہرست بھی ہے، اور

بدقسمتی سے کچھ اسلام پسند بھی ہے، یہ دونوں وجوہات اسے سزا دینے کے لئے کافی ہیں، اسی لئے اسے جناب صدر کے کہنے پر سزا سنادی گئی ہے، مصالحت کی کوشش چل رہی ہے، ہوسکتا ہے کامیاب ہوجائے، یہ بھی ممکن ہے کامیاب نہ ہو، یا امریکہ جیسے ملک اس طرح کی کسی کوشش کو کامیاب نہ ہونے دیں، اس صورت میں قطر کے اڑیل رویّے کو بنیاد بنا کر اس پر بمباری بھی کی جاسکتی ہے، جس طرح افغانستان پر کی گئی، عراق پر کی گئی، لیبیا پر کی گئی اور شام پر کی جارہی ہے، اگر ایسا ہوا تو کسی وقت اس کی زد میں ترکی بھی آئے گا کیوں کہ وہ بہت بڑھ بڑھ کر بولتا ہے، اس کی آنچ سعودی عرب تک بھی پہنچ سکتی ہے کیوں کہ نائن الیون کے مجرموں کا تعلق سعودی عرب سے تھا، اور القاعدہ بھی سعودی شہری بن لادن کی تنظیم ہے، یوں بھی تھوڑا بہت اسلام اگر کہیں نظر آتا ہے تو وہ سعودی عرب میں ہے، قطر کو تباہ کرنا مقصود نہیں ہے، بل کہ خلیجی ملکوں کی ترقیات کو برباد کرنا مقصد ہے، کیوں کہ یہ تمام ملک قدرتی وسائل سے مالا مال ہونے کے ساتھ ساتھ بے پناہ دولت بھی رکھتے ہیں، گلف نیوز کی حالیہ رپورٹ کے مطابق تنہا قطر، کویت اور سعودی عرب کے پاس اس قدر دولت ہے کہ اگر وہ اپنی دولت کا صرف دس فی صد نکال دیں تو صومالیہ جیسے چھ ملکوں کے آٹھ کروڑ افراد تیس (۳۰) سال تک اپنی غذائی ضرورتوں سے بے نیاز ہوسکتے ہیں۔

بائیکاٹ کے فوراً بعد سعودی عرب اور تین دوسرے ملکوں نے ایک فہرست جاری کی ہے جس میں انسٹھ (۵۹) ممتاز علماء کرام کے نام شامل ہیں جن کا تعلق مختلف عرب ملکوں سے ہے اور جو فی الوقت قطر میں مقیم ہیں اسی طرح بارہ خیراتی اداروں کو بھی اس فہرست میں شامل کیا گیا ہے ان کا تعلق بھی قطر سے ہے، ان سب پر الزام ہے کہ یہ دہشت گردی پھیلا رہے ہیں، حیرت کی بات یہ ہے کہ دہشت گردی کا الزام ان شخصیات پر لگایا گیا ہے جن کا تعلق تصنیف وتالیف سے ہے، دعوت وتبلیغ سے ہے یا درس وتدریس سے ہے، ان کا جرم یہ ہے کہ وہ اسلام کی بات کرتے ہیں، ان شخصیات میں اہم اور ممتاز نام مصر کے علامہ یوسف قرضاوی کا ہے جو جمال عبدالناصر کے ظلم وستم سے عاجز آکر ۱۹۶۰ء سے قطر میں رہ رہے ہیں، نوے

سال کے شیخ قرضاوی سو سے زیادہ اسلامی کتابوں کے مصنف ہیں، ان کا قصور صرف اتنا ہے کہ وہ مصر کی اسلام پسند جماعت اخوان المسلمین سے وابستہ رہ چکے ہیں اور اب بھی اس کے نظریات کی تبلیغ کرتے ہیں، بس یہی قصور ہے جس کی بنا پر جنرل سیسی ان کا نام دہشت گردوں کی فہرست میں شامل کرانے میں کامیاب ہو گئے ہیں، ورنہ آج سے قبل تو سعودی عرب سمیت تمام عرب ملکوں کے حکمراں اور عوام سب ان کے گرویدہ تھے، یہاں تک کہ چند سال قبل وہ سعودی عرب کا سب سے بڑا ایوارڈ بھی حاصل کر چکے ہیں جو ظاہر ہے کسی دہشت گرد کو نہیں دیا جا سکتا، وہ رابطہ عالم اسلامی کے رکن بھی رہے ہیں جو عالم اسلام کی سب سے مؤثر تنظیم ہے، اس فہرست کے دوسرے افراد بھی اپنی تصنیفی، دعوتی اور اصلاحی خدمات کے حوالے سے غیر معروف نہیں ہیں۔

امریکی صدر کے دورے کے بعد ان افراد میں جو سالہا سال سے قطر میں مقیم تھے ایسا کیا نظر آیا کہ جو سب کے سب دہشت گرد قرار دے دئے گئے، یہ سوال بہت اہم ہے اور پوری دنیا کے مسلمانوں کو غور وفکر کی دعوت دیتا ہے، ان کو بھی جو مسلک کو بنیاد بنا کر سعودی عرب کی بے جا حمایت کر رہے ہیں، اور ان کو بھی جو کسی مصلحت کی بنا پر ابھی تک خاموش ہیں، بات اصل یہ ہے کہ اب دہشت گردی کے مفہوم کو وسعت دینے کی کوشش ہو رہی ہے، آج سے پہلے طالبان، حماس، القاعدہ اور داعش کے مسلح جنگ جوؤں کو دہشت گرد کہا جاتا تھا اب وہ لوگ بھی دہشت گرد کہلائیں گے جو اپنی کتابوں میں اسلام کی بات کرتے ہیں، جو اپنی تقریروں میں مسلمانوں کے مسائل پر بولتے ہیں، جو مسلمانوں میں اتحاد کے داعی ہیں، جو مسلم ملکوں میں اسلام کو پھلتا پھولتا دیکھنا چاہتے ہیں، جو مظلوم فلسطینیوں کے حق کی بات کرتے ہیں جو نا انصافیوں کے خلاف آواز اٹھاتے ہیں، اب وہ ادارے بھی دہشت گرد کہلائیں گے جو کسی بھی ملک کے مظلوم اور بے کس مسلمانوں کو دو وقت کی روٹی مہیا کر دیتے ہیں یا ان کے ننگے جسموں کے لئے لباس فراہم کر دیتے ہیں، اگر امریکہ سعودی عرب جیسے ملکوں کے ساتھ مل کر دہشت گردی کو نیا رنگ نیا آہنگ دینے میں کامیاب ہو جاتا ہے تو دنیا کے دوسرے ملک بھی اس

طرح کی ''دہشت گردی'' سے نمٹنے میں کسی سے پیچھے نہیں رہیں گے، پھر اس کی آنچ ان مصلحت پسندوں تک بھی پہنچے گی جو خاموشی کی چادر تانے خواب خرگوش کا مزہ لے رہے ہیں، میں اپنے اس مضمون کو علامہ اقبال کے اس شعر پر ختم کرتا ہوں جو خلیجی ملکوں میں جاری اتھل پتھل کے پسِ منظر میں کس قدر برمحل ہے:

فکرِ عرب کو دے کے فرنگی تخیلات
اسلام کو حجاز و یمن سے نکال دو

چوں کفر از کعبہ برخیزد

صدر ٹرمپ کے ریاض دورے کے بعد سعودی عرب نے اپنی داخلی اور خارجی پالیسیوں میں جو تبدیلیاں کی ہیں ان سے پورے عالم اسلام میں تشویش پیدا ہوگئی ہے، سب سے پہلے تو پڑوسی ریاست قطر کا بائیکاٹ کیا گیا اور اس پر یہ الزام لگایا گیا کہ وہ دہشت گردی کی پشت پناہی کررہا ہے اور خطے کے امن کو نقصان پہنچا رہا ہے، داخلی سطح پر بھی کچھ تبدیلیاں کی گئی ہیں جن کو اس وقت یہاں زیر بحث لانا مضمون کی طوالت کا باعث ہوگا، البتہ ہم سعودی فرماں رواشاہ سلمان کے خلف الرشید ولی عہد شہزادہ محمد بن سلمان کے ایک بیان کی طرف توجہ مبذول کرانا چاہیں گے جس میں انہوں نے کہا ہے کہ ۱۹۷۹ء سے پہلے ہم ایسے نہیں تھے جیسے اب ہیں، ۱۹۷۹ء کے بعد مختلف وجوہات کے تحت الصحوہ (بیداری) کی تحریک چلائی گئی، اب ہم اس طرف واپس جارہے ہیں جیسے ہم پہلے تھے، ایسے اسلام کی طرف جارہے ہیں جو معتدل ہے اور جس میں دنیا اور دیگر مذاہب کے لیے جگہ ہے، شہزادہ کے اس بیان کے فوراً بعد حکومت سعودیہ نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ ملکی معیشت کا انحصار تیل پر کم کرکے سیاحت اور تفریحی سرگرمیوں کو فروغ دیا جائے، برطانوی خبر رساں ادارے رائٹرز کے مطابق جدہ کے قریب کنگ عبد اللہ اکنامک سٹی تعمیر کرنے والے گروپ ای ای سی کے چیف ایگزیکٹیو فہد الراشد نے اعلان کیا ہے کہ اب ملک میں جاز فیسٹول منعقد کیے جائیں گے، جن میں غیر ملکی موسیقار اپنے فن کا مظاہرہ کریں گے، ان کا خیال ہے کہ ان پروگراموں میں سعودی شہریوں کی بڑی تعداد شرکت کرے گی، ویزہ کی موجودہ پالیسی کی وجہ سے یہ ممکن ہے کہ غیر ملکی شائقین زیادہ تعداد میں نہ آئیں۔ صاف ظاہر ہے کہ سعودی حکومت اب اپنے ملک کو روشن خیالی اور جدت پسندی کی اس شاہ راہ پر لے جانا چاہتی ہے جس پر امریکہ اور یورپ جیسے ملک چل رہے ہیں، اب تک وہ جس اسلام کی نمائندگی کررہی تھی وہ کچھ اور اسلام تھا، سمجھا جاتا تھا کہ سعودی عرب تنہا ایسا ملک ہے جہاں اسلامی قوانین کے معتد بہ حصہ پر عمل کیا جاتا ہے، آہستہ آہستہ ملک کو قدامت پسندی کے اس خول سے باہر نکالنے کی کوشش ہورہی ہے، ہم اس پر سوائے اظہار افسوس کے کر بھی کیا کرسکتے

ہیں، لیکن ہمیں اتنا کہنے کا تو حق ہے کہ آپ اپنے ملک کے مطلق العنان بادشاہ ہیں، جو چاہیں کریں لیکن للہ اسلام کو معتدل اور غیر معتدل اسلام میں تو تقسیم نہ کریں، اسلام تو روزِ اوّل ہی سے معتدل دین ہے، اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری آسمانی دین کو جن بے شمار خصوصیات اور امتیازات سے نوازا ہے ان میں ایک وصف خاص اور ایک طرۂ امتیاز یہ ہے کہ اس کا ہر حکم معتدل، اور ہر طرح کی افراط وتفریط سے پاک ہے، قرآن کریم میں ہے ''اور اسی طرح ہم نے تم کو متوسط اور معتدل امت بنایا ہے'' (البقرۃ:۱۴۲) اسلام کا یہ وصف اعتدال ہمیں اس کی تمام تعلیمات میں نظر آتا ہے، خواہ وہ تعلیمات عملی ہوں یا اعتقادی، خواہ ان کا تعلق عبادت سے ہو یا معاشرت سے، ہر معاملے میں اسلام یہی کہتا ہے کہ اعتدال اور میانہ روی اختیار کرو، ہماری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ ولی عہد محمد بن سلمان کون سے معتدل اسلام کی بات کر رہے ہیں؟! کیا معتدل اسلام میں موسیقی کی اجازت ہوگی، کیا بے پردگی اور بے حیائی کے مناظر، مخلوط تعلیم کی درس گاہوں، رقص وسرور کی محفلوں اور جام ومینا کی گردشوں سے اسلام معتدل ہو جاتا ہے، ہم پھر یہی کہیں گے کہ آپ حاکم وقت ہیں، ملک کی زمام کار آپ کے ہاتھوں میں ہے، آپ کچھ بھی کریں مگر اسے معتدل اسلام کا خوب صورت نام دے کر دنیا کو گمراہ تو نہ کریں، اسلام تو آفاقی مذہب ہے، اس کے اصول بھی آفاقی ہیں اور تعلیمات بھی آفاقی ہیں، چودہ سو سال پہلے جو اسلام تھا اور چودہ سو سال سے جو اسلام ہے وہی اسلام آج بھی ہے اور وہی آئندہ بھی رہے گا، اگر سعودی عرب جیسا ملک جس کی اسلام پسندی پر ہم فخر کرتے نہیں تھکتے تھے دین کو بازیچہ اطفال بنائے گا تو اس سے بڑا سانحہ کیا ہوگا، مغربی دنیا تک انہوں نے یہ پیغام پہنچا دیا ہے کہ اب تک سعودی عرب ایک ایسے اسلام پر کار بند تھا جو راہِ اعتدال سے ہٹا ہوا تھا اور جو کسی مجبوری کے تحت اختیار کیا گیا تھا، اب ملک کو معتدل اسلام کی طرف لے جانے کی کوشش کی جا رہی ہے، جس میں سختی کے بہ جائے نرمی ہے، شدت کے بہ جائے سہولت ہے، انتہا پسندی کے بہ جائے اعتدال ہے، توسط ہے، میانہ روی ہے۔

سعودی عرب نے اپنے مستقبل کے لیے کیا نقشہ بنایا ہے اس کا اندازہ اس بات

سے لگایا جاسکتا ہے کہ ملک کی واحد اسلامی تنظیم رابطہ عالم اسلامی کا اجلاس تاریخ میں پہلی مرتبہ امریکہ کی میزبانی میں نیویارک میں منعقد کیا گیا ۷/ستمبر ۲۰۱۷ء سے شروع ہونے والے اس دوروزہ کانفرنس کا عنوان تھا ''ریاست ہائے متحدہ امریکہ اور عالم اسلام میں رابطہ کاری'' رابطہ عالم اسلام کے سیکریٹری جنرل ڈاکٹر محمد بن عبدالکریم الشیبی نے کانفرنس کے مقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا تھا کہ اس کا مقصد اسلامی تہذیب وثقافت کے درخشندہ باب کو دنیا کے سامنے پیش کرنا، دوسری تہذیبوں کے ساتھ ہم آہنگی کو فروغ دینا اور اسلام کی سنہری روایات کو دنیا کے سامنے اجاگر کرتے ہوئے اسلام کی خراب شبیہ کو بچانا ہے، بہ ظاہر تو مقاصد اچھے تھے، ان مقاصد کی تکمیل کانفرنس کے ذریعہ ہوئی یا نہیں ہوئی یہ الگ موضوع ہے، لیکن اس کے ذریعہ عالم اسلام میں امریکہ کی داغ دار شبیہ کو سنوارنے کی کوشش ضرور کی گئی، چناں چہ امام حرم شیخ عبدالرحمٰن السدیس نے کانفرنس میں شرکت کے بعد ایک ٹی وی نیوز چینل کو انٹرویو دیتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ سعودی فرماں روا شاہ سلمان اور امریکی صدر ڈونلڈ ٹرمپ دونوں امن عالم کے فروغ اور استحکام کے لیے دنیا کی قیادت کررہے ہیں، شیخ سدیس کے اس بیان سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ رابطے کی کانفرنس کا کیا مقصد تھا، اور امریکی میزبانی کا حقِ شکر کس طرح ادا کیا گیا؟!

اسی ضمن میں ایک خبر یہ بھی آئی ہے کہ سعودی عرب کے اسکولوں اور کالجوں میں جو نصابِ تعلیم پڑھایا جارہا ہے اس میں تبدیلی کی جائے گی، اگر خبر اتنی ہی ہوتی تب بھی کوئی حرج نہیں تھا، ترقی پسند معاشرہ میں نصابِ تعلیم میں تبدیلیوں کا عمل جاری رہتا ہے، تاہم خبر کا یہ پہلو انتہائی افسوس ناک ہے کہ یہ نصاب امریکی ماہرین کی نگرانی میں مرتب ہورہا ہے، اور اس میں قرآن وحدیث کے وہ حصے شامل نہیں کیے جائیں گے جو جہاد پر مشتمل ہیں یا جن سے بہ قول ان کے انتہا پسندی کو فروغ ملتا ہے۔ اب ایک خبر اور آئی ہے، بہ ظاہر تو یہ بہت اچھی خبر ہے لیکن آہستہ آہستہ اس کی جو تفصیلات سامنے آرہی ہیں ان سے ایک بار پھر یہ بات ثابت ہوگئی ہے کہ سعودی عرب اپنی اصل شناخت کھورہا ہے اور اب وہ ایک نئے قالب میں ڈھلنے کی کوشش

کرر ہا ہے جو مغربی کی خواہشات اور توقعات کے عین مطابق ہوگا، اس خبر کی تفصیل یہ ہے کہ سعودی عرب کے شاہ سلمان بن عبد العزیز نے ''خادم الحرمین الشریفین کمپلکس برائے حدیث نبوی'' کے نام سے ایک ادارہ قائم کرنے کا حکم دیا ہے، جس میں حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم پر جامع انداز میں کام ہوگا، یہ ادارہ فن حدیث کے ماہرین اور شیوخ پر مشتمل ہوگا، اس سلسلے میں شاہ سلمان کی جانب سے جو فرمان جاری کیا گیا ہے اس میں کہا گیا ہے کہ حدیث اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا اہل اسلام کے نزدیک غیر معمولی مقام ومرتبہ ہے، قرآن کریم کے بعد احادیث نبوی اسلام کا دوسرا مآخذ ہے، خبر اس حد تک تو بڑی خوش آئند اور مسرت انگیز ہے، چناں چہ جیسے ہی خبر عام ہوئی عالم اسلام میں خوشی کی لہر دوڑ گئی، اس سے پہلے سعودی عرب قرآن کریم کی بے مثال خدمت انجام دے چکا ہے، اور اب بھی خدمت کا یہ سلسلہ جاری ہے، مکہ مکرمہ میں سال ہا سال سے ایک ادارہ قائم ہے جو قرآن کریم کی لگاتار خدمت انجام دے رہا ہے، اس دوران قرآن کریم کے کروڑ ہا کروڑ نسخے چھپ کر پوری دنیا میں تقسیم کیے جا چکے ہیں، دنیا کی بہت سی زبانوں کے معتبر ومستند تراجم اور تفاسیر کی طباعت کا قابل قدر کام بھی اسی ادارہ کے تحت انجام دیا جاتا ہے، قرآن کریم کے سلسلے میں سعودی حکومت کی اس بے مثال اور قابل قدر خدمت کو دیکھتے ہوئے حدیث کی خدمت کے لیے مدینہ منورہ میں مذکورہ ادارہ کے قیام کی خبر کا استقبال نہ کرنا اور اس پر مسرت کا اظہار نہ کرنا ناانصافی ہوگی، لیکن ابھی چند روز قبل جو خبر آئی ہے اس نے مسلمانوں میں بہ طورِ خاص اہل علم میں تشویش کی لہر دوڑ ادی ہے اور ہماری تمام خوشیوں پر پانی پھیر دیا ہے، خبر میں کہا گیا ہے کہ سعودی عرب نے انتہا پسندی کے خاتمے اور اسلام کو جدید شکل میں پیش کرنے کے لیے احادیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی از سر نو تدوین کا فیصلہ کیا ہے، اطلاع کے مطابق اس کام کے لیے ماہرین فن کی ایک کمیٹی بھی تشکیل دی گئی ہے، یہ خبر برطانوی خبر رساں ایجنسی رائٹرز نے جاری کی ہے، اور ہندوستان میں ٹائمز آف انڈیا سمیت تمام اخبارات نے اسے صفحہ اوّل پر نہایت اہتمام کے ساتھ شائع کیا ہے، رپورٹ کے مطابق سعودی حکومت اب وہابی ازم کو ختم کرنا چاہتی ہے، ذرائع کے مطابق تشدد،

اور انتہا پسندی پر مشتمل احادیث کو کتابوں سے نکالا جائے گا، ساتھ ہی اس کی بھی تحقیق کی جائے گی کہ اب تک ہم جسے حدیث سمجھ رہے تھے وہ واقعی حدیث ہے یا کوئی فرضی بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر دی گئی ہے، حدیث شریف کی تدوین نو کے نام پر یہ دونوں ہی فیصلے انتہائی قابل مذمت ہیں، پہلی بات تو یہ ہے کہ حدیث کی تدوین کا عمل اسلام کی پہلی اور دوسری صدی میں مکمل ہو چکا ہے، اس سلسلے میں احادیث کے سینکڑوں مجموعے مطبوعہ شکل میں موجود ہیں جن سے امت برابر استفادہ کر رہی ہے، جہاں تک موضوع اور من گھڑت احادیث کا تعلق ہے اس پر بھی وقیع کام ہوا ہے اور بے شمار مجموعے صرف موضوع احادیث کی نشان دہی کے لیے لکھے گئے ہیں، یہ ظاہر ہے اس نوعیت کے کسی نئے کام کی کوئی گنجائش نہیں ہے، بخاری ومسلم جیسی وقیع، مستند اور قابل اعتماد کتابیں موجود ہیں، جن کی صحت پر صدیوں سے امت کا اتفاق ہے، پورے مجموعہ احادیث میں تشدد اور انتہا پسندی پر مشتمل کوئی حدیث موجود ہی نہیں ہے، البتہ ''احادیث جہاد'' ضرور موجود ہیں جن کو تشدد اور انتہا پسندی پر مبنی قرار نہیں دیا جا سکتا، تمام ذخیرۂ احادیث پر امن اسلامی تعلیمات پر مشتمل ہے، اپنے تو اپنے غیر بھی اس کو تسلیم کرتے ہیں، ہمیں شبہ ہے کہ سعودی حکومت اپنے نئے ایجنڈے کے نفاذ کے لیے حدیث نبوی کے تقدس اور اس کے استناد کو نقصان پہنچانے کا ارادہ رکھتی ہے، مسلمانوں کی طرف سے اس ادارے کے خلاف احتجاج ہونا بے حد ضروری ہے۔

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے

بیت المقدس پر یہودیوں کے غاصبانہ قبضہ نے مسلمانوں کو سال ہا سال سے بے چین ومضطرب کررکھا تھا کہ اب مسلمانوں کے قبلۂ اوّل مسجد اقصیٰ کے خلاف ان کی ریشہ دوانیوں اور سازشوں نے ساری دنیا کے مسلمانوں کو تشویش میں مبتلا کر دیا ہے، یہودی چاہتے ہیں کہ مسجد اقصیٰ کو شہید کر کے اس کی جگہ ہیکل سلیمانی تعمیر کیا جائے، اسرائیل نے ۷/ جون ۱۹۶۷ء کو بیت المقدس کے مشرقی حصہ پر قبضہ کیا تھا، جہاں مسلمانوں کی عظیم مسجد الاقصیٰ واقع ہے، اب اسرائیلی حکومت چاہتی ہے کہ بیت المقدس کے جسے وہ یروشلم کے قدیم نام سے پکارتے ہیں؛ مغربی اور مشرقی حصوں کو ملا کر ایک متحدہ شہر تعمیر کیا جائے جسے اسرائیل کی راج دہانی بنا دیا جائے، فی الحال تل ابیب اسرائیل کی راج دہانی ہے، اپنے اس منصوبہ کو عملی جامہ پہنانے کے لیے اسرائیلی حکومت بیت المقدس میں بین الاقوامی پابندیوں کے باوجود نئی کالونیاں تعمیر کر رہی ہے اور دور دراز علاقوں سے یہودیوں کو لاکر یہاں بسایا جا رہا ہے تاکہ ان کی تعداد قدیم فلسطینی باشندوں کی تعداد کے مقابلہ میں زیادہ ہو جائے، اسرائیلی منصوبہ میں یہ بھی شامل ہے کہ مسجد اقصیٰ کو جو مسلمانوں کا قبلۂ اوّل بھی ہے اور جس کو سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس سے یہ نسبت بھی حاصل ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم معراج کی رات یہاں تشریف لائے اور یہیں سے معراج کے سفر پر تشریف لے گئے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مسجد میں تحیۃ المسجد ادا فرمائی اور تمام انبیاء کرام علیہم السلام کی امامت فرمائی جو پہلے سے وہاں موجود تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری کے منتظر تھے، یہود چاہتے ہیں کہ مسلمانوں کی عقیدتوں اور محبتوں کا یہ مرکز روئے زمین سے نیست و نابود ہو جائے، اس منصوبہ کو بہ روئے کار لانے کے لیے یہودی ۱۹۶۷ء سے ہی طرح طرح کی سازشیں کرنے میں مصروف ہیں، کبھی آثارِ قدیمہ کی تحقیق اور جستجو کے نام پر مسجد اقصیٰ کی دیواروں کے نیچے کھدائی کی جاتی ہے اور کبھی اس کے صحن میں! مقصد اس کے علاوہ کچھ نہیں کہ کسی طرح مسجد اقصیٰ کی بنیادیں کمزور پڑ جائیں اور یہ عظیم مسجد خود بہ خود زمیں بوس ہو جائے، وقفہ وقفہ سے کھدائی کا یہ سلسلہ لگاتار جاری ہے، یہودی کہتے ہیں کہ مسجد اقصیٰ ہیکل سلیمانی کو مسمار کر کے تعمیر کی گئی ہے، کھدائی کا یہ سلسلہ اسی ہیکل کی تلاش میں

شروع کیا گیا ہے، ۱۹۶۸ء میں تو یہودی اہلکاروں نے ٹھیک مسجد اقصیٰ کے نیچے ایک لمبی اور گہری سرنگ بھی بنالی تھی اور او راپنی ایک عبادت گاہ بھی تعمیر کرلی تھی، ساری دنیا یہودیوں کی اس حرکت سے نالاں ہے، اسلامی ملکوں کا سخت رَدِّ عمل تو فطری ہے، اقوام متحدہ کے ذیلی ادارہ یونیسکو نے بھی اپنی اٹھارویں بین الاقوامی کانفرنس میں تجویز ۳/۳۲۷ کے ذریعہ اسرائیل کی بھرپور مذمت کرتے ہوئے یہ مطالبہ کیا تھا کہ وہ کھدائی کے اس سلسلہ کوفوراً موقوف کردے، اس کی تخریبی سرگرمیوں سے ہزاروں سال پُرانے شہر بیت المقدس کے ثقافتی اور تاریخی تشخص کونا قابل تلافی نقصان پہنچ سکتا ہے، یہودیوں کومسجد اقصیٰ سے کس قدر نفرت ہے اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ یہودیوں نے اس میں آگ لگانے کی ناپاک کوشش بھی کی اور اس کوشش میں وہ بدبخت جزوی طور پر کامیاب بھی رہے، مسجد اقصیٰ میں آگ لگانے کا واقعہ اکیس اگست ۱۹۶۹ء کو پیش آیا، اس سے ایک دن قبل قابض فوجوں نے حرم ثالث کی پائپ لائنیں کاٹ دیں اور مسلمانوں کوحرم کی حدود کے قریب آنے سے روک دیا، اسی دوران ایک شدت پسند یہودی نے مسجد اقصیٰ میں آگ لگادی، دیکھتے ہی دیکھتے آگ کے شعلے بھڑک اٹھے اور اس کی لپٹوں نے مسجد کے اندرونی درودیوار کو اپنی لپیٹ میں لے لیا، آگ مسجد کے جنوبی مسقّف حصہ میں پوری طرح پھیل چکی تھی، مجاہد اعظم سلطان صلاح الدین ایوبیؒ کا بلند قامت منبر بھی آگ کی لپیٹ میں آ گیا تھا، اچانک مسلمانوں کا ایک زبردست ریلا اسرائیلی فوجوں کی مزاحمت کے باوجود مسجد میں داخل ہوا اور انہوں نے آگ پر قابو پالیا، آگ کے اس اندوہ ناک واقعہ کے بعد اسرائیل نے دعویٰ کیا تھا کہ یہ آگ شارٹ سرکٹ کی وجہ سے لگی، حالاں کہ ماہرین نے معائینہ کے بعد کہا تھا کہ آگ حادثاتی نہیں تھی بلکہ جان بوجھ کر لگائی گئی تھی، بعد میں ایک آسٹریلین یہودی کو گرفتار کیا گیا، جسے یہ کہہ کر رہا کردیا گیا کہ اس نے پاگل پن میں یہ حرکت کی تھی، ۱۹۶۹ء میں اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل نے اکثریت کے ساتھ مذمتی قرارداد منظور کی، لیکن اسرائیل کے کانوں پر جوں تک نہ رینگی، امریکہ اور برطانیہ کی یہ ناجائز اولاد آج تک اسی ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کررہی ہے۔

عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ بیت المقدس اور مسجد اقصیٰ دونوں ایک ہی عمارت کے

دو نام ہیں، یہ غلط فہمی ان تصویروں کے ذریعہ پھیلی ہے جن میں سنہرا قبۃ الصخرہ نظر آتا ہے اور جس کے برابر میں لکھا رہتا ہے ''بیت المقدس'' حقیقت یہ ہے کہ بیت المقدس ایک قدیم شہر کا نام ہے جس میں مسجد اقصیٰ واقع ہے اور جس کے صحن میں دل کش قبۃ الصخرہ موجود ہے، اس کے علاوہ بھی وہاں مسجدیں اور قبے ہیں، انبیاء کرام کی قبریں ہیں، اور دوسری یادگاریں ہیں، یہ دنیا کا واحد شہر ہے جسے دنیا کے تین بڑے مذاہب کے لوگ اپنی اپنی عقیدت کا مرکز بنائے ہوئے ہیں، مسلمان اس شہر سے اس لیے عقیدت ومحبت رکھتے ہیں کہ یہاں ان کا قبلۂ اوّل اور حرم ثالث مسجد اقصیٰ موجود ہے، اس مسجد کی اہمیت اس لیے بھی ہے کہ معراج کی رات سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم اس مسجد میں تشریف لائے، یہاں انبیاء کرام کی امامت فرمائی اور یہیں سے معراج کے سفر پر تشریف لے گئے، عیسائی اس شہر سے اس لیے عقیدت رکھتے ہیں کہ یہاں سے تقریباً پندرہ کلومیٹر دور واقع تاریخی شہر بیت اللحم میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش ہوئی، ہر وقت دنیا بھر سے عیسائیوں کے قافلے یہاں آتے جاتے رہتے ہیں، کہتے ہیں کہ اس شہر میں کھجور کا وہ درخت آج تک موجود ہے جس کی کھجوریں حضرت مریم علیہا السلام نے وضع حمل سے پہلے یا بعد میں کھائیں تھیں، اس درخت کا ذکر قرآن کریم میں بھی ہے، یہودی اس شہر کو اس لیے مقدس سمجھتے ہیں کہ یہ شہر حضرت سلیمان علیہ السلام کا دار الخلافہ رہا ہے، اور بہ قول ان کے یہاں ان کا تعمیر کردہ ہیکل موجود تھا جس کو گرا کر مسلمانوں نے مسجد اقصیٰ تعمیر کی ہے، حالاں کہ تاریخی طور پر ان کا یہ دعویٰ بالکل غلط ہے۔

مسجد اقصیٰ کی تازہ ترین صورتِ حال یہ ہے کہ چند روز قبل تشدد کے ایک واقعہ کو بہانہ بنا کر حکومت نے اس مسجد کو نماز کے لیے بند کر دیا تھا اور وہاں مسلح سیکورٹی دستے متعین کر دیئے تھے، اسرائیلی حکومت کے اس اقدام سے مشتعل ہو کر تین فلسطینی نوجوانوں نے مسجد کے احاطہ میں گھس کر وہاں متعین پولیس اہلکاروں پر فائرنگ کر دی، اس سے دو پولیس والے ہلاک ہو گئے، جوابی کارروائی میں اسرائیلی فوج نے ان تینوں کو موت کی نیند سلا دیا، اس واقعہ کے بعد سے مسجد اقصیٰ میں اذان دینے اور نماز پڑھنے پر پابندی عائد ہے، کئی دروازے آمد ورفت کے لیے بند

کر دیئے گئے ہیں اور جو دروازے کھلے رکھے گئے ہیں ان پر میٹل ڈیٹیکیٹر ز لگا دیئے گئے ہیں۔

مسلمانوں کا مطالبہ یہ ہے کہ تلاشی کا یہ نظام فوری طور پر ہٹایا جائے اور مسجد میں مسلمانوں کے داخلہ کو آزادانہ بنایا جائے، اسرائیلی حکومت کا مزاج ہٹ دھرمی اور اشتعال انگیزی کا ہے، اس معاملہ میں بھی وہ کئی دن تک بین الاقوامی مطالبوں کے باوجود ہٹ دھرمی پر قائم رہی، آج یہ اطلاع آئی ہے کہ اسرائیل نے مسجد اقصیٰ کے باہر لگائے گئے الیکٹرانک اسکینرز ہٹانے اور ان کی جگہ نگرانی کے دوسرے طریقے اپنانے کا فیصلہ کیا ہے، یہاں یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ مسلمان اس مسجد میں نماز ادا کرنے سے قاصر ہیں اور یہودی احاطۂ مسجد میں بے خوف وخطر دندناتے پھر رہے ہیں، خبر ہے کہ دو سو پانچ یہودی اسرائیلی فوج اور پولیس کی فول پروف سیکورٹی کے ساتھ مسجد اقصیٰ میں داخل ہوئے اور وہاں مذہبی رسومات انجام دے کر قبلۂ اوّل کی بے حرمتی کی، اس تناظر میں یہ خبر بھی اہمیت رکھتی ہے کہ آج (۲۶ جولائی ۲۰۱۷ء) کو اردن کی راج دہانی عمان میں عرب لیگ کا ایک ہنگامی اجلاس منعقد ہو رہا ہے جس میں مسجد اقصیٰ کی تازہ صورت حال پر غور کیا جائے گا، حسب روایت امریکہ بھی اس معاملہ میں کود پڑا ہے اور اس کے حکام اسرائیلی ذمہ داروں سے بات چیت کے لیے تل ابیب پہنچ چکے ہیں۔

مسجد اقصیٰ مسلمانانِ عالم کا دھڑکتا ہوا دل ہے، اس کے خلاف اسرائیل کی ریشہ دوانیاں اور چیرہ دستیاں لگاتار بڑھتی جارہی ہیں، افسوس یہ ہے کہ مسلم حکومتیں اسرائیل کو ان حرکتوں سے باز رکھنے میں ناکام ہیں، ان کو آپس میں ہی دست وگریباں ہونے سے فرصت نہیں ہے وہ اسرائیل جیسی مضبوط حکومت کے خلاف زبانی جمع خرچ کے علاوہ کچھ بھی کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں، ان حالات میں دنیا بھر کے مسلمان مسجد اقصیٰ کے معاملہ میں پریشان بھی ہیں اور مایوس بھی، اس صورت حال میں صرف یہی ایک پیغام دیا جا سکتا ہے کہ مسلمانان عالم حرم ثالث کی پاسبانی کے لیے متحد ہوں اور اپنے اتحاد کے ذریعہ اسرائیل کی غاصب حکومت کو مسجد اقصیٰ، بیت المقدس اور ارض فلسطین سے پسپائی پر مجبور کر دیں۔

مشکلیں امت مرحوم کی آساں کردے

ہندوستان میں مسلمانوں کے اتنے مسائل ہیں کہ نہ لکھنے والے ان کے دائرے سے باہر نکلتے ہیں اور نہ پڑھنے والے، راقم السطور بھی زیادہ تر ملّی اور ملکی مسائل ومعاملات پر ہی خامہ فرسائی کرتا رہتا ہے، ہم اپنی پریشانیوں میں اتنا الجھے ہوئے ہیں کہ دنیا کے مسلمانوں پر کیا گزر رہی ہے اور وہ کس قیامت سے گزر رہے ہیں ہمیں اس کا احساس بہت کم ہوتا ہے، میانمار کے مظلوم ومقہور روہنگیا مسلمان آج جس آزمائش میں مبتلا ہیں اس کی خبریں سوشل میڈیا کے ذریعے عام ہوئیں تو دل بے چین ہو اٹھا اور آنسو چھلک پڑے، ظلم وستم، درندگی اور سفاکی کے جو مناظر سامنے آرہے ہیں ان کو دیکھنے کی تاب بھی ہر کسی میں نہیں، لگتا ہی نہیں کہ انسان اتنا بے رحم اور سفاک بھی ہوسکتا ہے جتنے بے رحم اور سفاک میانمار کے یہ بدھسٹ ہیں، زندہ انسانوں کے اعضاء بدن کاٹ کر چیل کوّوں اور کتوں کو کھلا دینا، ٹائروں میں رکھ کر جیتے جاگتے انسانوں کو آگ کے حوالے کردینا، ننھے منھے معصوم بچوں کو لوہے کی گرل میں پرو کر آگ پر بھوننا، ان کی گردنوں اور پیٹ پر پیر رکھ کر کھڑے ہونا، ان کے زخموں میں مرچیں بھر کر ان کی چیخوں پر تالیاں پیٹنا اور رقص کرنا، ان کی بستیوں کو جلا دینا، ان کے گھروں کو مسمار کردینا، کیا یہ سب انسانوں کے کام ہیں؟

اس طرح کی درندگی کی توقع تو درندوں سے بھی نہیں کی جاسکتی، بدھسٹوں کے بارے میں سنتے آئے ہیں کہ وہ بڑے امن پسند اور رحم دل ہوتے ہیں، میانمار کے واقعات پڑھ کر اور سن کر اور ان کے ظلم وستم کے لرزہ خیز مناظر کی ایک جھلک دیکھ کر تو اندازہ ہوتا ہے کہ امن ورحم تو بدھسٹوں کو چھو کر بھی نہیں گزرا، یہ لوگ تو ننگِ انسانیت ہیں، ظالم اور قاتل ہیں، امن وآشتی کے دشمن ہیں، ہٹلر اور مسولینی کے جانشین ہیں۔

انسانی حقوق کی بین الاقوامی تنظیم ایمنسٹی انٹرنیشنل کی جانب سے اقوام متحدہ کے جنرل سکریٹری کو حال ہی میں جو مکتوب لکھا گیا ہے اس کے مطابق میانمار میں فوج اور حکومتی جتھوں کی جانب سے صرف پانچ دنوں کے اندر مسلمانوں کے اکیس سو گاؤں ان کے

باشندوں سمیت نذرآتش کردیئے گئے، دس ہزار افراد بھاگتے ہوئے مارے گئے، پندرہ سو سے زائد خواتین کی عزتیں پامال کی گئیں، زندہ انسانوں کے اعضاء کاٹ کر چیل کوّوں کو کھلایا گیا، ایک لاکھ تیس ہزار افراد شدید زخمی ہیں، ایک لاکھ مسلمان جنگلوں میں محصور ہیں، بنگلہ دیشی حکومت کی سنگ دلی اور بے حسی کی وجہ سے کشتیوں پر سوار بیس ہزار مرد و زن بوڑھے، بچے اور جوان سمندر میں بھٹکتے پھر رہے ہیں، مکتوب میں یہ خیال بھی ظاہر کیا گیا ہے کہ اگر عالمی برادری کی طرف سے ان ظالمانہ کارروائیوں کو روکنے کی کوشش نہیں کی گئی تو آنے والے دنوں میں لاکھوں جانوں کے اتلاف کا المیہ رونما ہوسکتا ہے، جو لوگ زخمی ہیں وہ زخموں کی تاب نہ لاکر لقمہ اجل بن سکتے ہیں، جنگلات میں محصور ایک لاکھ افراد بھوک اور پیاس سے دم توڑ سکتے ہیں، کشتیوں پر سوار افراد بھی کب تک سمندر میں بھٹکتے رہیں گے؟ ان کی تقدیر بھی انہیں موت کے حوالے کرسکتی ہے، حیرت کی بات یہ ہے کہ عالمی برادری پوری طرح خاموش ہے، اس میں مسلم ممالک بھی شامل ہیں، ترکی کو چھوڑ کر کسی مسلم ملک کے کانوں پر جوں نہیں رینگی، کسی نے صدائے احتجاج بلند نہیں کی، اقوام متحدہ سمیت تمام عالمی ادارے، حقوق انسانیت کی علمبردار تمام تنظیمیں مہر بہ لب ہیں، کہیں سے کوئی آواز سنائی نہیں دیتی، ایسا لگتا ہے جیسے یہ کوئی خوں چکاں المیہ نہ ہو بلکہ ایک تفریحی کھیل ہو، میانمار کی پچ پر یہ کھیل مسلسل جاری ہے اور پوری دنیا تماشائی بنی ہوئی ہے۔

دنیا کے نقشے پر میانمار جس کا پُرانا نام برما ہے ایک چھوٹا سا ملک ہے، جس کی سرحدیں بنگلہ دیش، ہندوستان، تھائی لینڈ، لاؤس اور چین سے ملی ہوئی ہیں، میانمار کی پانچ کروڑ ساٹھ لاکھ کی آبادی میں ۸۹ فی صد بودھ ہیں، ۴ فی صد مسلمان ہیں یعنی تقریباً بائیس لاکھ پچاس ہزار، اتنے ہی عیسائی ہیں، ایک فی صد ہندو ہیں، اور دو فی صد دوسری مذہبی اقلیتیں ہیں، میانمار میں عیسائیوں اور ہندوؤں کے ساتھ کوئی مسئلہ نہیں ہے، صرف مسلمانوں کے ساتھ مسئلہ ہے، اس کو سمجھنے کے لیے ہمیں تاریخ میں جانا ہوگا، میانمار کی سات ریاستوں میں سے ایک ریاست کا نام اراکان ہے، جسے اب راکھیں یا راخین کردیا گیا ہے، یہ ریاست صدیوں

تک میانمار سے الگ رہی، کہتے ہیں کہ ۶۸۰ء میں عرب سے محمد بن الحنفیہ بغرض تبلیغ وتجارت یہاں آکرفروکش ہوئے جوحضرت علیؓ کے خانوادے سے تعلق رکھتے تھے، آج بھی ان کا مزار مونگنڈا کے پہاڑ کی چوٹی پر مرجع خلائق بنا ہوا ہے، محمد بن الحنفیہ کی آمد سے یہاں اسلام پھیلا، دوسرے علاقوں سے بھی مسلمانوں نے یہاں آکر بود وباش اختیار کی، اس طرح یہ علاقہ مسلمانوں سے آباد ہوا اور ایک مستقل ریاست وجود میں آگئی، ۱۷۸۴ء تک موجودہ صوبہ اراکان ایک مستقل آزاد ریاست کی حیثیت سے دنیا کے نقشے پر موجود رہا، اس کے بعد برما کی نیت خراب ہوئی اور اس نے اراکان پر قبضہ کرلیا، جس کی مسلمان مزاحمت کرتے رہے، ۱۸۸۴ء میں برطانیہ نے برما کو اپنی نوآبادیات بنایا تو اراکان بھی برطانیہ کے تسلط میں آگیا، اس زمانے میں بہت سے مسلمان تلاشِ معاش میں یہاں آئے اور یہیں کے ہوکر رہ گئے ان میں سے بڑی تعداد موجودہ بنگلہ دیش اور سابق مشرقی بنگال کے علاقے چاٹگام سے آکر یہاں آباد ہوئی، یہ لوگ جونقل مکانی کرکے اراکان میں آباد ہوئے ان کو روہنگیا مسلمان کہا جاتا ہے، میانمار کے حکمرانوں کا کہنا ہے کہ جولوگ برطانوی نوآبادیات کے دور میں یہاں آکررہ گئے وہ ہمارے ملک کے باشندے نہیں ہیں، ۱۹۶۲ء میں میانمار میں فوجی حکومت بنی اُس وقت سے غیر ملکی مسلمانوں کا مسئلہ کچھ زیادہ ہی شدت اختیار کرگیا، لاکھوں مسلمانوں کی شہریت راتوں رات منسوخ کردی گئی اور ان پرطرح طرح کی پابندیاں عائد کردی گئیں، مثلاً یہ کہ وہ پختہ مکان نہیں بنا سکتے، جانور ذبح نہیں کرسکتے، دو سے زیادہ بچے پیدا نہیں کرسکتے، قرآن نہیں پڑھ سکتے، اپنے مذہبی فرائض ادا نہیں کرسکتے، امن کا نوبیل انعام یافتہ آنگ سان سوچی کے قریبی برما کے صدر تھین سین پوری بے شرمی اور ڈھٹائی کے ساتھ کہتے ہیں کہ مسلمان ہمارے ملک کے شہری نہیں ہیں، وہ یہاں سے جائیں، ان کا تحفظ ہماری ذمہ داری نہیں ہے۔

روہنگیا مسلمانوں پر برمی افواج کا یہ سلسلۂ ظلم وستم کوئی نیا سلسلہ نہیں ہے، اس کی تاریخ بھی اتنی ہی پرانی ہے جتنی پرانی تاریخ اراکان پر برما کے قبضے کی ہے، ۱۹۴۷ء میں جب ہندوستان آزاد ہوا اسی وقت برما نے بھی آزادی حاصل کی تھی، اراکان کے مسلمان چاہتے

تھے کہ ان کو حسب سابق خودمختاری ملے، اور وہ برما کے ناجائز تسلط سے آزاد ہوں، اراکان کے مسلمانوں نے بانی پاکستان محمد علی جناح سے مل کر یہ درخواست بھی کی تھی کہ ان کو مشرقی پاکستان میں شامل کرلیا جائے، افسوس ان کی یہ درخواست قبول نہیں کی گئی ورنہ آج حالات دوسرے ہوتے، برما کی حکومت اراکان کے مسلمانوں کو اس بات کی سزا دے رہی ہے کہ وہ خودمختاری چاہتے ہیں، برما سے الگ ہونا چاہتے ہیں، برما کی حکومت کے ظلم وستم سے عاجز آکر لاکھوں روہنگیا مسلمان برسوں پہلے ترکِ وطن کرکے دوسرے ملکوں میں جابسے ہیں، اعداد وشمار کے مطابق سعودی عرب میں چار لاکھ، پاکستان میں دو لاکھ، ملیشیا میں ایک لاکھ، تھائی لینڈ میں ایک لاکھ، اور بنگلہ دیش میں تین لاکھ روہنگیائی مسلمان موجود ہیں، چند ہزار ہندوستان میں بھی پڑے ہوئے ہیں، صرف سعودی عرب نے ان مظلومین کے ساتھ عزت کا سلوک کیا ہے اور انہیں اپنے ملک کی شہریت دے کر باوقار زندگی گزارنے کا موقع دیا ہے، باقی ملکوں میں یہ لوگ اب بھی قابل رحم حالت میں ہیں، بنگلہ دیش میں ان کی حالت انتہائی نا گفتہ بہ ہے، ۱۹۴۲ء سے برمی افواج کے ظلم وستم کا جو سلسلہ شروع ہوا تھا وہ وقفے وقفے سے ابھی تک جاری ہے اور اس وقت تک جاری رہے گا جب تک اس مسئلے کا کوئی باوقار حل نہیں نکل آتا، دراصل میانمار کی حکومت یہ بات اچھی طرح جانتی ہے کہ اگر مسلمانوں کو آزاد چھوڑ دیا گیا تو وہ کسی وقت بھی اراکان کی آزادی کی جنگ شروع کرسکتے ہیں جو ان کا قانونی حق ہے، اس لیے کہ اراکان کبھی بھی برما کا حصہ نہیں رہا، اس کو طاقت کے بل بوتے پر برما میں شامل کیا گیا تھا۔

مسئلے کا فوری حل تو وہی ہے جو ترکی کے صدر طیب اردگان نے پیش کیا ہے کہ بنگلہ دیش اپنا اسلامی اور انسانی فرض نبھاتے ہوئے اپنی سرحدیں روہنگیا مسلمانوں کے لیے کھول دے، اور انہیں اپنے ملک میں آنے دے، انھوں نے بنگلہ دیش کو اخراجات دینے کی پیش کش بھی کی ہے، اس سلسلے میں دوسرے مسلمان ملکوں کو بھی فراخ دلانہ پیش کش کرکے اپنے ستم رسیدہ بھائیوں کی مدد کرنی چاہیے، اور ان کی جان بچانی چاہیے، مگر یہ مسئلے کا فوری حل ہے، کوئی

پائے دار اور مستقل حل نہیں ہے، اور نہ یہ کوئی منصفانہ حل ہے، صحیح بات تو یہ ہے کہ اراکان میں آزاد اور مستقل ریاست ۱۷۸۴ء سے ۱۷۸۴ء تک گیارہ سو سال تک قائم رہی، برما اس پر ناجائز طور پر قابض ہوا، اور اب تک قابض ہے، اقوام متحدہ کو اس سلسلے میں منصفانہ کردار ادا کرنا چاہیے، اس سلسلے میں مسلم ممالک کو بھی سامنے آنا چاہیے، اس طرح کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں جب بڑی طاقتوں نے اقوام متحدہ کے ساتھ مل کر بعض مقبوضہ علاقوں کو خودمختار ریاستوں میں تبدیل کرایا، مشرقی تیمور انڈونیشیا کے ساتھ لگا ہوا ایک چھوٹا سا ملک ہے، ۱۹۷۵ء تک یہ پرتگال کی نوآبادیات رہا، آزادی ملی تو انڈونیشیا نے اس پر قبضہ کرلیا، تیموریوں نے تحریک آزادی چھیڑ دی، ۲۰ مئی ۲۰۰۲ء کو مشرقی تیمور انڈونیشیا کے قبضے سے نکل کر آزاد ملک بن گیا، یہ سب کچھ عالمی طاقتوں کے عمل ودخل سے ہوا، یہی معاملہ جنوبی سوڈان کے ساتھ بھی پیش آیا، سوڈان کی حکومت کو امریکی اور مغربی طاقتوں کے دباؤ اور دھونس کے باعث جنوبی سوڈان سے اپنا قبضہ ہٹانا پڑا، ۲۰۱۱ء میں جنوبی سوڈان دنیا کے نئے ملک کی حیثیت سے سامنے آیا، صرف اس لیے کہ وہاں کے عوام نے ایک ریفرنڈم کے ذریعے جنوبی سوڈان کو ایک آزاد ملک بنانے کے حق میں ووٹ دیا تھا، کیا بڑی طاقتیں یہ کہانی اراکان میں نہیں دہرا سکتیں یا وہ ایسا اس لیے نہیں کریں گی کہ مشرقی تیمور اور جنوبی سوڈان میں عیسائی آباد تھے اور اراکان کی آزادی سے ایک نیا مسلم ملک وجود میں آئے گا!!

روہنگیا مسلمانوں کا درد

روہنگیا مسلمانوں کے خلاف تازہ مظالم کا سلسلہ ابھی بند نہیں ہوا، جس تسلسل کے ساتھ آگ زنی، قتل وغارت گری اور انسانی جانوں کے اتلاف کی خبریں گردش کررہی ہیں ان سے ایسا لگتا ہے کہ روہنگیا مسلمانوں کا درد اس سے کہیں زیادہ تکلیف دہ ہے جتنا ہم محسوس کررہے ہیں، یہ وہ قوم ہے جو ستر برسوں سے دکھ جھیل رہی ہے، بلکہ اگر دیکھا جائے تو اس کے دکھوں کا سلسلہ اُس وقت سے چل رہا ہے جب سے اراکان پر جہاں وہ صدیوں سے رہتی چلی آئی تھی اور جس پر اس نے ساڑھے تین سو برس تک حکومت بھی کی تھی؛ پڑوسی ملک برما کی نیت خراب ہوگئی اور اس نے اس پر قبضہ کرلیا، اگر قبضے ہی پر اذیتوں کی داستان ختم ہوجاتی تب بھی غنیمت تھا، مگر برما کی حکومت نے تو طے کرلیا تھا کہ اس چھوٹے سے ملک پر نہ صرف یہ کہ قبضہ کرکے اس کو اپنی نوآبادیات بنانا ہے بلکہ اس کے حقیقی باشندوں کو یہاں سے بھگانا بھی ہے، جیسے ہی برطانیہ نے اس علاقے سے رختِ سفر باندھا برما کو کھل کھیلنے کا موقع مل گیا، پہلے تو اُن کو غیر ملکی قرار دیا گیا، پھر ان سے تمام شہری حقوق چھین لیے گئے، اس کے بعد ان پر ظلم وستم کا ختم نہ ہونے والا سلسلہ شروع ہوا تاکہ وہ گھبرا کر یہاں سے چلے جائیں، بھلا یہ کیسے ممکن تھا کہ لاکھوں لوگ اپنے باپ دادا کی سرزمین سے یوں بے آسرا ہوکر نکل پڑیں، پھر بھی جس کو موقع ملا وہ نکلا، اس طرح لاکھوں لوگ ترکِ وطن کرکے دوسرے ملکوں میں جا پڑے، زیادہ تر ان ملکوں میں جوان بے یارومددگار مسلمانوں سے اخوتِ اسلامی کے رشتے میں بندھے ہوئے تھے، ایک آدھ ملک کو چھوڑ کر باقی ملکوں میں بھی ان کی حالت قابل رحم ہی ہے، بس اتنی بات ہے کہ اب وہ قتل گاہوں میں نہیں ہیں، البتہ زندگی کی سہولتوں سے اب بھی محروم ہیں، یہی کیا کم ہے کہ زندہ ہیں، اللہ ہی جانتا ہے کہ ان مظلوم روہنگیا مسلمانوں کی قسمت میں کیا لکھا ہے، جہاں تک مسلمانانِ عالم کی بات ہے وہ ان کی حالت زار پر دل سے رنجیدہ ہیں، مگر دعا کرنے اور آنسو بہانے کے سوا وہ کربھی کیا سکتے ہیں۔

روہنگیا مسلمانوں کے خلاف شدومد کے ساتھ یہ پروپیگنڈہ کیا جارہا ہے کہ وہ

موجودہ حکومت کے خلاف برسرِ پیکار ہیں، میانمار کی فوج محض اپنا دفاع کر رہی ہے، حالاں کہ حقیقت اس کے برعکس ہے، جہاں تک روہنگیا مسلمانوں کی بات ہے ان میں نہ حوصلہ ہے، نہ ہمت اور نہ ان کے پاس اتنے وسائل ہیں کہ وہ حکومت کے خلاف ہتھیار اٹھا سکیں، وہ بے چارے سر تو اٹھا نہیں سکتے ہتھیار کیا اٹھائیں گے، یہ محض پروپیگنڈہ ہے جس کا پردہ فاش ایک بین الاقوامی تنظیم ''ہیومن واچ'' نے سیٹلائٹ سے لی گئی تصویروں کے ذریعہ کیا ہے، ان تصویروں میں صاف نظر آرہا ہے کہ میانمار کی فوجیں کس طرح مسلمانوں کی آبادیوں میں گھس کر قتل عام کر رہی ہیں اور کس طرح ان کے گھروں کو نذرِ آتش کیا جا رہا ہے، انسانی حقوق کی دوسری عالمی تنظیم فور فائیورائٹ نے بھی عینی مشاہدین کے حوالے سے بتلایا ہے کہ میانمار کے فوجیوں نے بڑی تعداد میں روہنگیا عورتوں کو گرفتار کرکے بانس کے بنے ہوئے جھونپڑے میں بند کر دیا اور اسے آگ لگادی، عام طور پر حکومت صحافیوں اور عالمی اداروں کے نمائندوں کو اراکان جانے کی اجازت نہیں دے رہی ہے، لیکن بی بی سی کا ایک نمائندہ دوسرے کچھ صحافیوں کے ساتھ کسی نہ کسی طرح وہاں پہنچ گیا، واپسی پر اس نے جو رپورٹ شائع کی ہے وہ آنکھیں کھول دینے والی ہے اس کے ساتھ ہی وہ میانمار کے حکام کے دعووں کی قلعی بھی کھول رہی ہے، ان صحافیوں کو سخت پہرے میں لے جایا گیا اور ان مقامات سے دور رکھا گیا جہاں زندہ جلا دینے کے واقعات رونما ہوئے ہیں اور جہاں ان کی پوری کی پوری آبادیاں تہِ تیغ کر دی گئی ہیں، انہیں ایسے لوگوں سے ملایا گیا جو حکومت کے خلاف لب کشائی کرنے کے لیے تیار نہیں تھے، اس کے باوجود ان صحافیوں نے اپنی تجربہ کار آنکھوں سے بہت کچھ دیکھ لیا، حفاظتی ٹیم سے نظر بچا کر لوگوں سے بہت کچھ سن بھی لیا، انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ جگہ جگہ آگ کے شعلے بلند ہو رہے ہیں اور دور علاقوں سے دھواں اٹھ رہا ہے، ایسے ہی ایک گاؤں میں وہ لوگ حفاظتی گھیرا توڑ کر پہنچے تو انہوں نے دیکھا کہ پولیس کی موجودگی میں بودھ مذہب کے پیروکار نوجوان گھروں کو آگ لگا رہے ہیں، ان صحافیوں کو اچانک اپنے روبرو دیکھ کر وہ لوگ بھاگ کھڑے ہوئے لیکن دیکھنے والوں کو وہ حقیقت نظر آگئی جو دنیا سے چھپانے کی کوشش کی

جارہی تھی، اس وقت ساری دنیا میں ان مظالم کے خلاف مظاہرے ہورہے ہیں، جکارتہ، واشنگٹن، ماسکو، لندن سب جگہ سے خبریں آرہی ہیں، اگر سناٹا ہے تو مسلم ملکوں میں، او آئی سی تنظیم سے بڑی امیدیں تھیں لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان واقعات کے صدمے نے اسے سکتے میں ڈال دیا ہے۔

درحقیقت یہ مسئلہ مسلم ملکوں کی دلچسپی اور بڑے ملکوں کی مداخلت کے بغیر حل نہیں ہوسکتا، ترکی، ایران اور پاکستان کے علاوہ اب تک کسی مسلم ملک نے لب کشائی کی جرأت نہیں کی، اس میں بھی ایران و پاکستان زبانی جمع خرچ سے آگے نہیں بڑھے، ترکی نے کچھ عملی اقدامات ضرور کیے ہیں مگر کوئی ٹھوس قدم اس نے بھی نہیں اٹھایا، بلاشبہ صدر طیب اردگان کی بیگم بنگلہ دیش پہنچیں، انہوں نے خانماں برباد روہنگیا مسلمانوں کے کیمپوں کا دورہ کیا، وہ خواتین سے گلے بھی ملیں، انہوں نے بچوں کے سروں پر دست شفقت بھی رکھا، جوانوں کی ڈھارس بھی بندھائی، وہ پھوٹ پھوٹ کر بھی روئیں، وہ بنگلہ دیش کی وزیراعظم شیخ حسینہ سے بھی ملیں، صدر طیب اردگان اعلان کرچکے ہیں کہ بنگلہ دیش میں آنے والے روہنگیا پناہ گزینوں کے تمام مصارف وہ برداشت کریں گے، خبر آئی ہے کہ شیخ حسینہ کی حکومت نے دو ہزار ایکڑ زمین پر ان مہاجرین کی بازآبادکاری کا فیصلہ کیا ہے، ان تمام خبروں کا خیر مقدم کیا جانا چاہیے، مگر یہ سوال اپنی جگہ باقی رہے گا کہ کیا یہ سب کچھ اس مسئلے کا حل ہے؟ آخر ترکی، ایران، پاکستان، سعودی عرب جیسے بااثر مسلم ممالک میانمار کی حکومت پر دباؤ کیوں نہیں ڈالتے؟ کیوں وہ امریکہ اور روس جیسی بڑی طاقتوں کو اس معاملے میں مداخلت پر آمادہ نہیں کرتے؟ یو این او صرف بیان بازی کررہا ہے، کیا یہ ایسا مسئلہ نہیں ہے کہ سلامتی کونسل کی ہنگامی میٹنگ طلب کی جاتی اور میانمار کی حکومت کو آڑے ہاتھوں لیا جاتا، مگر یہ اسی وقت ہوتا جب مسلم ممالک چاہتے، وہ تو خاموش ہیں، مہر بلب ہیں، آنکھیں بند کیے اور کانوں میں روئی ٹھونسے بیٹھے ہیں، اگر ان ملکوں کا یہی حال رہا تو کچھ ہی دنوں میں اراکان مسلمانوں سے خالی ہوجائے گا یا تو وہ لاشوں کا ڈھیر بن جائیں گے، یا سمندروں کی آغوش میں سماجائیں گے، جو

بچ جائیں گے وہ بنگلہ دیش جیسے کسی غریب ملک میں در در کی ٹھوکریں کھاتے پھریں گے، خدا کی زمین ان بے چارے روہنگیا مسلمانوں پر تنگ ہوتی چلی جارہی ہے، ہندوستانی حکومت نے بھی اعلان کیا ہے کہ جو چند ہزار روہنگیا مسلمان یہاں پڑے ہوئے ہیں ان کو باہر نکال دیا جائے گا، یہ خبران مظلوم، بے کس اور لاچار پناہ گزینوں کے لیے کسی ایٹم بم سے کم نہیں ہے، وہ نہیں چاہتے کہ انہیں یہاں سے واپس بھیجا جائے، وہ لوگ واپس جانے کے بہ جائے مرجانا پسند کریں گے کیوں کہ وہ سمجھتے ہیں کہ یہاں مرکر چند گز کفن کا کپڑا اور دو گز قبر کی زمین تو مل جائے گی، برما میں تو انہیں زندہ جلا دیا جائے گا اوران کی بے گوروکفن لاشیں چیل کوّوں کے لیے چھوڑ دی جائیں گی، خبر آئی ہے کہ ان پناہ گزینوں نے سپریم کورٹ سے درخواست کی ہے کہ انہیں واپس نہ بھیجا جائے۔ اس سلسلے میں سپریم کورٹ کا فیصلہ کیا ہوگا، ابھی کچھ نہیں کہا جاسکتا البتہ مودی حکومت کے تیور بتلا رہے ہیں کہ وہ ہر حال میں ان بے چاروں کو باہر کا راستہ دکھلائے گی، کیوں کہ بد قسمتی سے یہ صرف پناہ گزین نہیں ہیں بلکہ مسلمان بھی ہیں اور یہی ان کا جرم ہے جس کی انہیں سزا ملے گی۔

اس انسانی المیّے کے تناظر میں دو خبریں اور بھی ہیں جن کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا، ایک تو ہمارے ملک کے ہر دل عزیز وزیر اعظم کا دورۂ میانمار جو ٹھیک اس وقت ہوا جب وہاں ظلم کی چکّی پوری رفتار سے چل رہی تھی، ایک بڑے جمہوری ملک کے وزیر اعظم سے یہ توقع ضرور تھی کہ اس المیے پر وہ کچھ نہ کچھ ضرور بولیں گے اور میانمار کی حکومت سے کہیں گے کہ وہ اپنے شہریوں کا قتل عام بند کرے، مگر تین دن کے اس دورے میں اس حوالے سے وہ مکمل طور پر خاموش رہے، کہنے والے تو یہاں تک کہہ رہے ہیں کہ شاید انہوں نے آنگ سان سوچی کی پیٹھ ضرور تھپ تھپائی ہوگی اور ان سے پوچھا ہوگا کہ آخر انہوں نے مسلمانوں کا یہ حشر کیسے کیا ہمیں بھی یہ طریقہ بتلاؤ، ہمارے یہاں بھی مسلمانوں نے بڑا اسر اٹھا رکھا ہے، ہمیں بہر حال یہ امید نہیں ہے کہ ایک جمہوری ملک کے وزیر اعظم نے ایسا کہا ہوگا۔ دوسری خبر یہ ہے کہ اسرائیلی حکومت نے میانمار کو اسلحے کی فراہمی کا سلسلہ تیز کر دیا ہے یہ خبر کسی اور نے نہیں بلکہ

اسرائیل کے سرکاری اخبار آرٹض نے جاری کی ہے، اس کے مطابق ہتھیار برآمد کرنے والے اسرائیلی ادارے کے سربراہ میشل بن ہاروخ نے گزشتہ دنوں میانمار کا دورہ بھی کیا تھا، بعض مبصرین کا کہنا ہے کہ اسرائیل اور میانمار کے درمیان تعلقات میں گرم جوشی کے بعد سے ہی روہنگیا مسلمانوں کے خلاف حملوں میں شدت پیدا ہوئی ہے اور ان کے نسلی تصفیے کا عمل تیز ہوگیا ہے، ان تین خبروں کو ملا کر کون سی خبر بننے جارہی ہے اسے آپ بھی جانتے ہیں اور ہم بھی!

جمعیت کیا ہےاور جمعیت کا نصب العین کیا؟

دیو بند کی سرزمین جمعیت علمائے ہند کے اجلاس عام میں شرکت کرنے والے مہمانوں کے لئے پلکیں بچھائے سراپا انتظار بنی ہوئی ہے، یہ پہلا موقع ہے کہ جمعیت کا کوئی اجلاس اتنے وسیع پیمانے پر دیو بند میں منعقد ہوگا، اگر چہ دیو بند بڑی مختصر جگہ ہے مگر اس میں پھیلنے کی بڑی گنجائش ہے، دارالعلوم دیو بند کے صد سالہ اجلاس منعقدہ 1980 میں یہ تجربہ ہو چکا ہے جب لاکھوں لوگوں کا سیلاب اس قصبے کی وادیوں میں ٹھہرا تھا، آج پھر اس اجلاس میں لاکھوں لوگوں کی آمد کی نوید ہے۔

آج کی نسل نہیں جانتی کہ جمعیت علما کیا ہےاور دیو بند سے اس کا رشتہ کیا ہے، اس کے اغراض ومقاصد کیا ہیں اور اس نے ہندوستان کیمسلمانوں کے لیے وہ کون سی خدمات انجام دی ہیں کہ آج قیادت ماضی کے اس اثاثے کو سینے سیلگائے آگے بڑھ رہی ہے؟ اس ملک میں اور بھی جماعتیں ہیں مگر کسی کا ماضی اس قدر تابناک نہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ جن بزرگوں نے جمعیت قائم کی، اس کو پروان چڑھایا، اس کے فکری ارتقا میں حصہ لیا ان میں اخلاص بھی تھا، سوز بھی تھا، تڑپ بھی تھی، خدمت کا جذبہ بھی تھا، آج بھی یہ جماعت ایک تناور درخت کی طرح کھڑی ہوئی ہے، اگر چہ آندھیوں کے تھپیڑوں نے اسے ہلانے کی کوشش بھی کی مگر ان کی جڑیں اتنی گہری ہیں کہ تیز وتند تھپیڑے بھی اس پر اثر انداز نہ ہو سکے، آخر کیا وجہ ہے کہ لوگ اس جماعت کی ایک آواز پر دیوانوں کی طرح دوڑتے ہیں، یہ تو خیر دیو بند ہے جس کی سرزمین میں اللہ نے مقناطیسی کشش رکھ دی ہے، لوگ بات بے بات ہی یہاں کھنچے چلے آتے ہیں دیکھا یہ گیا ہے کہ جمعیت کا ہر اجلاس شریک ہونے والوں کی کثرت سے تاریخی بن جاتا ہے، دلی، بمبئی اور حیدرآباد جیسے مصروف شہر بھی یہ منظر دیکھ چکے ہیں کہ وسیع وعریض پنڈال بھی کثرت ہجوم کی وجہ سے اپنی تنگ دامانی کا شکوہ کرتا نظر آتا ہے، دہلی کے رام لیلا میدان کو انسانی سروں سے بھر دینے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا لیکن اس جماعت نے متعدد مرتبہ یہ کارنامہ انجام دیا ہے، کیا ہے وہ راز جو اس جماعت کو عوامی حلقوں میں اس قدر مقبول بنائے

ہوئے ہے کہ لوگ موسم کے سرکردہ گرم مزاج کی پرواہ کئے بغیر اس کی ایک آواز پر دوڑے چلے جاتے ہیں، میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ دارالعلوم دیوبند کی طرح یہ جماعت بھی اہل دل کی روحانی توجہات کا مرکز ہے، ماضی میں اس جماعت کے بزرگوں نے ملت اسلامیہ کی جو بے لوث خدمت کی ہے اس نے اس جماعت کو دلوں کی دنیا کا بے تاج بادشاہ بنا دیا ہے، یہی وجہ ہے کہ تقسیم در تقسیم کے متعدد مرحلوں سے گزرنے کے باوجود اور خاندانی اجارہ داری سے لے کر ملی مسائل میں علیحدگی پسندی کے رجحان اور عملی میدان میں سست روی کے الزمات کے باوجود یہ جماعت اپنا وجود برقرار رکھے ہوئے ہے، بلکہ اپنی جگہ بڑی مستحکم ہے، اس کا نیٹ ورک بڑا وسیع اور مضبوط ہے، کشمیر سے کنیا کماری تک ہر جگہ اس کی شاخیں ہیں، لوگ اس سے جڑنا چاہتے ہیں، اس کے ساتھ مل کر کام کرنا چاہتے ہیں، سرکاری حلقوں میں اس کو اہمیت دی جاتی ہے، اس کی آواز سنی جاتی ہے، پاکستان، بنگلہ دیش، برطانیہ، ساؤتھ افریقہ، امریکہ اور دوسرے ملکوں میں بھی اس جماعت کو آئیڈیل بنا کر کام ہو رہا ہے، اس جماعت کے چراغ وہاں بھی روشنی پھیلا رہے ہیں، یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔

مولانا وحیدالدین خاں
فکری کج روی اور ذہنی دیوالیہ پن کی علامت

مولانا وحیدالدین خاں اپنی متنازعہ تحریروں، غیر ضروری مجادلوں اور مناقشوں کی بنا پر کافی شہرت حاصل کر چکے ہیں، سنگھ پریوار کی دوستی نے انہیں قومی ذرائع ابلاغ میں بھی کافی مقبول بنا دیا ہے، حالاں کہ عموماً کسی مسلمان شخصیت کو اس طرح کی پذیرائی نہیں ملتی، لیکن کیوں کہ وہ پورے تسلسل کے ساتھ اس طرح کے خیالات ظاہر کرتے رہتے ہیں جن سے مسلمانوں کی دل آزاری ہوتی ہے اس لیے ہندی اور انگریزی میڈیا کے لوگ انہیں سر آنکھوں پر بٹھاتے ہیں، ان کا مزاج منفی ہے، اختلافی اور تنقیدی تحریروں اور تقریروں سے ان کو طبعی مناسبت ہے، جب وہ کسی پر تنقید کرتے ہیں تو تمام آداب واخلاق اٹھا کر رکھ دیتے ہیں، ان کا اندازِ تحریر جارحانہ اور غیر منصفانہ ہوتا ہے، وہ خود ساختہ دلائل پر اپنی تنقید کی عمارت تعمیر کرتے ہیں، ان کی تحریروں میں اغلاط اور تضادات کی بھرمار ہوتی ہے، انہوں نے عظیم اسلامی شخصیات اور تحریکات کو اپنی تحریروں کے ذریعے جارحانہ تنقید کا نشانہ بنایا، بعض محترم اسلامی شخصیتوں کی طرف غلط باتیں منسوب کر کے وہ انہیں بے دین، ملحد، زندیق اور جہنمی تک ٹھہرا چکے ہیں اسلامی تحریکات کے متعلق ان کا عام خیال یہ ہے کہ وہ اپنے مقاصد میں ناکام ہی نہیں بلکہ اسلام کے حق میں نقصان دہ رہی ہیں، ان کی جرأت اور بے باکی اس حد تک بڑھی ہوئی ہے کہ وہ اسلام کے مسلمہ اصول وعقائد اور تصورات ومعتقدات پر بھی تیشہ زنی کرنے سے نہیں چوکتے۔

وہ ایک اچھے مصنف اور صاحب قلم ضرور ہیں، عصری علوم اور اسلامی مآخذ پر بھی ان کی گہری نظر ہے، ان کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ معمولی معمولی باتوں کا گہرائی سے مشاہدہ کرتے ہیں اور ان سے بڑے بڑے نتائج اخذ کر لیتے ہیں، شستہ اسلوب میں منطقی اور معروضی طرزِ استدلال نے ان کو پڑھنے والوں میں نہایت مقبول بنا دیا تھا مگر وہ اپنی یہ مقبولیت برقرار نہ رکھ سکے اور بہت جلد تجدد پسندوں میں محدود ہو کر رہ گئے۔

مولانا وحیدالدین خاں کا المیہ یہ ہے کہ وہ خود کو عقلِ کل تصور کرتے ہیں، ان کا خیال یہ ہے کہ مزاجِ اسلام اور تاریخ اسلام کو جس قدر انہوں سمجھا ہے کسی دوسرے عالم نے نہیں سمجھا، وہ غرور علم کے مرض میں مبتلا ہیں اور خود کو کسی مجدد سے کم نہیں سمجھتے ''الرسالہ'' میں ان کی غیر متوازن تحریریں اسلام پسندوں کے لے سوہانِ روح بنی رہتی ہیں، مذہب کے متعلق ان کا خیال ہے کہ یہ انسان کا نجی معاملہ ہے، وہ سمجھتے ہیں کہ اسلام چند معتقدات کا مجموعہ ہے مکمل نظام حیات نہیں ہے، وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ فہمِ قرآن کے لیے علوم قرآن کی ضرورت نہیں ہے، احادیث کا بڑا ذخیرہ موضوع اور من گھڑت ہے، فقہ نے امت اسلامیہ کو انتشار اور افتراق میں مبتلا کیا ہے، تصوف امت کے لیے کسی زہر قاتل سے کم نہیں ہے، اسلامی حدود وتعزیرات مبنی بر انصاف نہیں ہیں دین اسلام مکمل اور جامع دین نہیں ہے، انہوں نے امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ، امام شافعیؒ، امام احمد بن حنبلؒ، امام ابن تیمیہؒ جیسی مسلّم اور قابل احترام شخصیتوں کا مذاق اڑایا اور ان کی خدمات کو ردّی کی ٹوکری میں ڈالے جانے کے قابل گردانا، انہوں نے نواسۂ رسول حضرت حسینؓ پر بھی تیز وتند تنقیدیں کی ہیں، حضرت مجدد الف ثانیؒ بھی ان کے تیر ونشتر سے نہ بچ سکے، حضرت شاہ ولی اللہؒ اور ان کے علمی خانوادے کا ہر فرد ان کی جارحانہ تنقید کا نشانہ بنا، انہوں نے حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ سمیت تمام اکابر دیوبند کا جی بھر کے مذاق اڑایا، وہ شاعر اسلام ڈاکٹر علامہ محمد اقبالؒ کو بھی ہدف ملامت بناتے رہے، نہ ان کے یہاں کسی عالم دین کا احترام ہے، نہ کسی مصلح امت کا، نہ کسی مجدد وقت کا، نہ مفسر ومحدث کا، نہ مجتہد وفقیہ کا، نہ غازی وشہید کا، ''الرسالہ'' کے صفحات بھرے پڑے ہیں جس کا جی چاہے دیکھ لے کہ امت کی قابل احترام شخصیتوں کی کس طرح کردار کشی کی گئی ہے، اور کس طرح ان کی خدمات کو خاک میں ملانے کی کوشش کی گئی ہے۔

ان کے یہاں تو رسولِ خدا حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی وہ درجہ ومقام نہیں ہے جو ایک مومن کامل کے دل میں ہونا چاہیے اور جو اس کی تحریروں وتقریروں میں جھلکنا

چاہیے، یہی وجہ ہے کہ وہ تمام انبیاء کے مقابلے میں سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی افضلیت کے بھی قائل نہیں ہیں، اگر کسی مسلمان نے شاتم رسول سلمان رشدی اور دریدہ دہن اور گستاخ مصنفہ تسلیمہ نسرین کی حمایت کی ہے تو وہ وحید الدین خاں ہیں، ملّی تحریکوں اور تنظیموں سے انہیں خدا واسطے کا بیر ہے، کوئی ہندو مسلم قضیہ ایسا نہیں ہے جس میں وہ مسلمانوں کو قصور وار نہ ٹھہراتے ہوں بابری مسجد کی شہادت پر انہوں نے خوشی سے بغلیں بجائیں، وہ اس مسجد کو ہمیشہ غاصبانہ قرار دیتے رہے اور مسلمانوں کو یہ تلقین کرتے رہے کہ وہ اس پر اپنے دعوے سے دست بردار ہو جائیں اور اس کی زمین رام مندر کی تعمیر کے لیے چھوڑ دیں، ہم نے یہ تمام باتیں پورے احساسِ ذمہ داری کے ساتھ لکھی ہیں، اس مختصر مضمون میں یہ گنجائش نہیں کہ ان کے افکارِ عالیہ کے کچھ نمونے یہاں پیش کیے جائیں جو لوگ ان کی فکری گمراہیوں کا تجزیہ کرنا چاہتے ہیں وہ مندرجہ ذیل کتابیں ضرور پڑھیں: ''فکر کی غلطی'' (مولانا عتیق احمد بستوی) ''اسلام میں اہانت رسول کی سزا''، ''وحید الدین خاں علماء اور دانش وروں کی نظر میں'' (ڈاکٹر محسن عثمانی ندوی) ''وحید الدین خاں کی گمراہیاں'' (حکیم اجمل خاں) ''مدیر الرسالہ اور تبلیغی جماعت'' ''مولانا وحید الدین خاں اور مسئلہ بابری مسجد'' مولانا وحید الدین خاں کی تنقیدیں'' (جناب محمد اشفاق حسین)۔ ''قیامت کی نشانیاں اور مولانا وحید الدین خاں کے نظریات'' (ندیم الواجدی)

حال ہی میں انہوں نے میانمار کے ستم رسیدہ روہنگیا مسلمانوں کے زخموں پر بھی نمک پاشی کی ہے، ''الرسالہ'' کے ایک مضمون میں ارشاد فرماتے ہیں: ''روہنگیا مسلمانوں کے بارے میں میری رائے صرف ایک ہی ہے، اور وہ ہے! روہنگیا مسلمانوں کا معاملہ ظلم کا نہیں ہے، بلکہ مسلم رہ نماؤں کی طرف سے اختیار کیے گئے غلط سیاسی موقف کے نتیجے میں پیدا ہونے والے انجام کا ہے، جس کو روہنگیا کے مسلم لیڈروں نے بھڑکا کر ان کے لیے جذباتی ایشو بنا دیا، اگر تصویر کے دونوں رخوں کو دیکھا جائے تو اس سے ایک آدمی اس نتیجے پر پہنچے گا کہ روہنگیا مسلمان ظلم کا شکار نہیں ہیں۔'' یہ ہے وہ موقف جو انہوں نے میانمار کے حالیہ واقعات کے

سلسلے میں اختیار کیا ہے، انہیں اس کی پرواہ نہیں ہے کہ زمینی حقیقت کیا ہے، اور دنیا کیا کہہ رہی ہے، ان کے خیال میں میانمار کی جمہوری حکومت مسلمانوں کو تشدد کا نشانہ بنانے میں حق بہ جانب ہے، کیوں کہ وہ بغاوت کو کچل رہی ہے جو اس کا آئینی حق ہے، اپنے کسی درسی ساتھی کی شہادت کی بنا پر جو برما کا رہنے والا تھا انہوں نے بدھسٹوں کی تحسین بھی کی ہے کہ وہ بڑے اچھے لوگ ہیں، مولانا نے اراکان (موجودہ نام راکھین) میں مسلمانوں کی آمد کی تاریخ پر بھی روشنی ڈالی ہے اور اسے برما کا ایک صوبہ قرار دیتے ہوئے لکھا ہے کہ صدیوں تک اراکان کے مسلمان برما کے باقی لوگوں کے ساتھ پرامن زندگی بسر کرتے رہے، اور یہ پرامن حالت اس وقت تک باقی رہی جب تک کہ ان کے درمیان علیحدگی پسند رجحانات پیدا نہیں ہوئے۔

روہنگیا مسلمانوں کا معاملہ اس وقت بین الاقوامی سطح پر بحث کا موضوع بنا ہوا ہے، اقوام متحدہ سمیت انسانی حقوق کی بین الاقوامی تنظیموں اور متعدد ممالک نے میانمار کی حکومت سے مطالبہ کیا ہے کہ وہ مسلمانوں پر ظلم وتشدد کا سلسلہ بند کرے اور جو لاکھوں مسلمان وہاں کی فوج اور عوام کے ظلم وستم سے عاجز آکر پڑوسی ملکوں کی طرف ہجرت کر گئے ہیں انہیں واپس لاکر دوبارہ آباد کرے، خود ہندوستان میں بھی چالیس ہزار کے قریب تارکین وطن روہنگیا مسلمان بے سروسامانی کی حالت میں بے یارومددگار پڑے ہوئے ہیں، مودی حکومت نہیں چاہتی کہ وہ لوگ یہاں رہیں، حالاں کہ ہندوستان کے مسلمان اور یہاں کے سیکولر مزاج اور انصاف پسند ہندو نہیں چاہتے کہ ان مظلوموں کو ملک بدر کیا جائے، اس سلسلے میں سپریم کورٹ ایک کیس کی سماعت بھی کررہا ہے، پناہ گزینوں کی طرف سے پیروی کرنے والے ایک نامی گرامی ہندو وکیل ہیں، حقیقت تو یہ ہے کہ روہنگیا مسلمانوں کو یہاں سے نکالنا انسانیت کے منافی تو ہے ہی بین الاقوامی قوانین کے بھی خلاف ہے، مگر ہماری حکومت پوری سنگ دلی کا مظاہرہ کررہی ہے، دوسری طرف وہ سری لنکا، پاکستان اور بنگلہ دیش سے آنے والے ہندو تارکین وطن پر مہربان ہے، صاف ظاہر ہے کہ وہ روہنگیا پناہ گزینوں کو اس لیے ملک بدر کرنا چاہتی ہے کہ وہ مسلمان ہیں، ایسے ماحول میں اور ان دل گداز حالات وواقعات کے تناظر میں

مولانا وحیدالدین خاں کی تحریر انتہائی تکلیف دہ اور بدبختانہ ضرور ہے مگر حیرت انگیز نہیں ہے، بلکہ میں تو یہاں تک کہوں گا کہ اگر وہ یہ سب کچھ نہ لکھتے تو مجھے حیرت ہوتی، یہ تو خیر رو ہنگیا مسلمانوں کا معاملہ ہے وہ تو فلسطینیوں کی جدوجہد کی بھی تائید نہیں کرتے، انہوں نے ''الرسالہ'' (شمارہ اپریل ۲۰۰۹ء) میں قرآن کریم کی ایک آیت کے حوالے سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ارض فلسطین یہودیوں کا جائز اور حقیقی وطن ہے، یہودی ظالم نہیں مظلوم ہیں، ان کے خلاف سیاسی یا فوجی اقدام کرکے ان کو وطن سے نکالنا غلط ہے، کیوں کہ اس وطن کا وارث اللہ نے انہیں بنایا ہے، احقر نے اسی وقت اپنے ایک مضمون کے ذریعے مولانا کے ان خیالات کا تعاقب کیا تھا اور انہوں نے قرآنی آیات کو توڑ مروڑ کر جس طرح اپنے حق میں استعمال کیا ہے اس کا جائزہ لیا تھا، میرا یہ مضمون اس وقت کے اخبارات میں چھپ چکا ہے اور میری کتاب ''قیامت کی نشانیاں اور مولانا وحیدالدین خاں کے نظریات'' میں بھی شامل ہے، وہاں اس کی تفصیل دیکھی جاسکتی ہے، یہاں صرف اتنا عرض کرنا ہے کہ مولانا وحیدالدین خاں اپنے لیے ہر معاملے میں بالکل الگ راستے کا انتخاب کرتے ہیں، خواہ وہ راستہ امت کے سواد اعظم کی راہ سے ہٹ کر کیوں نہ ہو، جو نظریہ وہ قائم کرتے ہیں اس کی بنیاد خود ساختہ دلائل پر ہوتی ہے، حقائق سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہوتا، اب اراکان کے متعلق ان کے خیالات ہی کو لے لیجیے وہ یہ مانتے ہیں کہ یہاں مسلمان آئے، ان کے اخلاق اور عادات سے متأثر ہوکر یہاں کے لوگوں نے بڑی تعداد میں اسلام قبول کیا، مگر وہ یہ نہیں مانتے کہ اسلام کے حلقہ بہ گوشوں کی تعداد اس قدر بڑھی کہ اس علاقے میں اسلامی حکومت قائم ہوگئی، اور یہ حکومت ۱۷۸۴ء تک قائم رہی، وہ یہ کہتے ہیں کہ اراکان صدیوں سے برما کا صوبہ رہا ہے مگر وہ یہ نہیں بتلاتے کہ بدھسٹوں نے فوجی کارروائی کے ذریعے ایک آزاد اسلامی ریاست اراکان کو اپنے ملک میں شامل کرلیا تھا، مولانا تو بڑا وسیع مطالعہ رکھتے ہیں، اس موضوع پر سینکڑوں کتابیں موجود ہیں کاش وہ ایک انگریزی کتاب ''The Muslim of Burma'' ہی دیکھ لیتے جس کے مصنف Moshhe yogar ہیں اور جس میں انہوں نے

اراکان کے وجود سے لے کر آج تک کی مفصل تاریخ رقم کردی ہے۔

مولانا فرماتے ہیں کہ روہنگیا مسلمانون کو ان کی بغاوت کی سزامل رہی ہے، اوّل تو ہمیں یہ تسلیم ہی نہیں کہ دبے کچلے اور بھوکے ننگے لوگ مسلح بغاوت بھی کرسکتے ہیں، اور اگر اسے تسلیم بھی کرلیا جائے تو کیا ان کی یہ جدوجہد غلط قرار دی جائے گی، آخر ان سے ان کا ملک چھینا گیا، پھر اس ملک میں ان کا جینا دوبھر کیا گیا، ان سے حقوقِ شہریت چھین لیے گئے، ان کی مسجدیں مدرسے سب بند کردیئے گئے، ان کے گاؤں دیہات سب جلا کر خاک کردیئے گئے، اگر کچھ لوگ ان میں سے اٹھ کھڑے ہوئے ہوں اور انہوں نے جدوجہد کا راستہ اپنایا ہو تو کیا غلط ہے، اس طرح تو ہندوستان کی تحریک آزادی پر بھی سوالیہ نشان لگ سکتا ہے، انگریز بھی تو بدھسٹوں کی طرح ہمارے ملک پر قابض ہوئے تھے، ویسے بھی مولانا وحید الدین خاں کو یہ بتلانا چاہیے کہ اراکان میں مسلمانوں کی کون سی اور کتنی مسلح تنظیمیں سرگرم ہیں، اور ان کی جدوجہد کے نتیجے میں بدھسٹوں کو کتنا جانی اور مالی نقصان اٹھانا پڑا ہے؟ اس کے برعکس وہاں مسلمانوں کی جو حالتِ زار ہے وہ ساری دنیا پر عیاں ہے، یہاں تک کہ اقوام متحدہ نے اپنی ایک رپورٹ میں راکھین کے روہنگیا مسلمانوں کو ''دنیا کی مظلوم ترین اقلیت'' قرار دیا ہے، ہوسکتا ہے مولانا وحید الدین خاں کو اس طرح کی تحریروں سے کچھ وقتی فائدہ پہنچ جائے مگر اس عارضی زندگی کے بعد وہ خالق کائنات کی بارگاہ میں حاضر ہوکر اپنے ان نظریات وخیالات کی کیا توجیہ اور تاویل کریں گے جو وہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف وقتاً فوقتاً ظاہر کرتے رہتے ہیں؟!

ملت اسلامیہ کے دو عظیم معمار
مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور سرسیّد احمد خاںؒ

۱۷/ اکتوبر کو سرسید ڈے منایا جاتا ہے، یہ روایت سال ہا سال سے چلی آرہی ہے، پوری دنیا میں جہاں جہاں علیگرین حضرات ہیں، اس دن کا بڑا اہتمام کرتے ہیں، سرسید احمد خان مرحوم کی شخصیت اور ان کے کارناموں پر روشنی ڈالی جاتی ہے، ان کو یاد کیا جاتا ہے، بلاشبہ وہ ہندوستانی مسلمانوں کے عہد زوال کے ایک عظیم انسان تھے، جنہوں نے علی گڑھ کالج کی بنیاد رکھی اور ایک زوال آمادہ قوم کو تعلیم کے زیور سے آراستہ کرنے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگادی، اپنوں اور غیروں نے ہزار مخالفتیں کیں لیکن کوئی بھی مخالفت ان کے پائے ثبات کو جنبش نہ دے سکی، بلاشبہ علی گڑھ کے فیض یافتگان کا حق ہے بلکہ یہ ان کا فرض ہے کہ اس عظیم معمار کی یادوں سے اپنے دل کے نہاں خانے روشن رکھیں اور اس کی خدمات کو خراجِ تحسین پیش کرتے رہیں، اسی دور خزاں کی ایک اور عظیم شخصیت جس نے ۱۸۵۷ء کی جنگ سے برباد اور مایوس قوم کے لیے بے آب وگیاہ سرزمین ہند میں علم کے نخلستان لگائے وہ مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کی ہے، جس وقت سرسید احمد خان جوانی کی دہلیز پر قدم رکھ رہے تھے ٹھیک اسی وقت مغربی یوپی کے ایک چھوٹے سے قصبے نانوتہ میں یہ شخصیت عالم وجود میں قدم رکھ رہی تھی، سرسید کی تاریخ پیدائش ۱۷/ اکتوبر ۱۸۱۷ء ہے، جب کہ مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے ۱۸۳۲ء میں اس بزم ہست وبود کو رونق بخشی، یہ عجیب اتفاق ہے کہ دونوں کا تعلق مغربی یوپی کے مردم خیز علاقے سے ہے، اور اس سے بھی زیادہ عجیب اتفاق یہ ہے کہ دونوں کی تعلیم کا سرچشمہ ایک ہی ہے، دونوں نے شاہ عبدالعزیز دہلویؒ کے مدرسے سے فیض اٹھایا جو مسلمانوں کے علمی دورِ عروج کی آخری یادگار کے طور پر دہلی میں باقی رہ گیا تھا، اور تشنگانِ علوم اسی کی طرف رجوع کرتے تھے۔

سرسید احمد خان مرحوم کی تعلیم قدیم طرز کے اسلامی منہج پر ہوئی، انہوں نے وہی کتابیں پڑھیں جو عام طور پر مدارسِ عربیہ میں پڑھائی جاتی رہی ہیں، ان کے سوانح نگاروں

نے لکھا ہے کہ سرسید نے جن بزرگوں سے فیض حاصل کیا ان میں شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے پوتے شاہ مخصوص اللہؒ، شاہ عبدالعزیز دہلویؒ کے جانشین شاہ محمد اسحٰق دہلویؒ اور مولانا مملوک علی نانوتویؒ کے نام لیے جاتے ہیں (موج کوثر شیخ محمد اکرام، ص: ۸۰ بہ حوالہ تراجم علمائے حدیث ہند، ص: ۱۱۳، ۱۲۰) آخر الذکر ان بے مثال علماء میں سے ہیں جن کے سامنے انیسویں صدی کے اکثر مشاہیر نے زانوئے تلمذ طے کیا ہے، جیسے حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ، مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، مولانا احمد علی محدث سہارن پوریؒ، منشی ذکاء اللہ صاحبؒ، ڈپٹی نذیر احمد دہلویؒ، مولانا یعقوب علی نانوتویؒ، مولانا محمد احسن نانوتویؒ، مولانا محمد مظہر صاحبؒ بانی جامعہ مظاہر علوم سہارنپور، اسی فہرست میں یہ دو نام بھی شامل ہیں سرسید احمد خاںؒ اور مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، اگر چہ دورِ حاضر کے بعض محققین نے اس بات سے انکار کیا ہے کہ سرسید احمد خاںؒ نے مولانا مملوک علی نانوتویؒ سے تعلیم حاصل کی ہے، تاہم اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں ہے کہ سرسید احمد خان مرحوم کے ذہن وفکر پر ابتداءً مدرسہ شاہ ولی اللہ کی گہری چھاپ رہی ہے، یہ بات الگ ہے کہ بعد میں بعض مخصوص حالات ورجحانات کی بنا پر یہ اثر زائل ہوگیا، ان کی ننھیال کو شاہ عبدالعزیزؒ اور ان کے خاندان سے عقیدت مندانہ تعلق تھا، ان کا نام احمد بھی شاہ عبدالعزیزؒ کا رکھا ہوا ہے، بسم اللہ بھی شاہ صاحبؒ نے کرائی، سرسید احمد خاںؒ اپنے والد کے ساتھ بہ کثرت شاہ صاحبؒ کی خدمت میں حاضری دیا کرتے تھے، خود لکھتے ہیں: ''میں ہر روز آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا تھا آپ اپنی شفقت اور محبت سے مجھے اپنے پاس مصلّے پر بٹھا لیتے اور نہایت شفقت فرماتے، میں نے اپنے دادا کو تو نہیں دیکھا آپ ہی کو دادا حضرت کہا کرتا تھا۔'' (آثار الصنادید بہ حوالہ موج کوثر ص: ۹۷) اِدھر مولانا محمد قاسم نانوتویؒ بہ غرضِ حصولِ علم مولانا مملوک علی نانوتویؒ کے ساتھ دہلی چلے گئے، اور لگ بھگ سات سال تک دہلی میں فروکش رہ کر اپنے مشفق ومربی ومحسن استاذ سے علوم وفنون کی تکمیل کرتے رہے، یہاں تک کہ ۱۲۶۷ھ میں مولانا مملوک علیؒ وفات پا گئے، اس وقت شاہ اسحٰق دہلویؒ بھی وفات پا چکے تھے، البتہ ان کے ایک تلمیذ رشید شاہ عبدالغنی مجددیؒ حیات تھے، اور علم حدیث میں ان کا زبردست شہرہ تھا، اپنے استاذ کی وفات

کے بعد مولانا نانوتویؒ نے تحصیل علوم حدیث کے لیے اپنے وقت کے اسی محدث جلیل کے سامنے زانوئے ادب طے کیا، گویا اپنے وقت کی ان دو عظیم شخصیتوں نے ایک ہی استاذ مولانا مملوک علیؒ سے فیض اٹھایا، ایک ہی درس گاہ مدرسہ شاہ عبد العزیز کے طالب علم بنے، فرق اتنا ہے کہ سر سید نے شاہ اسحٰق دہلویؒ سے براہِ راست استفادہ کیا، اور مولانا نانوتویؒ نے ان کے شاگرد شاہ عبد الغنی مجددی دہلویؒ سے فیض اٹھایا۔

تعلیم کے بعد ان دونوں شخصیتوں کے راستے جدا جدا ہوگئے، سر سید انگریزی حکومت کے ملازم ہوکر دہلی کی منصفی پر مامور ہوئے، مولانا نانوتویؒ نے سترہ سال کی عمر میں علوم نقلیہ وعقلیہ میں مہارت حاصل کرنے کے بعد ذریعہ معاش کے طور پر مطبع احمدی دہلی میں تصحیح کتب کا مشغلہ اختیار کیا، اسی دوران انہوں نے بخاری شریف کے آخری چھ پاروں کے حواشی بھی تحریر کیے، یہ ۱۸۵۲ء کا زمانہ ہے، اس وقت مولانا نانوتویؒ کی عمر زیادہ سے زیادہ اکیس برس تھی، اور سر سید پینتیس برس کے ہو چکے تھے، دونوں کا قیام دہلی میں تھا، دونوں حضرات کھلی آنکھوں شاہ جہاں آباد کی بربادی کا مشاہدہ کر رہے تھے، دونوں کے دل اس بربادی سے غم زدہ تھے، دونوں مسلمانوں کی تباہ حالی پر آنسو بہانے پر مجبور تھے، دونوں ہی اپنی قوم کے لیے کچھ کرنا چاہتے تھے مگر اچانک ۱۸۵۷ء کی بغاوت شروع ہوگئی۔

دہلی میں قیام کے دوران مولانا نانوتویؒ اپنے وطن نانوتہ تشریف لاتے رہتے تھے، ایک مرتبہ وطن آئے ہوئے تھے کہ انھیں میرٹھ میں فوجی بغاوت کی اطلاع ملی، اس بغاوت کا سبب چربی لگے ہوئے کارتوس تھے، ہندو فوجی اس لیے ناراض تھے کہ عیسائی حکومت انہیں گائے کی چربی لگے ہوئے کارتوس دے رہی ہے، مسلمان فوجی اس لیے برہم تھے کہ ان کو جو کارتوس فراہم کیے جارہے ہیں وہ خنزیر کی چربی سے آلودہ ہیں، ہندو اور مسلمان دونوں یہ سوچ رہے تھے کہ اس طرح عیسائی حکومت دونوں قوموں کا مذہب اور عقیدہ خراب کر رہی ہے، یہ افواہ کیا پھیلی، فوجی بیرکوں میں بغاوت پھیل گئی، ہندو اور مسلمان فوجیوں نے اپنے افسران کے خلاف بندوقیں اٹھالیں اور چھاؤنی کے ایک ایک افسر کو چن چن کر قتل کر ڈالا، یہ مئی

۱۸۵۷ء کا واقعہ ہے، فوجیوں کی بغاوت کی خبر جنگل کی آگ کی طرح پورے ملک میں پھیل گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے ہر جگہ بغاوت کے شعلے بھڑک اٹھے، مغربی یوپی کے اکثر شہر اس کی لپیٹ میں آگئے، تھانہ بھون جہاں مولانا نانوتویؒ کے پیر ومرشد حاجی امداد اللہ مقیم تھے انگریزوں کے خلاف جہاد کا مرکز بن گیا۔

علماء کی ایک بڑی جماعت جس میں مولانا نانوتویؒ پیش پیش تھے مسلمان مجاہدین کی قیادت کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی، اسی دوران سقوطِ دہلی کی اطلاع ملی، مجبوراً ان مجاہدین کو بھی ہتھیار ڈالنے پڑے، شاملی کے جہاد کی وجہ سے تھانہ بھون انگریزوں کے عتاب کا نشانہ بنا، انہوں نے اس قصبے کو تباہ وبرباد کرڈالا۔ (علمائے ہند کا شان دار ماضی: ۱۸۲/۴) وہ علماء بھی انگریزوں کے عتاب کا نشانہ بنے جو اس جہاد میں شریک تھے چناں چہ حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ، مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کی گرفتاری کے وارنٹ جاری ہوئے اور مخبرین کے لیے گراں قدر انعامات کا اعلان کیا گیا۔ استخلاص وطن کے لیے جدوجہد اور قربانی کی راہ میں علمائے دیوبند نے جو سختیاں برداشت کیں اور اذیتیں جھیلیں اس مختصر تحریر میں ان کا احاطہ مشکل ہے حقیقت یہ ہے کہ ۱۸۵۷ء کی شکست نے مسلمانوں کو اس درجہ مایوس اور کم زور کردیا تھا کہ وہ عملی سیاست سے کنارہ کش ہوکر تن بہ تقدیر بیٹھ گئے تھے۔ (علمائے حق اور ان کے مجاہدانہ کارنامے: ۹۴/۱) اگر علمائے دیوبند بھی تن بہ تقدیر ہوکر بیٹھے رہتے تو بہت ممکن تھا کہ یہاں صرف نام کے مسلمان رہ جاتے اور اسلام رخصت ہوجاتا۔

۱۸۵۷ء کی شکست کے بعد انگریزوں نے مسلمانوں کی مذہبی تعلیم کو زبردست نقصان پہنچایا، دہلی، آگرہ، لاہور، ملتان، لکھنؤ خیرآباد، بنگال، مدراس اور بہار وغیرہ کے ہزاروں مدارس ہندوستان کے سلاطین اور امراء کی وقف کردہ جائیدادوں سے چل رہے تھے، مسلمانوں کی تعلیم کا دارومدار ہی جائیدادوں پر تھا، ۱۸۸۳ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت نے ان تمام اوقاف کو بہ حقِ سرکار ضبط کرلیا، ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر کے بہ قول ''مسلمانوں کے تعلیمی ادارے ۱۸/سال کی لوٹ کھسوٹ کے بعد یک قلم مٹ گئے۔ (ہمارے ہندوستانی مسلمان،

ص:۱۰۰)

دوسری جگہ وہ صاف لفظوں میں اوقاف کی تباہی کا اعتراف کرتا ہے مسلمانوں کے اس الزام کا جواب نہیں دیا جاسکتا کہ ہم نے ان کے تعلیمی اوقاف کا ناجائز استعمال کیا، اس حقیقت کو چھپانے سے کیا فائدہ؟ اگر ہم اس جائیداد کو جو صرف اسی مصرف کے لیے ہمارے قبضے میں دی گئی تھی ٹھیک ٹھیک استعمال کرتے تو بنگال میں آج بھی ان کے پاس اعلیٰ اور شاندار ادارے موجود ہوتے۔ (حوالہ سابق ص:۲۰۷) اس زمانے کی تعلیمی حالت کا اندازہ گاندھی جی کی اس تقریر سے بھی لگایا جاسکتا ہے جس میں انہوں نے کہا تھا ''برٹش گورنمنٹ سے قبل ملک میں ۳۰ ہزار ادارے تھے جن میں دو لاکھ طلبہ تعلیم پاتے تھے، آج حکومت دفتری بہ مشکل چھ ہزار مدرسوں کا حوالہ دے سکتی ہے۔ (اخبار مسافر آگرہ ۳/ دسمبر ۱۹۲۰ء) ایک طرف مسلمانوں کی مذہبی تعلیم پر کاری ضرب لگائی گئی اور مدارس کے سلسلے کو مٹا کر رکھ دیا گیا، دوسری طرف ملک میں ایسی تعلیم رائج کی گئی جو اپنے نتائج کے اعتبار سے اسلام اور مسلمانوں کے لیے سخت نقصان دہ تھی، سرکاری تعلیم گاہیں دراصل وہ کارخانے تھے جہاں سے مسلمان بچے الحاد اور لادینیت کے سانچوں میں ڈھل ڈھل کر نکلتے تھے لارڈ ولیم بنٹنک (۱۸۲۸ء/۱۸۳۰ء) کے عہد حکومت میں جب وسیع پیمانے پر سرکاری مدارس قائم کرنے کی ضرورت محسوس کی گئی تو شروع میں انگریزوں کا خیال تھا کہ یہ تعلیم مشرقی زبانوں میں ہونی چاہیے، لیکن انگریزوں کے انتہا پسند طبقوں نے جن میں پادری بھی شامل تھے اس کی مخالفت کی اور انگریزی کو ذریعہ تعلیم قرار دینے پر زور دیا ان کا یہ مطالبہ منظور کیا گیا، اس کا اثر یہ ہوا کہ ہندوستان کے مسلمان اور ہندو عیسائیت سے قریب تر ہونے لگے، فرانسیسی مستشرق گارساں دتاسی نے یہ بات تسلیم کرتے ہوئے اپنے خطبات میں ایک جگہ لکھا ہے:

''ہندوستان میں یورپین علوم کا جس قدر چرچا بڑھتا جاتا ہے اسی قدر وہ ہماری تہذیب وتمدن اور ہمارے اصول مذہبی سے قریب تر ہوتے جاتے ہیں۔ (ترجمہ خطبات گارساں دتاسی، از: ڈاکٹر حمید اللہ، ص:۸۷۳)

انڈیا کی سپریم کونسل کے ایک اہم رکن سر چارلس نے جو گورنر کے اہم منصب پر فائز تھے ایک مرتبہ کہا کہ: ''میں یہ امید قائم کیے ہوئے تھا کہ جس طرح ہمارے لوگ کل کے کل ایک ساتھ عیسائی ہو گئے تھے اسی طرح یہاں (ہندوستان میں) بھی ایک ساتھ عیسائی ہو جائیں گے۔'' (مسلمانوں کا روشن مستقبل، ص:۱۴۳) برطانیہ کی پارلیمنٹ کے ایک ممبر مسٹر مینگلس نے ۱۸۵۷ء میں دار العوام میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا:

''ہر شخص کو اپنی تمام تر قوت ہندوسان کو عیسائی بنانے کے عظیم الشان کام کی تکمیل میں صرف کرنی چاہیے۔'' (حکومت خود اختیاری، ص:۱۳۶)

انگریز سمجھتے تھے کہ جب تک مسلمان قرآن کریم پڑھتے رہیں گے اور جب تک وہ شریعت کے اس سرچشمے سے سیراب ہوتے رہیں گے اس وقت تک انگریز ملک پر پوری طرح غالب نہیں آسکتے، چناں چہ برطانیہ کے ایک سابق وزیر اعظم گیڈ اسٹون نے مجمع عام میں قرآن کریم کو ہاتھ میں لے کر کہا کہ:

''جب تک یہ کتاب دنیا میں باقی ہے دنیا متمدن اور مہذب نہیں ہوسکتی۔'' (شیخ الاسلام کا خطبہ صدارت، ص: ۱۵، پچاس سالہ اجلاس عام آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ)

انگریز یہ بات اچھی طرح جانتے تھے کہ مسلمان قرآن کریم پر مکمل یقین رکھتے ہیں اور جب تک وہ اس کتاب سے وابستہ رہیں گے کسی انگریز حکومت کے وفادار نہیں ہوسکتے، چنان چہ ہنری طامس کہتا ہے کہ:

''مسلمان کسی ایسی گورنمنٹ کے جس کا مذہب دوسرا ہو اچھی رعایا نہیں ہوسکتے اس لیے کہ قرآنی احکام کی موجودگی میں یہ ممکن نہیں ہے۔'' (حکومت خود اختیاری، ص:۵۵)

لارڈ میکالے نے اپنے عزائم مخفی نہیں رکھے اور صاف صاف لفظوں میں یہ اعلان کیا کہ:

''ہماری تعلیم کا مقصد ایسے نوجوان پیدا کرنا ہے جو رنگ ونسل کے اعتبار سے

ہندوستانی ہوں اور دل ودماغ کے اعتبار سے فرنگی۔'' (بحوالہ مدینہ بجنور، ۲۸ فروری ۱۹۲۷ء)

ایک طرف علماء کو پھانسی کی سزا دی جارہی تھی اور ایک ایک وقت میں کئی کئی سو علماء کو تختۂ دار پر چڑھایا جارہا تھا، انہیں پابند سلاسل کیا جارہا تھا یا جلاوطنی پر مجبور کیا جارہا تھا، دوسری طرف عیسائی مشنریز ملک کے طول وعرض میں اپنا جال پھیلا رہی تھیں اور کوشش کی جارہی تھی کہ ہندوستان پر عیسائیت کا جھنڈا بلند کردیا جائے اور یہ امر یقینی بنادیا جائے کہ اس ملک کا ہر شہری عیسائی ہو، اس کے لیے مختلف طریقے اختیار کیے گئے، مسلمانوں کو عیسائی بننے کی صورت میں ملازمتیں دینے کا وعدہ کیا گیا، جو لوگ سال ہا سال کی جنگ اور بدامنی کے نتیجے میں غریبی کی سطح سے نیچے جاچکے تھے انھیں ڈیڑھ آنہ یومیہ یا ڈیڑھ سیر اناج دے کر عیسائی بننے پر مجبور کیا گیا، بہ قول سرسید ''غریب آدمی کے لیے یہ اتنی بڑی دولت تھی کہ وہ اس کے عوض بہ خوشی اپنی گردن کٹوانے پر تیار ہوجاتا تھا'' (اسباب بغاوت ہند، ص: ۴۰) جو لوگ ملازمتوں اور مال ودولت کے جھانسے میں نہیں آتے تھے ان کے لیے یہ انتظام کیا گیا کہ عیسائی پادریوں اور مبلغوں کو اسلام کے خلاف زہر اگلنے اور اپنی جارحانہ تقریروں سے مسلمانوں کی دل آزاری کرنے کی کھلی چھوٹ دی گئی، برطانیہ کی پارلیمنٹ نے طے کیا کہ ہندوستان میں اعلیٰ مناصب پر ایسے پادریوں یا عالموں کو مقرر کیا جائے جو مناظروں سے دلچسپی رکھتے ہوں اور اپنے فرائض منصبی کے علاوہ عیسائیت کی تبلیغ بھی کرسکیں، چناں چہ گورنری اور دوسرے عہدوں پر ایسے لوگ مقرر کیے گئے جنھوں نے اسلام کے خلاف دل آزار کتابیں لکھیں اور اپنی نگرانی وسرپرستی میں اسلام اور عیسائیت کے خلاف مناظرے کرائے عیسائی مبلغوں کو اس حد تک چھوٹ دی گئی کہ وہ بازاروں میں، مسجدوں کے دروازوں پر، اور ایسی جگہوں پر جہاں عام مسلمان اٹھتے بیٹھتے ہوں عیسائیت کی تبلیغ کریں اور اسلام کے خلاف زہر پھیلائیں۔

بلا شبہ عیسائی مبلغین نے اپنی جدوجہد میں ہندوستانی مسلمانوں کے نامساعد حالات، جہالت، غربت، اور اقتدار سے محرومی وغیرہ کی بنا پر عیسائیت کی تبلیغ میں کامیابی حاصل کی، چناں چہ مشہور فرانسیسی مستشرق گارساں دتاسی لکھتا ہے: ''انگریزی مشن جو

ہندوستان میں کام کررہے ہیں انہیں خوب کام یابی مل رہی ہے، ہرروز اینگلو انڈین کلب کے ماننے والوں کی تعداد میں اضافہ ہورہا ہے۔'' (خطبات گارساں دتاسی ترجمہ ڈاکٹر حمید اللہ: ار ۳۰۴) ایک جگہ لکھتا ہے: ''ہندوستان میں تبلیغ عیسائیت کو جو کامیابی حاصل ہورہی ہے اس میں شبہے کی گنجائش نہیں ہے، اس سے ہر عیسائی کو خوش ہونا چاہیے۔'' (حوالہ سابق: ۱/۸۷۴)

اس سخت اور جاں گسل صورت حال میں مولانا نانوتویؒ اوران کے رفقائے کرام کے سامنے ایک اہم سوال آیا اور یہ سوال ان کی فکری بصیرت کا امتحان تھا سوال یہ تھا کہ جو مذہب ایک ہزار برس تک اس ملک کے ہر شعبۂ زندگی پر چھایا رہا جس ملک کی زلف سنوارنے میں ہمارے اسلاف اور بزرگوں نے عمر بھر جدو جہد کی جس ملک نے صدیوں اسلام اور اسلامی علوم کی خدمت انجام دی، ان میں اضافے کیے لاتعداد دانش گاہیں قائم کیں، دینی درس گاہیں بنائیں، کیا یہ ملک مسلمانوں کے لیے اجنبی ہوجائے؟ اس سوال نے مولانا نانوتویؒ اوران کے رفقاء کے ذہن وفکر کو متاثر کیا، ۱۸۵۷ء کی شکست نے یہ تسلیم کرنے پر مجبور کردیا تھا کہ ہم اپنی آزادی فنا کرچکے ہیں اور ایک ایسی قوم کو ہم پر مسلط کردیا گیا ہے، جو ہماری سیاست پر ہی اثر انداز نہیں ہوگی بلکہ ہمارے مذہب پر بھی اس کے اثرات مرتب ہوں گے، ہماری تعلیم بھی متاثر ہوگی، ہمارے سوچنے کے ڈھنگ میں بھی تبدیلی آئے گی، عام ذہنوں میں یہ احساس جاگزیں ہوچکا تھا کہ ہم ایک شکست یافتہ قوم ہیں، تنزل نصیب ہیں ہمیں اب مفتوح کی حیثیت سے زندہ رہنا ہے، فاتح کی حیثیت سے نہیں، اس احساس نے وقت کا اہم سوال پیدا کیا، کیا ہم اپنے آپ کو اس قوم کے حوالے کردیں، اپنی تہذیب ثقافت اور تعلیم کو اس اجنبی قوم کی تہذیب، ثقافت اور تعلیم میں تحلیل کردیں ضرورت تھی کہ کوئی مردِ خدا کھڑا ہو اور اپنی فکری بصیرت سے اس سوال کا جواب ڈھونڈے اور اس مسئلے کا حل سوچے، اور اسلام اور مسلمانوں کے تحفظ کے لیے سامنے آئے۔

یہ ایک پیچیدہ اور الجھا ہوا سوال تھا، شکست خوردہ قوم سر اٹھانے کے قابل بھی نہ تھی چہ جائے کہ وہ کچھ سوچ سکے، یا کوئی اقدام کرسکے، ۱۸۵۷ء کی بربادی پر چند ہی سال گزرے تھے

اور اس کے لرزہ خیز مناظر دیکھنے والے بہ قید حیات تھے۔

اس مسئلے کے دو حل سوچے گئے، ایک علی گڑھ میں جو زمانی اعتبار سے مؤخر ہے مگر ہم اس کو پہلے ذکر کرنا چاہتے ہیں اور دوسرا دیوبند میں، علی گڑھ میں جو حل سوچا گیا اس کا ماحصل یہ تھا کہ ہم پر ایک قوم تسلط حاصل کر چکی ہے، دانش مندی کا تقاضا یہ ہے کہ ہم اپنے حاکم کے علوم اور اس کی زبان سیکھیں تا کہ اجنبیت کی یہ خلیج پٹ سکے، اسی طرزِ فکر نے اس دانش گاہ کی بنیاد رکھوائی جسے ابتدا میں مدرسۃ العلوم کہا جاتا تھا اور آج مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ کہا جاتا ہے، سرسید مرحوم نے ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ اجلاس منعقدہ ۱۸۸۶ء علی گڑھ میں فرمایا تھا:

''اس وقت ہمیں ضرورت ہے کہ جس قدر ہو سکے ایک کثیر تعداد میں ایسے نوجوانوں کو پیدا کریں جو ان علوم میں جو زمانے کی حاجتوں کے لیے ضروری ہیں سر برآوردہ ہوں۔''
(روداد ایجوکیشنل کانفرنس ۱۸۸۶ء علی گڑھ)

سرسید مرحوم برٹش گورنمنٹ کے ملازم تھے اور اس حکومت کے لیے اپنے دل میں نرم گوشہ رکھتے تھے، بلک کسی حد تک ان کی تہذیب سے متاثر بلکہ مداح بھی تھے جیسا کہ گارساں دتاسی نے اپنے ایک لکچر میں لکھا: ''ہندوستانی مسلمانوں میں ایک جماعت ایسی ہے جو مسیحی مذہب کی خوبیوں کو اپنے مذہب میں سمو رہی ہے، اس جماعت کے اصل لیڈر سید احمد خاں ہیں جو غازی پور میں ہیں۔'' (خطبات گارساں دتاسی ج:۱/۱۴۸) اس میں شک نہیں کہ سرسید اپنی قوم کے تئیں مخلص، اور ان کی اصلاح و بقا کے لیے پُر جوش تھے، مگر وہ مذہب کے بجائے شخص کا تحفظ کرنا چاہتے تھے، ان کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ مسلمان ایک مفتوح اور شکست خوردہ قوم ہے، اسے فاتح قوم کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دینا چاہیے اور اپنی وفاداری سے اس کا دل جیتنا چاہیے، ان کا خیال تھا کہ مسلمان پرانے علوم ترک کریں، نئے علوم حاصل کریں، پرانی روایت چھوڑیں، نئی تہذیب اختیار کریں پستی سے بلندی کی سطح تک پہنچنے کے لیے اور معاشی تفوق حاصل کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ جدید تعلیم حاصل کی جائے اور خود کو جدید تہذیب کے سانچے میں ڈھالا جائے، سرسید اس نقطہ نگاہ کی تبلیغ میں اس قدر پر جوش تھے کہ انہوں نے اپنے

خیالات کی تائید کے لیے قرآن وحدیث سے استدلال میں جرأت بے جا کا مظاہر شروع کردیا اس کا بہت کچھ اندازہ ان کے ان مضامین و مقالات سے ہوتا ہے جو ماہ نامہ ''تہذیب الاخلاق'' کے صفحات پر بکھرے ہوئے ہیں۔

سرسید مرحوم نے انگریزوں کے تئیں اپنی خدمات سے حکومت وقت کا جو اعتماد حاصل کرلیا تھا اس سے انہیں اپنے کام میں بڑی مدد ملی، شخصی طور پر بھی وہ اعزاز واکرام سے نوازے گئے، یہاں تک کہ ''اسبابِ بغاوتِ ہند'' لکھ کر انہوں نے جس جرأت کا مظاہرہ کیا تھا وہ بھی ان کی توقیر کم نہ کرسکی بلکہ انگریزوں نے اس کتاب کو ایک مخلص کے خیالات سمجھ کر بڑی اہمیت دی، اور اس سے ان کی قدر ومنزلت میں بڑا اضافہ ہوا، یہ تھا سرسید کا نظریہ جو دارالعلوم کی تاسیس کے بعد ۱۸۷۷ء میں علی گڑھ میں مدرسۃ العلوم کی تاسیس کا سبب بنا۔

دیوبند میں جو حل تجویز ہوا اس کا ماحصل یہ تھا کہ ہمیں حاکم وقت کی زبان اور اس کے علوم کے بجائے اپنے دینی علوم کی بقا اور تحفظ کے لیے کوشش کرنی چاہیے یہی فکر دارالعلوم کی بنیاد کا سبب بنا، دارالعلوم کے بانیوں کا مقصد اسلام کی حفاظت کے لیے مضبوط اور مستحکم قلعوں کی تعمیر کرنا تھا تا کہ اسلام کو ہر خطرے سے بچایا جاسکے اور جو چراغ ہزار برس تک اس ملک میں جلتا رہا وہ لادینیت کی تیز ہواؤں سے گل نہ ہونے پائے، قوم کے نونہال الحاد اور تشکیک کے کارخانوں میں جانے کے بجائے ان اداروں میں پلیں، بڑھیں اور پروان چڑھیں جہاں ان کو ان کے مذہب کے سانچے میں ڈھالا جاسکے، ان کا دل، ان کا دماغ، ان کا کردار سب کچھ اسلام کے مطابق بنایا جاسکے، مولانا نانوتویؒ اور ان کے رفقاء نے اپنی ایمانی بصیرت سے اندازہ کرلیا تھا کہ اگر ان حالات میں مسلمانوں کے دین اور ایمان کی حفاظت اور تعلیم وتربیت کا کوئی انتظام نہ ہوا تو اس بات کا شدید خطرہ ہے کہ کہیں مسلمان عیسائیت کے فریب میں نہ آجائیں اور خدانخواستہ ایمان کی دولت سے محروم نہ ہوجائیں، ان کی فراست ایمانی نے محسوس کرلیا تھا کہ اس وقت سب سے اہم مسئلہ دین کا تحفظ ہے، خواہ اس کے لیے کتنے ہی افراد کیوں نہ کام آجائیں، اور خواہ اقتصادی اور معاشی میدانوں میں ہم کتنے ہی پیچھے

کیوں نہ ہو جائیں۔

مجموعی طور پر دیوبند تحریک نے اس وقت کے مایوس کن حالات میں امیدوں کے چراغ جلائے اور اس خوف ناک ماحول میں دینی جدو جہد کا آغاز کیا جس نے مسلمانوں کو توڑ کرر کھ دیا تھا اور بہت سے لوگ حالات کے ساتھ مصالحت بلکہ حالات کے آگے سر جھکانے پر زور دینے لگے تھے، دیوبند نے ان حالات کا رُخ موڑا اور ہندوستان کے مایوس و مجبور مسلمانوں کی رگوں میں زندگی کا خون دوڑایا، ان کے بے جان جسموں میں عزائم کی روح پھونکی، اور اس طرح اسلام کے خلاف ہونے والی سازشوں پر سخت پہرے بٹھا دیئے، حجاز مقدس میں جب دارالعلوم کے قیام کی اطلاع حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کو دی گئی تو ان کی زبان سے بے ساختہ یہ دعا نکلی ’’اے اللہ اس ادارے کو اسلام اور علم دین کی حفاظت کا ذریعہ بنا۔‘‘

مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور سر سید احمد خاںؒ.....خدمات اور تعلقات:

مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور سر سید احمد خاںؒ ہر دو حضرات نے ہندوستان میں مسلمانوں کی ہزار سالہ سلطنت کا آفتاب اپنی آنکھوں سے غروب ہوتے ہوئے دیکھا تھا، دونوں کا دل ملت کی زبوں حالی پر تڑپتا تھا، لیکن دونوں کے زاویۂ نگاہ میں بڑا فرق تھا، مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے اپنی عملی زندگی کا آغاز انگریزوں کے خلاف جہاد سے کیا کیوں کہ جس درس گاہ سے انہوں نے علوم نبوت حاصل کیے تھے وہاں سے انگریزوں کے خلاف جہاد کا فتویٰ جاری ہو چکا تھا، اور اس درس گاہ کے فیض یافتہ ملک میں اسلامی حکومت کی واپسی کے لیے سرفروشانہ جہاد کر چکے تھے، ۱۸۵۷ء میں تھانہ بھون اور شاملی کے میدان میں مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے اپنے رفقاء کے ساتھ مل کر انگریزوں کے خلاف جو جنگ کی وہ اسی سلسلۂ جہاد کو آگے بڑھانے کا عمل تھا، دوسری طرف سر سید بھی اسی ماحول کے پروردہ اور اسی درس گاہ کے فیض یافتہ تھے، مگر ان کے دل و دماغ پر جنگ اور جہاد کے بجائے مصالحت اور سپر اندازی کے جذبات حاوی تھے، وہ جہاد کے قائل نہیں تھے چناں چہ جس زمانے میں علماء دیوبند جہاد میں مصروف تھے وہ انگریزی حکومت میں منصفی کی ملازمت کر رہے تھے۔

۱۸۵۷ء کے آس پاس انگریزوں کے خلاف جو ''بغاوت'' پھیلی اس نے ملک کے تمام باہوش شہریوں کی طرح سرسید کو بھی متاثر کیا، حالاں کہ انگریزوں کے خلاف یہ جنگ بغاوت نہ تھی بلکہ جہاد تھی، اور علماء نے اسی جذبے سے اس جنگ میں حصہ بھی لیا، مگر اس کو بغاوت اور غدر کا نام دیا گیا، سرسید نے جنگ کی حالت ختم ہونے کے بعد جو کتاب لکھی اس کا نام ہی ''رسالہ اسبابِ بغاوتِ ہند'' ہے، سرسید کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ انگریز نواز تھے، اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا، مگر یہ حقیقت بھی اپنی جگہ ہے کہ ان میں جرأت بہت تھی، اس کا ثبوت ان کا یہی رسالہ ہے جس میں انہوں نے ان اسباب کا تفصیلی جائزہ لیا ہے جن کی وجہ سے ہندوستانی عوام بغاوت پر آمادہ ہوئے، سرسید نے پوری بے باکی کے ساتھ انگریزوں کو آئینہ دکھلایا ہے اور انہیں یہ بتلانے کی کوشش کی ہے کہ تمہاری غلط پالیسیوں ہی کی وجہ سے ہندوستانیوں نے بغاوت کی تھی، مثال کے طور پر ان کا خیال ہے کہ بادشاہوں نے جو جاگیریں ہمارے بزرگوں کو دی تھیں وہ مختلف حیلوں بہانوں سے انگریز سرکار نے ضبط کرلیں، اس اقدام سے ہندوستانیوں کو اقتصادی بدحالی اور تنگی معاش کا سامنا کرنا پڑا جس سے دلوں میں اس سرکار کے خلاف ناراضگی پیدا ہوئی (اسبابِ بغاوتِ ہند، ص: ۲۶) یہ حال تو رئیسوں اور جاگیرداروں کا تھا، دوسری طرف ملک کے بہت سے اہل حرفہ اور دست کار بھی دانے دانے کو محتاج ہو گئے تھے، اس کی وجہ سرسید نے لکھی ہے کہ ''اہل حرفہ کا روزگار بسبب جاری اور رائج ہونے اشیاءِ تجارت ولایت کے بالکل جاتا رہا، یہاں تک کہ ہندوستان میں کوئی سوئی بنانے والے اور دیا سلائی بنانے والے کو بھی نہیں پوچھتا تھا، پارچہ بافوں کا تار بالکل ٹوٹ گیا تھا، غرض ملک ہر طرح سے مفلس ہو گیا تھا، اگلے خاندان جن کو ہزاروں کا مقدر تھا، معاش سے بھی تنگ آ گئے تھے۔ (حوالہ سابق، ص: ۲۸، ۳۶) ملک میں عدل وانصاف کی صورتِ حال کس قدر ابتر تھی، یورپین عوام اور حکام کے سامنے ملک کے طبقہ اشرافیہ کی کیا سماجی پوزیشن تھی اس کا بھی سرسید نے بھرپور جائزہ لیا ہے وہ لکھتے ہیں ''بلاشبہ تمام رعایا ہندوستان کی اس بات کی شاکی ہے کہ ہماری گورنمنٹ نے ان کو نہایت بے قدر کر دیا ہے'' (حوالہ سابق، ص: ۴۲)

سرسید کو معلوم تھا کہ انگریز محض حکومت ہی کرنا نہیں چاہتے بلکہ اس ملک کو سیاسی اور اقتصادی طور پر غلام بھی بنانا چاہتے ہیں، اس سے بھی آگے بڑھ کر وہ یہاں کے عوام کو ان کے مذہب سے بھی بیگانہ بنا دینا چاہتے ہیں، سرسید نے انگریزوں کی مذہبی پالیسی پر بھی نکتہ چینی کی ہے لکھتے ہیں: ''کچھ شبہ نہیں کہ تمام لوگ جاہل و قابل، اعلیٰ و ادنیٰ یقینی جانتے تھے کہ ہماری گورنمنٹ کا دلی ارادہ ہے کہ مذہب اور رسم و رواج میں مداخلت کرے اور سب کو کیا ہندو کیا مسلمان، عیسائی مذہب اور اپنے ملک کے رسم و رواج پر ڈالے۔ (حوالہ سابق، ص: ۱۷، ۳۳)

سرسید کا یہ رسالہ اگر چہ عوامی جذبات کا آئینہ دار ہے مگر اس میں انگریزوں کی خیرخواہی کا عکس بھی صاف نظر آتا ہے وہ جگہ جگہ ہماری سرکار، ہماری گورنمنٹ کے الفاظ استعمال کرتے ہیں، اور مختلف طریقوں سے امراء و حکام کو ناصحانہ کلمات سے بھی نوازتے ہیں، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ سرکار انگلشیہ کے خلاف نہیں تھے بلکہ اس کے ہم درد اور خیر خواہ تھے، یہی وجہ ہے کہ اپنے ایک ملازم کے قلم سے لکھی جانے والی اس کتاب کا انگریزوں نے کوئی نوٹس نہیں لیا بلکہ اس کو ایک خیر خواہ اور ہم درد کے جذبات و خیالات کا مجموعہ سمجھ کر اس کی قدردانی کی، حالات وواقعات بتلاتے ہیں کہ اس کتاب نے انگریزوں کے دلوں میں سرسید کے تئیں عزت وتوقیر ہی پیدا کی، انہیں سر کے خطاب سے نوازا گیا، ان کو رائل ایشیاٹک سوسائٹی لندن کا آنریری فیلو منتخب کیا گیا، کسی ہندوستانی کے لیے یہ بہت بڑا اعزاز تھا، ملازمت ہی کے دوران قیام بنارس کے زمانے میں ان کے بیٹے سید محمود کو حکومت نے انگلینڈ میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے اسکالرشپ دی، سرسید اپنے بیٹے کو اعلیٰ تعلیم دلانے کے لیے بہ نفس نفیس لندن گئے اور تقریباً بیس ماہ قیام کر کے واپس ہوئے۔

اِدھر علماء دیوبند کے دلوں میں انگریزوں کے لیے کوئی نرم گوشہ نہیں تھا، بلکہ وہ ان کے سخت مخالف تھے اور اس سرزمین پر ایک لمحے کے لیے بھی ان کا وجود برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں تھے، ان میں سے بہت سے حضرات تو ایسے تھے جو کسی انگریز کا چہرہ تک دیکھنے کے روادار نہ تھے، ان حضرات نے پہلے انگریزوں کے ساتھ مسلح جنگ لڑی اور جب اس جنگ

میں ناکام ہوگئے تو ہمت ہار کر نہیں بیٹھے بلکہ انہوں نے مسلمانوں کو تہذیبی اور مذہبی ارتداد سے بچانے کے لیے دوسرا محاذ جنگ کھول لیا، اور از سرنو جدوجہد کا آغاز کیا، مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اس قافلۂ حریت کے سپہ سالار تھے، ایک جاں فروش، حق شناس اور حق آگاہ قائد کی حیثیت سے انہوں نے اسلام اور مسلمانوں کے تحفظ کے لیے جو کردار ادا کیا ہے اسے فراموش نہیں کیا جاسکتا، مولانا سید محمد میاں دیوبندیؒ نے لکھا ہے ''الزام غدر یا اس الزام کے شبہے میں لاکھوں ہندوستانی موت کے گھاٹ اتارے جاچکے ہیں، ظلم وستم اور وحشت وبربریت کی جتنی بھی صورتیں ہوسکتی ہیں ہندوستانیوں کو خوف زدہ کرنے کے لیے کام میں لائی جاچکی ہیں، مگر جو قدرت فرعون کے گھر میں موسیٰ کی پرورش کیا کرتی ہے وہ عجیب وغریب انداز سے ان کی حفاظت کررہی ہے، جو فرعون برطانیہ کے مقابلے میں موسیٰ بن کر سامنے آنے والے ہیں، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی بھی انہیں منتخب افراد میں ہیں جن کو قدرت خداوندی برطانوی سامراج کے مقابلے میں نہ صرف موسیٰ بلکہ موسیٰ گر بنا کر کھڑا کرنے والی تھی۔'' (علماء ہند کا شان دار ماضی، ۴/ ۲۹۶)

اگر چہ علماء دیوبند مسلّح جنگ میں انگریزوں سے شکست کھا گئے، لیکن جو نظریاتی اور مذہبی جنگ انگریزوں نے چھیڑی تھی اس میں پوری طرح کامیاب رہے، بعد کے حالات نے ثابت کردیا کہ مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور ان کے اولو العزم رفقاء نے ۱۸۶۶ء میں دار العلوم دیوبند کی بنیاد ڈال کر جو اقدام کیا تھا وہ مسلح جنگ کے مقابلے میں زیادہ کارآمد ثابت ہوا، اسی خاموش تحریک سے وہ طوفانی لہریں برپا ہوئیں کہ انگریزوں کو ہندوستان چھوڑ کر بھاگنا پڑا، اس میں شک نہیں کہ یہ تحریک سراسر الہامی تھی، اور اس کا داعیہ اس وقت کے تمام بزرگوں کے دلوں میں موجزن تھا، علماء دیوبند کے روحانی پیشوا حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کو جب قیام مدرسہ کی اطلاع دی گئی تو انہوں نے بے ساختہ فرمایا: ''سبحان اللہ'' آپ فرماتے ہیں کہ ہم نے مدرسہ قائم کیا ہے یہ خبر نہیں کہ کتنی پیشانیاں اوقات سحر میں سربسجود ہوکر گڑ گڑاتی رہیں کہ خدایا ہندوستان میں بقائے اسلام اور تحفظ علم کا کوئی ذریعہ پیدا کر، یہ مدرسہ انہی سحر گاہی دعاؤں کا

ثمرہ ہے۔‘‘(سوانح قاسمی،۱/۲۲۳)

ادھر سرسید کا دل بھی ان حالات سے بے چین تھا یہ بات قابل ذکر ہے کہ سرسید نے ہمیشہ تعلیم کی اشاعت سے دلچسپی لی ہے، ۱۸۶۳ء میں انہوں نے سائنٹیفک سوسائٹی غازی پور کی بنیاد ڈالی، اس کے ذریعے وہ ہندوستان میں مغربی علوم کو ترویج دینا چاہتے تھے، کئی انگریز وزراء اور گورنر اس سوسائٹی کے نگراں اور سرپرست تھے، پہلے غازی پور میں، پھر علی گڑھ میں؛ یہ سوسائٹی اپنے کام میں مصروف رہی، اس وقت سرسید ہندو اور مسلمان دونوں قوموں کی تعلیمی ترقی کی خواہش رکھتے تھے، انہوں نے اپنی سوسائٹی سے جو اخبار جاری کیا تھا اس میں دونوں قوموں کے تعلیمی اور معاشرتی احوال پر مضامین شائع ہوا کرتے تھے، یہ وہ دور تھا جب سرسید نے ہندوستان کو ایک ایسی حسین دلہن سے تشبیہ دی تھی جس کی ایک آنکھ ہندو اور دوسری مسلمان ہو، اسی لحاظ سے سرسید کو ایک قوم پرست لیڈر اور مصلح بھی کہا جاتا ہے، لیکن یکایک ان کے ذہن وفکر میں تبدیلی رونما ہوئی، شیخ محمد اکرام نے ’’موج کوثر‘‘ میں اس تبدیلی پر روشنی ڈالی ہے، انہوں نے لکھا ہے کہ اب تک سرسید نے اشاعت تعلیم کے لیے جو کوششیں کی تھیں ان میں مسلمانوں کی تخصیص نہ تھی، سب میں ہندو شریک تھے اور دونوں فریق فائدہ اٹھا رہے تھے، لیکن سرسید کے قیام بنارس کے دوران چند ایسے واقعات پیش آئے جنہوں نے سرسید کے زاویۂ نگاہ میں بڑی تبدیلی پیدا کر دی، ان واقعات سے نہ صرف سرسید کے خیالات بدلے بلکہ شاید ہندوستان کی قسمت پر بھی گہرا اثر پڑا، اس لیے ان واقعات کی تفصیل دیکھنے کے لائق ہے، مولانا حالی ’’حیات جاوید‘‘ میں لکھتے ہیں: ’’۱۸۶۷ء میں بنارس کے بعض سربرآوردہ ہندوؤں کو یہ خیال پیدا ہوا کہ جہاں تک ممکن ہو تمام سرکاری عدالتوں میں اردو زبان اور فارسی رسم الخط موقوف کرانے میں کوشش کی جائے اور بجائے اس کے بھاشا زبان جاری ہو جو دیوناگری میں لکھی جاوے، سرسید کہتے ہیں کہ یہ پہلا موقع تھا جب مجھے یقین ہوگیا اب ہندو مسلمانوں کا بہ طور ایک قوم کے ساتھ چلنا اور دونوں کو ملا کر سب کے لیے مشترک کوشش کرنا محال ہے، ایک روز میں مسٹر شیکسپئر سے جو اس وقت بنارس کے کمشنر تھے، مسلمانوں کی تعلیم کے

باب میں کچھ گفتگو کر رہا تھا اور وہ متعجب میری گفتگو سن رہے تھے آخر انہوں نے کہا کہ آج یہ پہلا موقع ہے کہ میں نے تم سے خاص مسلمانوں کی ترقی کا ذکر سنا ہے، اس سے پہلے تم عام ہندوستانیوں کی بھلائی کا خیال ظاہر کرتے تھے، میں نے کہا کہ اب مجھے یقین ہوگیا ہے کہ دونوں قومیں کسی کام میں دل سے شریک نہ ہوسکیں گی، ابھی تو بہت کم ہے آگے آگے اس سے زیادہ مخالفت اور عناد ان لوگوں کے سبب جو تعلیم یافتہ کہلاتے ہیں بڑھتا نظر آتا ہے، جو زندہ رہے گا دیکھے گا۔'' (موج کوثر، ص: ۸۵، ۸۶) زاویۂ نگاہ کی اسی تبدیلی نے سرسید سے اس دانش گاہ کی بنیا درکھوائی جو پہلے مدرسۃ العلوم کے نام سے موسوم ہوئی، اور اب علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے نام سے مشہور ہے، یہ ۱۸۷۶ء کی بات ہے، گویا دارالعلوم دیو بند کے ٹھیک دس سال بعد علی گڑھ کالج کا قیام ہوا، دونوں کی بنیادوں میں مسلمانوں کی ترقی کی روح اور اس کی آرزو شامل رہی ہے، اسی لیے دونوں اداروں نے تحریک کی شکل اختیار کی اور مسلمانوں کی سماجی، مذہبی، سیاسی اور معاشرتی زندگی پر دونوں تحریکوں کے گہرے اثرات مرتب ہوئے۔

دیو بند اور علی گڑھ یہ دونوں نام مسلمانوں کی نشاۃِ ثانیہ کے لیے بڑی اہمیت کے حامل ہیں، دونوں تحریکوں کا آغاز ایک ہی زمانے میں یکساں ماحول میں ہوا، دونوں ایک ہی زمانے میں پروان چڑھیں، دونوں نے مسلمانوں کی تعمیر وترقی میں بھرپور کردار ادا کیا، یہ خیال غلط ہے کہ یہ دونوں تحریکیں باہم متصادم رہی ہیں، یا کسی ایک تحریک نے دوسری تحریک کو نقصان پہنچایا ہے، یا مخالفت کی ہے، اگرچہ مخالفت دونوں تحریکوں کی ہوئی مگر مخالف دوسرے تھے اور مخالفت کا انداز بھی جدا جدا تھا، کیوں کہ دیو بند تحریک خالص مذہبی تھی، مسلمانوں کا اس کی طرف جھکاؤ دیکھ کر انگریز اپنے وجود کے لیے اس کو خطرہ سمجھ رہے تھے، اس لیے انہوں نے درپردہ اس کے خلاف سازشیں شروع کردیں، مسلمانوں میں اس کو بدنام کرنے کے لیے انگریزوں نے اپنی سرپرستی میں مسلمانوں ہی میں سے کچھ ایسے لوگ تلاش کیے جنہوں نے مذہب اور عقیدے کی آڑ لے کر اس تحریک سے وابستہ علماء کی کردارکشی کی مہم شروع کی اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمانوں میں ایک نیا فرقہ بن گیا، دوسری طرف سرسید کی تحریک بھی مخالفتوں

سے محفوظ نہ رہ سکی، عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ سرسید کی مخالفت علماء نے کی تھی، یہ الزام غلط ہے، کم از کم علماء دیوبند کے متعلق تو یہ الزام بالکل ہی غلط ہے۔

علمائے دیوبند نے کبھی بھی سرسید کی مخالفت نہیں کی، شیخ محمد اکرام نے اپنی کتاب میں ان لوگوں کو بے نقاب کیا ہے جو سرسید کے مخالف تھے، انہوں نے اپنی کتاب ''موج کوثر'' میں لکھا ہے: ''کالج کے قیام میں سرسید کو تمام روشن خیال اور بااثر مسلمانوں کی مدد حاصل تھی، لیکن ایک طبقے میں چند وجوہ کی بنا پر ان کی بہت مخالفت ہوئی، اس بارے میں سب سے بڑی غلط فہمی بہت عام ہے کہ علماء نے سرسید کی مخالفت کی مخالفت اس وجہ سے کی کہ وہ مسلمانوں میں انگریزی تعلیم رائج کرنا چاہتے تھے، جن لوگوں نے سرسید کے حالات بہ غور نہیں پڑھے وہ سمجھتے ہیں کہ سرسید کی مخالفت ان دقیانوسی علماء نے کی جو ہندوستان کو دارالحرب سمجھتے تھے، اور سرکار انگلشیہ اور انگریزی تعلیم کے مخالف تھے، حقیقت اس کے برعکس ہے، مدرسۃ العلوم کے سب سے بڑے مخالف دو بزرگ تھے، دونوں معزز سرکاری ملازم، یعنی مولوی امداد العلی ڈپٹی کلکٹر اور مولوی علی بخش سب جج، حالی نے لکھا ہے کہ ہندوستان میں جس قدر مخالفتیں اطراف و جوانب سے ہوئیں ان کا منبع انہی دونوں صاحبوں کی تحریریں تھیں۔'' (موج کوثر: ۹۰،۹۳)

اس میں شک نہیں کہ سرسید نے اپنی بعض کتابوں میں احتیاط پسندی سے کام نہیں لیا، بلکہ وہ مغرب کی تقلید میں اپنی حدود سے تجاوز کر بیٹھے، بعض حلقوں نے ان کی اس لیے بھی مخالفت کی ہے کہ وہ مذہبی مسائل میں کچھ ایسے خیالات ظاہر کرتے رہتے تھے جو براہِ راست قرآن وسنت سے متصادم تھے، مثال کے طور پر معراج جسمانی کا انکار، آسمانوں سے متعلق عام نظریئے کی تردید، جنوں کے وجود کی نفی، تشبیہ بالاقوام کی حدیث کی صحت کا انکار، عام مسلمانوں کے ذہن میں یہ خیال راسخ ہو چکا تھا کہ سرسید ملحدانہ نظریات رکھتے ہیں، ان خیالات کو تقویت مخالفین کی مہم سے ملی، بعض غیر محتاط حلقوں نے تکفیر کے فتوے بھی دئے، مگر علمائے دیوبند نے اس مہم میں کوئی حصہ نہیں لیا، ایک مرتبہ انبٹھہ کے ایک بزرگ پیر جی محمد عارف نے تکفیری فتووں کے حوالے سے مولانا محمد قاسم نانوتویؒ سے کچھ بات چیت کی، اور

اس بات چیت کی روشنی انہوں نے سرسید کو ایک خط لکھا، جواب خط میں سرسید نے اپنے عقائد کی وضاحت کی، یہ خط اور عقائد کے سلسلے میں وضاحتی تحریر مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے ملاحظہ فرمائی، اور اس کی روشنی میں ایک طویل مکتوب تحریر فرمایا جو ''تصفیۃ العقائد'' کے نام سے چھپ چکا ہے، اس مکتوب میں مولانا نانوتویؒ نے پیر جی محمد عارف کو مخاطب کرتے ہوئے لکھا ہے:

''پیر جی صاحب یہ گنہ گار کبھی کسی سے نہیں الجھتا اور الجھے بھی تو کیوں کر الجھے، وہ کون سی خوبی ہے جس پر کمر باندھ کر لڑنے کو تیار ہو، ایسی کیا ضرورت ہے کہ اپنے عمدہ مشاغل کو چھوڑ کر اس نفسا نفسی میں پھنسوں، ہاں اس میں شک نہیں کہ سنی سنائی سید صاحب کی اولوالعزمیوں اور درد دل سوزی اہل اسلام کا معتقد ہوں اور اس وجہ سے ان کی نسبت اظہار محبت کر دوں تو بجا ہے، مگر اتنا ہی یا اس سے کچھ زیادہ ہی ان کے فساد عقائد کو سن سن کر ان کا شاکی ہوں اور ان کی طرف سے رنجیدہ ہوں۔'' (تصفیۃ العقائد، ص:۵)

اس اقتباس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا نانوتویؒ سرسید کی تعلیمی اور علمی سرگرمیوں سے بہ خوبی واقف تھے، ایک طرف وہ ان کے کاموں کو اولوالعزمیوں سے تعبیر کرتے ہیں، اور ان کی سرگرمیوں کو درد دل سوزی اہل اسلام قرار دیتے ہیں، دوسری طرف بر بنائے محبت اور اخلاص ان تحریروں سے بھی شاکی ہیں جن سے سرسید کے فاسد نظریات کا اظہار ہوتا ہے، اس پوری کتاب میں کہیں بھی ان کی تحریک کی مخالفت نہیں ہے، یہی وجہ ہے کہ جب علی گڑھ کالج کے قیام کے بعد شعبۂ دینیات کی ضرورت محسوس ہوئی اور سرسید نے علماء سے درخواست کی کہ وہ اس شعبے کے قیام میں مدد کریں تو علماء نے اس شرط کے ساتھ شعبے کے قیام سے دلچسپی لی کہ سرسید اور ان کی کمیٹی کے افراد اس کے امور مذہبی میں مداخلت نہیں کریں گے، سید طفیل احمد منگلوری نے ''مسلمانوں کا روشن مستقبل'' میں لکھا ہے ''کہ جب مولانا محمد قاسم نانوتویؒ سے کہا گیا کہ وہ مجوزہ مدرسے میں دینیات کی تعلیم کا اپنی مرضی سے انتظام کریں تو انہوں نے جواب دیا تھا کہ پہلے مدرسے کے کاموں سے دست بردار ہو جائیں اس کے بعد میں مذہبی تعلیم کا انتظام کیا جا سکتا ہے اس پر سرسید نے یہ کیا کہ جو کمیٹی دینیات کی بنائی گئی اس کے ممبر خود نہیں

ہوئے اس عملی یقین دہانی کے بعد علماء کی طرف سے مثبت قدم اٹھایا گیا اور شعبۂ دینیات کے اولین ناظم کے منصب کے لیے دیوبند سے مولانا عبداللہ انصاری کو روانہ کیا گیا جو مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے داماد تھے، سرسید نے ان کی تقرری کی سفارش کی اور یہ الفاظ لکھے ''مولوی عبد اللہ صاحب فرزند ہیں مولوی انصار علی صاحب کے، نواسے ہیں مولوی مملوک علی صاحب کے، داماد ہیں مولوی محمد قاسم صاحب کے اور ان کے سب بزرگوں سے مجھے ذاتی واقفیت تھی، اس لحاظ سے میں ان کا مدرسے میں تشریف لانا اور رہنا باعث خیر سمجھتا ہوں۔ (حاشیہ موج کوثر، ص:۱۹۳، ۱۹۴) ان الفاظ سے پتہ چلتا ہے کہ سرسید کو علماء دیوبند سے محبت اور عقیدت کا تعلق تھا، اگر علماء دیوبند نے ان کی مخالفت کی ہوتی تو سرسید کبھی مولانا عبداللہ انصاری کے لیے یہ سفارشی خط نہ لکھتے، ایک مرتبہ پیر جی عارف کے نام اپنے ایک خط میں لکھا تھا کہ: ''اگر جناب مولوی محمد قاسم صاحب تشریف لاویں تو یہ میری سعادت ہے، میں ان کی کفش برداری کو اپنی سعادت سمجھوں گا۔'' (مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، حیات اور کارنامے، ص:۱۷۳) مولانا محمد قاسم نانوتویؒ سرسید کی پیدائش کے پندرہ سال بعد دنیا میں تشریف لائے اور سرسید کی وفات سے انیس سال پہلے دنیا سے رخصت ہوگئے، سرسید کا سال وفات ۱۸۹۸ء اور مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کا سن وفات ۱۸۷۹ء ہے، مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے کل انچاس سال کی عمر پائی لیکن اس مختصر زندگی میں جو کارنامے انھوں نے انجام دئے اور فضل وکمال کے جو گہرے نقوش انھوں نے ثبت کیے انھوں نے چھوٹوں ہی کو نہیں بڑوں کو بھی متاثر کیا، سرسید کا شمار بھی ایسے ہی لوگوں میں ہوتا ہے جو مولانا محمد قاسم نانوتویؒ سے گہری عقیدت رکھتے تھے، مولانا نانوتویؒ کی وفات کے بعد سرسید احمد خاں نے جو تعزیتی کلمات سپرد قلم کیے وہ تاریخ کا حصہ بن چکے ہیں، سب سے پہلے یہ تحریر ''انسٹی ٹیوٹ گزٹ'' کی اشاعت ۲۴ اپریل ۱۸۸۰ء میں صفحہ ۴۶۷، ۴۶۸ پر شائع ہوئی، اس کے بعد اس تعزیتی مضمون کو سوانح قاسمی، موج کوثر، تاریخ دار العلوم دیوبند، مولانا محمد قاسم نانوتویؒ؛ حیات اور کارنامے، میں نقل کیا گیا ہے، یہ ایک ایسے شخص کا خراج عقیدت ہے جو عمر میں، جاہ ومنصب میں ان سے کہیں بڑا ہے، غیر معمولی شہرت کا حامل

ہے، دونوں کے درمیان عقیدت کوئی ادنیٰ تعلق بھی نہیں ہے اس کے باوجود سرسید کے قلم سے یہ الفاظ نکلتے ہیں:

''افسوس ہے کہ جناب ممدوح حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے 15 اپریل 1880ء کو ضیق النفس کی بیماری میں بمقام دیوبند انتقال فرمایا۔ زمانہ بہتوں کو رویا ہے اور آئندہ بھی روئے گا۔ لیکن ایسے شخص کے لیے رونا جس کے بعد اس کا کوئی جانشین نظر نہ آوے، نہایت رنج وغم افسوس کا باعث ہوتا ہے۔ ایک زمانہ تھا دلی کے علماء میں سے بعض لوگ جیسے کہ اپنے علم وفضل اور تقویٰ وورع میں معروف ومشہور تھے۔ ایسے ہی نیک مزاجی اور سادہ وضعی اور مسکینی میں بے مثل تھے۔ لوگوں کا خیال تھا کہ بعد جناب مولوی اسحٰق کے کوئی شخص ان کی مثل ان تمام صفات میں پیدا ہونے والا نہیں ہے۔ مگر مولوی محمد قاسم مرحوم نے اپنی کمال نیکی اور دین داری اور تقویٰ اور ورع اور مسکینی سے ثابت کر دیا کہ اس دلی کی تعلیم وتربیت کی بدولت مولوی محمد اسحٰق صاحب کی مثل ایک اور شخص کو بھی خدا نے پیدا کیا ہے۔ جب کہ چند باتوں میں ان سے زیادہ ہے۔

ابھی بہت سے لوگ زندہ ہیں جنہوں نے مولوی محمد قاسم صاحب کو نہایت کم عمری میں دلی میں تعلیم پاتے دیکھا ہے۔ انہوں نے جناب مولوی مملوک علی صاحب سے تمام کتابیں پڑھی تھیں۔ ابتدا ہی سے آثار تقویٰ اور ورع اور نیک بختی اور خدا پرستی کے ان کے اوضاع اور اطوار سے نمایاں تھے اور یہ شعر ان کے حق میں بالکل صادق تھا:

بالائے شرش زہوش مندی
میں تافت ستارہ بلندی

زمانہ تحصیل علم میں جیسے کہ وہ ذہانت اور عالی دماغی اور فہم وفراست میں معروف ومشہور تھے ویسے ہی وہ نیکی اور خدا پرستی میں بھی زبان زد اہل فضل وکمال تھے۔ ان کو جناب مولوی مظفر حسین صاحب کاندھلوی کی صحبت نے اتباع سنت پر بہت زیادہ راغب کر دیا تھا اور حاجی امداد اللہ کے فیض صحبت نے ان کے دل کو ایک نہایت عالی رتبہ دل بنا دیا تھا۔

خود بھی پابند شریعت تھے اور دوسرے لوگوں کو بھی پابند شریعت کرنے میں زائد از حد کوشش کرتے تھے۔ عام مسلمانوں کی بھلائی کا ان کو خیال تھا۔ ان ہی کی کوشش سے علوم دینیہ کی تعلیم کے نہایت مفید مدرسہ دیو بند میں قائم ہوا اور ایک نہایت عمدہ مسجد بنائی گئی علاوہ اس کے اور چند مقامات میں بھی ان کی سعی وکوشش سے مسلمانی مدرسے قائم ہوئے۔ وہ کچھ خواہش پیر و مرشد بننے کی نہیں کرتے تھے۔ لیکن ہندوستان میں ہزارہا آدمی ان کے معتقد تھے اور ان کو اپنا پیشوا و مقتدا جانتے تھے۔

مسائل خلافیہ میں بعض لوگ ان سے ناراض تھے اور بعضوں سے وہ ناراض تھے مگر جہاں تک ہماری سمجھ ہے ہم مولوی محمد قاسم کے کسی فعل کو خواہ کسی سے ناراضگی کا ہو یا خوشی کا ہو۔ کسی طرح ہوائے نفس یا ضد یا عداوت پر محمول نہیں کر سکتے۔ ان کے تمام افعال جس قدر کہ تھے بلا شبہ للّٰہیت اور ثواب آخرت کی نظر سے تھے اور جس بات کو وہ حق اور سچ سمجھتے تھے اس کی پیروی کرتے تھے۔ ان کا کسی سے ناراض ہونا صرف خدا کے لیے تھا اور کسی سے خوش ہونا خدا کے واسطے سے تھا۔ کسی شخص کو مولوی محمد قاسم صاحب اپنے ذاتی تعلقات کے سبب اچھا یا برا نہیں جانتے تھے۔ مسئلہ حب للہ اور بغض للہ خاص ان کے برتاؤ میں تھا۔ ان کی تمام خصلتیں فرشتوں کی سی خصلتیں تھیں۔ ہم اپنے دل سے ان کے ساتھ محبت رکھتے تھے اور ایسا شخص جس نے ایسی نیکی سے اپنی زندگی بسر کی ہو بلا شبہ نہایت محبت کے لائق ہے۔

اس زمانے میں سب لوگ تسلیم کرتے ہوں گے کہ مولوی محمد قاسم اس دنیا میں بے مثل تھے۔ ان کا پایہ اس زمانے میں شاید معلوماتی علم میں شاہ عبدالعزیز سے کچھ کم ہو۔ الا اور تمام باتوں میں ان سے بڑھ کر تھا۔ مسکینی، نیکی اور سادہ مزاجی میں اگر ان کا پایہ مولوی اسحٰق سے بڑھ کر نہ تھا تو کم بھی نہ تھا۔ وہ درحقیقت فرشتہ سیرت اور ملکوتی خصلت کے شخص تھے۔ اور ایسے آدمی کے وجود سے زمانے کا خالی ہو جانا ان لوگوں کے لیے جو ان کے بعد زندہ ہیں نہایت رنج اور افسوس کا باعث ہے۔

افسوس ہے کہ ہماری قوم نے بہ نسبت اس کے کہ عملی طور پر کوئی کام کرے زبانی

عقیدت اور ارادے بہت زیادہ ظاہر کرتی ہے۔ ہماری قوم کے لوگوں کا یہ کام نہیں ہے کہ ایسے شخص کے دنیا سے اٹھ جانے کے بعد صرف چند کلمے حسرت اور افسوس کے کہہ کر خاموش ہو جائیں۔ یا چند آنسو آنکھ سے بہا کر اور رومال سے پونچھ کر چہرہ صاف کرلیں بلکہ ان کا فرض ہے کہ ایسے شخص کی یادگار کو قائم رکھیں۔

دیوبند کا مدرسہ ان کی نہایت عمدہ یادگار ہے اور سب لوگوں کا فرض ہے کہ ایسی کوشش کریں کہ وہ مدرسہ ہمیشہ قائم اور مستقل رہے اور اس کے ذریعے سے تمام قوم کے دل پر ان کی یادگاری کا نقش جمارہے۔"

یہ ایک طویل تحریر ہے مضمون کی تنگ دامانی مکمل تحریر نقل کرنے سے مانع ہے یہ چند سطریں بھی یہ حقیقت واضح کرنے کے لیے کافی ہیں کہ ان دونوں بزرگوں نے اگرچہ امت کی فلاح وصلاح کے لیے الگ الگ راستے چنے لیکن کبھی ایک دوسرے کے مزاحم نہیں ہوئے، بلکہ دونوں نے ایک دوسرے کو قوم وملت کے لیے مخلص اور ہمدرد سمجھا، دونوں نے ایک دوسرے کی مدد کی، اور دونوں ایک دوسرے کی تعریف میں رطب اللسان رہے۔

حضرت مولانا حکیم محمد اختر ؒ اور مثنوی

حضرت مولانا حکیم محمد اختر ؒ بچپن ہی سے مثنوی مولانا رومؒ کے دل دادہ تھے، یہ ذوق انہیں حفظ کے استاذ سے ملا تھا، جو برابر پروان چڑھتا رہا، یہاں تک کہ گویا مثنوی حضرتؒ کی رگوں میں سرایت کر گئی تھی، شائد ہی کوئی محفل، کوئی مجلس، کوئی تحریر، کوئی تقریر ایسی ہوگی کہ جس میں مثنوی کے اشعار پڑھے، یا لکھے نہ گئے ہوں، مثنوی مولانا رومؒ سے حضرت مولانا حکیم محمد اخترؒ کو کس قدر شغف تھا اس کا اندازہ اس بات سے ہوگا کہ انہوں نے اس سلسلے میں تین کتابیں ''معارفِ مثنوی''، ''درسِ مثنوی'' اور فغانِ رومی لکھی ہیں۔ معارفِ مثنوی کے مقدمہ میں حضرت مولانا حکیم محمد اخترؒ نے لکھا کہ ''احقر کو مثنوی شریف سے اس وقت سے والہانہ تعلق وشغف ہے جب کہ احقر بالغ بھی نہ ہوا تھا، اور پھر حق تعالیٰ نے ایسا شیخ عطا فرمایا جو مثنوی شریف کے عاشق تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ مثنوی شریف میں عشق کی آگ بھری ہوئی ہے اور اپنے پڑھنے والوں کے سینوں میں بھی آگ لگا دیتی ہے'' حضرت مولانا حکیم محمد اخترؒ نے اعتراف کیا ہے کہ اُن کی بہت سی کتابیں خواہ وہ تالیف ہوں یا ترتیب سب مثنوی شریف کے فیض سے لکھی گئی ہیں، یا مرتب ہوئیں ہیں، بعض اوقات حضرت مولانا حکیم محمد اختر صاحبؒ اپنے شیخ حضرت پھول پوریؒ کو مثنوی شریف کے منتخب اشعار بھی سناتے اور اُن کی تشریح بھی کرتے، حضرت پھول پوریؒ کو اس مذاکرۂ علمی سے بڑا لطف آتا تھا، بعض مثنوی شریف کے اشعار اور اُن کی شرح سن کر آب دیدہ ہو جاتے، ایک دفعہ حکیم صاحبؒ نے بعد نمازِ فجر مثنوی شریف کی شرح شروع کی، حضرتؒ پوری توجہ سے سن رہے تھے، حضرتؒ کو اس دن اس قدر لطف آیا کہ دن کے گیارہ بج گئے یعنی پانچ گھنٹے، دونوں شیخ و مُرشد مثنوی شریف کی تشریحات سنتے سناتے رہے، ایک مرتبہ حرم مکہ میں حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ کی طبیعت علیل اور مضمحل تھی، حکیم صاحبؒ نے اپنے مخصوص انداز میں مثنوی شریف کے اشعار سنائے اور اُن کی شرح کی، مغرب سے عشاء تک یہ سلسلہ چلا، حضرت پرتاب گڑھیؒ نے فرمایا کہ تمہاری باتیں سن کر تو میں اچھا ہو گیا اور سارا اضمحلال جاتا رہا، حضرت حکیم صاحبؒ کی بڑی خواہش تھی کہ مثنوی کے

منتخب اشعار کی تشریح اُن کے قلم سے ہو اور وہ کتابی شکل میں شائع ہوکر لوگوں تک پہنچے ''معارفِ مثنوی''، حضرت حکیم صاحبؒ کی اسی دیرینہ تمنا کی مجسم شکل ہے۔

معارفِ مثنوی ایک بالکل منفرد شرح ہے، جو محض لفظی ترجمہ نہیں بلکہ حضرت رومیؒ کے منتشر اور وسیع علوم کو جمع کر کے دریا بکوزہ کر دیا گیا ہے، جس میں حضرت والاؒ کی آتشِ عشق اور دردِ دل سے ایک منفرد اور دل آویز اسلوبِ بیان، دلوں میں اللہ کی محبت کی آگ جلا دیتا ہے، معارفِ مثنوی کے متعلق بعض امتیازی خصوصیات حضرت مولانا حکیم محمد اخترؒ نے ترجمۃ المصنف میں خود تحریر فرمائی ہیں۔

''معارفِ مثنوی'' جب چھپ کر آئی تو اس وقت کے اکابرینِ اُمت نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ نے لکھا: ''مضامین ماشاء اللہ بہت اچھے ہیں اور دل پر اثر کرنے والے ہیں''۔ محی السنۃ حضرت مولانا ابرار الحق ہردوئیؒ نے تحریر فرمایا: ''بہت ہی پسند آئی ماشاء اللہ مثنوی شریف کی خوب تشریح کی ہے گاہ بہ گاہ اس کو اپنے یہاں بعد عصر سناتا بھی ہوں''۔ حضرت مولانا محمد احمد پرتاب گڑھیؒ نے اس تأثر کا اظہار فرمایا: ''کتاب معارفِ مثنوی اس لائق ہے کہ سفر وحضر میں ساتھ رکھی جائے اُس سے منتفع ہوا جائے''۔ مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع عثمانیؒ نے لکھا: ''ماشاء اللہ یہ مثنوی مولانا رومیؒ کی بڑی مفید خدمت ہوگی لوگوں کے لیے استفادہ آسان ہوجائے گا''۔ محدث العصر حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوریؒ (شارح ترمذی) نے تحریر فرمایا: ''مولانا حکیم محمد اختر صاحب کی تالیفِ لطیف معارفِ مثنوی پڑھ کر موصوف سے اتنی عقیدت ہوئی جس کا مجھے تصوّر بھی نہ ہوسکتا تھا''۔ محقق العصر حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ نے لکھا: ''معارفِ مثنوی کا مطالعہ شروع کیا جب تک نیند نے مجبور نہیں کیا پڑھتا رہا، یہ کتاب برابر میرے قریب رہتی ہے''۔ عارف باللہ حضرت ڈاکٹر محمد عبد الحئی عارفیؒ نے ارشاد فرمایا: ''اس شرح سے مولانا رومیؒ کی مثنوی میں ناظرین کے لیے وجد آفرینی اور نافعیت پیدا ہوگئی ہے۔ مفکرِ اُمت حضرت مولانا سید ابو الحسن علی میاں حسنی ندویؒ نے فرمایا: ''حکیم صاحب نے اردو میں مثنوی کی ایک نئے طرز کی

خدمت کی ہے (انہوں نے) مولانا رومؒ کا خوانِ نصیحت وحکمت چُن دیا ہے اور اُن موتیوں کو جو مثنوی کے دفتر میں محفوظ تھے لوگوں کی دسترس میں دے دیا ہے‘‘۔ ممتاز عالم دین حضرت مولانا مفتی محمد عاشق الٰہی بلند شہریؒ نے معارفِ مثنوی کے متعلق فرمایا: ’’شرح کیا ہے؟ دریا بکوزہ ہے اور سالکینِ راہِ طریقت کے لیے وبالنجم ھم یھتدون کا مصداق ہے‘‘۔ فقیہ العصر حضرت مولانا مفتی رشید احمد لدھیانویؒ (صاحبِ احسن الفتاویٰ) نے اس شرح کو حضرت پھول پوریؒ کا فیض قرار دیتے ہوئے فرمایا: ’’حضرت پھول پوریؒ مثنوی رومی کی مجسم تصویر اور چلتی پھرتی تفسیر تھے، حضرتؒ نے اپنی ترجمانی کے لیے زبانِ اختر کو منتخب فرمایا تو ظاہر ہے اس کی حسن تعبیر کے لیے کتنی دعائیں کی ہوں گی۔ ایران کے ایک بہت بڑے عالم علامہ محی الدین زاہدی قاسمی نے حضرتؒ کی مثنوی پر تحریر فرمایا کہ: ’’ہر کہ مثنوی اختر بخواند اور مثنویٔ مولانا روم پندارد، حقا کہ مولانا حکیم محمد اختر صاحب رومی عصر اند‘‘ یعنی جو بھی مثنوی اختر کی پڑھتا ہے اس کو مثنوی مولانا روم سمجھتا ہے بے شک مولانا حکیم محمد اختر صاحب اس زمانے کے رومی ہیں۔ اور دوسرے بزرگوں نے بھی معارفِ مثنوی کو سراہا ہے، امید ہے ان شاء اللہ یہ کتاب اور دوسری تمام کتابیں حضرتؒ کے لیے صدقۂ جاریہ بنیں گی۔ حضرتؒ کی کتابیں افادۂ عام کے لیے مفت تقسیم ہوتی تھیں۔ بحمد اللہ آج بھی اسی طرح حضرتؒ کی کتابیں چھپ رہی ہیں اور پڑھی جارہی ہیں، حضرت مولانا حکیم صاحبؒ کو کتابوں کی اشاعت سے اس قدر دلچسپی تھی کہ انتقال سے پہلے حضرت مولانا حکیم محمد اخترؒ نے جو وصیت نامہ مرتب فرمایا تھا جو انتقال کے بعد عام کیا گیا اس کی پانچویں شق میں لکھا کہ ’’میری تمام تصانیف کی اشاعت کا بھی اہتمام رکھیں تاکہ صدقۂ جاریہ رہے۔‘‘

حق تعالیٰ مغفرت فرمائیں اُن کی وفات سے تصوّف وسلوک اور تعلیم وتربیت کے میدان میں زبردست خلا واقع ہوا ہے، ساری دنیا میں عام طور پر اور پاکستان کے دینی حلقوں میں خاص طور پر اُن کی کمی دیر تک محسوس کی جائے گی۔

مدتوں رویا کریں گے جام وپیمانہ تجھے
(مہتمم دارالعلوم دیوبند حضرت مولانا مرغوب الرحمٰنؒ)

مشہور عالمی دینی درس گاہ ازہرالہند دارالعلوم دیوبند کے مہتمم حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحبؒ نے آٹھ دسمبر دو ہزار دس کی صبح یو پی کے مردم خیز شہر بجنور میں وفات پائی، وہ قمری ماہ وسال کے حساب سے سو سال اور شمسی حساب سے چھیانوے برس کے تھے، طویل العمری خدا کی بڑی نعمتوں میں سے ایک نعمت ہے، اور بہت کم لوگ ایک صدی کا سفر پورا کرکے اس نعمت کے مستحق ہوتے ہیں، پھر اگر یہ طویل سفر کامیابیوں اور کامرانیوں سے بھرپور ہو تو یہ نعمت عظیم ہی نہیں عظیم ترین بن جاتی ہے، حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحبؒ نے زندگی کے آخری تیس سال دارالعلوم دیوبند کی خدمت میں بسر کئے جو عالم اسلام کا ایک عظیم دینی تعلیمی ادارہ ہی نہیں بلکہ 1857 کے انقلاب کے بعد اسلامیان ہند کی نشأۃ ثانیہ کی اولین تحریک بھی ہے، ہندوستان ہی نہیں بلکہ برصغیر ہندو پاک کے مسلمانوں کی گردنیں اس عظیم تحریک سے وابستہ علماء وصلحاء کی قربانیوں کے آگے جھک جاتی ہیں، 1980 سے پہلے مولانا مرغوب الرحمٰن صاحبؒ کو کوئی جانتا بھی نہ تھا، بلاشبہ وہ دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کے رکن تھے، مگر مدت تک ان کی شخصیت بجنور سے دیوبند کے محدود فاصلے میں گم رہی، اچانک 1980 میں تقسیم دارالعلوم کا قضیہ نامرضیہ پیش آیا اور مولانا کی شخصیت سب کی توجہات کا مرکز بن گئی۔ سب سے پہلے تو مجلس شوریٰ کے اراکین کی نظر ان پر پڑی، اس وقت ہندوستان کی ممتاز ترین شخصیتیں دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ میں شامل تھیں۔ انہوں نے محسوس کیا کہ اس نازک دور میں اگر کوئی شخص بزرگوں کی اس ڈوبتی کشتی کو ساحل سے ہم آغوش کرسکتا ہے وہ مولانا مرغوب الرحمٰن ہیں جن کے اندر اللہ تعالیٰ نے خاموشی کے ساتھ دوراندیشی اور تدبر کے ساتھ کام میں لگے رہنے کا جذبہ بھرپور طریقے پر ودیعت کیا ہے۔ بزرگوں کا خیال صحیح تھا۔ انہوں نے اپنی شخصیت کے اس پہلو کے اعتراف پر سب کو مجبور کردیا کہ وہ سخت سے سخت حالات میں بھی کام کرنے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔ اس وقت ان کی عمر سات دہائیوں کے قریب

پہنچ چکی تھی، کم زوراعصاب کے لوگ اس عمر میں کسی بار گراں کے تحمل کا تصور بھی نہیں کرسکتے مگر وہ اس وقت بھی عزم وحوصلے کے اعتبار سے جوان تھے اوراس عمر میں بھی بلند حوصلہ رہے جب وہ اپنی زندگی کی سو بہاریں دیکھ کر رخصت ہوا چاہتے تھے، مولانا رخصت ہوگئے مگر اپنی خدمات سے تاریخ دیوبند کا ایک باب روشن کر گئے، بلکہ ایک ایسی تاریخ بنا گئے جسے آ؟ نے والی نسلیں دیر تک یاد رکھیں گی۔

حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحبؒ کی پیدائش 1332ھ مطابق 1914 میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم اپنے آبائی وطن بجنور کے مدرسہ رحیمیہ میں حاصل کی۔ اعلیٰ تعلیم کے لیے دار العلوم دیوبند میں داخلہ لیا اور اس ادارے کے نامور اساتذہ کے سامنے زانوئے تلمذ طے کیا۔ ان میں شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ، شیخ الادب حضرت مولانا اعزاز علی امروہویؒ اور مفتی اعظم حضرت مولانا مفتی محمد شفیع عثمانیؒ جیسے معروف نام شامل ہیں۔ دار العلوم دیوبند سے 1932 میں فارغ ہوئے۔ فراغت کے بعد کچھ انقطاع ہوا مگر بہت جلد انہوں نے اپنا تعلیمی سفر دوبارہ شروع کر دیا اور دار العلوم دیوبند کے شعبۂ افتاء میں داخل ہوکر فقہ وفتاوی کی تعلیم حاصل کی۔ اس طرح وہ عالم دین کے ساتھ ساتھ مفتی بھی بنے۔ مولانا کا خاندان بجنور کے رؤساء کا خاندان کہلاتا تھا۔ زندگی بھر وہ رئیسِ بجنور کی حیثیت سے معروف رہے، زمینیں، باغات، حویلیاں اس خاندان میں پشتہا پشت سے موجود ہیں۔ اس لیے ان کی پرورش بڑے نازونعم میں ہوئی۔ فراغت کے بعد مولانا نے آبائی زمینوں کی دیکھ بھال میں زندگی بسر کی۔ ان کے والد حضرت مولانا مشیت اللہ بجنوری بھی دار العلوم دیوبند کے ممتاز فضلاء میں شمار ہوتے تھے۔ دار العلوم دیوبند کے اکابر علماء سے ان کا گہرا تعلق تھا۔ امام العصر علامہ سیّد محمد انور شاہ کشمیریؒ ان کے رفیق درس تھے، اس طرح اس خاندان کا دار العلوم دیوبند کے ساتھ فکری مناسبت کے ساتھ ساتھ قلبی تعلق بھی رہا۔ حضرت مولانا مشیت اللہ صاحبؒ سے منتقل ہوکر یہ تعلق ان کے لائق فرزند مولانا مرغوب الرحمٰن صاحبؒ کے دل کی گہرائیوں میں جاگزیں ہوا اور آخر وقت تک برقرار رہا۔ یہاں تک کہ وہ آخری ایام میں جب مستقل صاحب فراش تھے

تب بھی ان کے دل میں یہ تڑپ تھی کہ وہ اپنے آخری لمحات دار العلوم دیو بند ہی کے روحانی ماحول میں گزاریں۔ دیو بند کے مشہور قبرستان قاسمی میں ان کی تدفین بھی اسی تڑپ اور آرزو کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کی کوشش ہے جس کے لیے ان کے ورثاء اور اہل بجنور تعریف وتوصیف کے مستحق ہیں کہ انہوں نے اپنا عظیم سرمایہ سرزمین دیو بند کے سپرد کر دیا، زندگی میں بھی اور موت کے بعد بھی۔ **فجزاهم الله خير !!**

حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحبؒ 1962 میں دار العلوم دیو بند کے رکن شوریٰ منتخب ہوئے۔ وہ پابندی کے ساتھ مجلس شوری کی نشستوں میں شریک ہوتے۔ ان کی رائے نہایت وقیع سمجھی جاتی تھی، ان کے فہم وتدبر کے سب ہی معترف تھے۔تقوی وتدین ان کے کردار عمل سے جھلکتا تھا۔ وہ دیو بند دار العلوم کے مجلس شوریٰ کے جلسوں میں شرکت کے لیے تشریف لاتے، لیکن قیام دار العلوم سے باہر اپنے ایک محبّ قدیم کے دولت کدے پر کرتے، کھانا ناشتہ سب ان ہی کے دستر خوان پر ہوتا۔ دار العلوم دیو بند کا ایک حبّہ بھی ان کی ذات پر خرچ ہو یہ انہیں گوارا نہیں تھا۔ 1980 کے بعد جب دار العلوم دیو بند کو نظر بد لگی اور اس کے نظام میں خلل واقع ہوا تو انہیں 1981 میں حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب؟ مہتمم دار العلوم دیو بند کے معاون کی حیثیت سے مقرر کیا گیا۔ جب حالات مزید ابتر ہوئے اور دار العلوم کے قریب ایک کیمپ کا قیام عمل میں آیا تو ان کو کارگزار مہتمم بنا دیا گیا اور جب حضرت قاری صاحبؒ کو منصب اہتمام سے بے دخل کر دیا گیا تو مجلس شوریٰ نے 1982 میں ان کو مہتمم کے منصب پر فائز کر دیا۔ اس وقت عام تأثر یہ تھا کہ زمیندارانہ ذہن ومزاج رکھنے والے یہ خاموش طبع عالم دین رکن شوریٰ اس بارگراں کا تحمل نہیں کر پائیں گے۔ ہوسکتا ہے خود ہی ہمت ہار بیٹھیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ ماحول ان کے خلاف ہو جائے، مگر جیسے جیسے وقت گزرتا رہا ان کے جوہر کھلتے چلے گئے۔ لوگوں کو اندازہ ہوا کہ یہ خاموش آتش فشاں محض راکھ کا ڈھیر نہیں ہے بلکہ اس کی تہہ میں آگ کے طوفان خوابیدہ ہیں جو شعلہ بداماں ہوں گے تو مخالفوں کی امنگوں کو جلا کر راکھ کر دیں گے۔ انہوں نے بڑی کامیابی کے ساتھ تیس سال کا سفر پورا کیا اور اپنے

خونِ جگر سے ایک تاریخ لکھی، جس کا ایک ایک لفظ ایثار، اخلاص، تدبر، تیقظ، تدین اور تقوی وپرہیزگاری کا روشن عنوان ہے۔ آج وہ ہم میں نہیں ہیں لیکن ان کے دور کی کامیابیاں سر رہ گزر روشن ہیں۔ دار العلوم کا ہر ذرہ پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ مولانا مرغوب الرحمٰن صاحبؒ جیسا مخلص، بے لوث اور دیانت دار قائد اس ادارے کو مشکل ہی سے ملے گا۔

ان کے دور اہتمام میں دار العلوم دیوبند نے بے مثال ترقی کی ہے، 1982 میں اس ادارے کا بجٹ ایک کڑوڑ تک محدود تھا آج وہ تیرہ چودہ کروڑ ہے۔ ان کے دور میں کئی شاہ کار عمارتیں وجود میں آئیں، خاص طور پر مسجد رشید جس کی رعنائی وزیبائی قابل دید ہے۔ ان ہی کے دور میں کروڑوں کے صرفے سے تعمیر ہوئی، شیخ الہند منزل، شیخ الاسلام منزل، حکیم الامت منزل، ان ہی کے دور میں بنیں۔ لائبریری کی عظیم الشان آٹھ منزلہ عمارت کا سنگ بنیاد ان ہی کے دور میں رکھا گیا۔ جدید دار الاقامہ کی تعمیر کا آغاز ان ہی کے دور میں ہوا، تعلیمی اعتبار سے بھی ان کا دور نہایت تابناک رہا، نصاب کو عصری تقاضوں سے ہم آہنگ کیا گیا، کئی تعلیمی شعبے کھولے گئے۔ افتاء کی تعلیم میں زبردست پیش رفت ہوئی، شعبۂ صحافت قائم کیا گیا، انگلش کی تعلیم اور کمپیوٹر کی ٹریننگ کا آغاز ہوا، ختم نبوت کی تحریک کے تن مردہ میں جان ڈالی گئی اور اس کے لیے باقاعدہ دفتر کا قیام عمل میں آیا۔ ملک بھر کے مدارس کو فکر وعمل کی ایک زنجیر میں منسلک کرنے کے لیے رابطہ مدارس عربیہ اسلامیہ کا شعبہ قائم ہوا، یہ اور اس طرح کے بہت سے کام حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحبؒ کے دور میں ہوئے، اگر یہ کہیں تو غلط نہ ہوگا کہ ان کا دور اہتمام ہر اعتبار سے مثالی رہا ہے۔ ملازمین اور اساتذہ کی تنخواہیں بار بار بڑھائی گئیں، طلبہ کے وظیفوں میں اضافہ کیا گیا، تعلیمی نظام کو استحکام دیا گیا، ان کے کامیاب اہتمام کا سب سے تابناک پہلو یہ رہا کہ ان کے تیس سالہ دور میں کبھی کوئی شورش برپا نہیں ہوئی، ملکی اور بین الاقوامی سطح پر بھی دار العلوم کے وقار میں اضافہ ہوا، سیاسی طور پر بھی اس کا وزن محسوس کیا گیا اگرچہ دار العلوم دیوبند کا اپنا کوئی سیاسی نظریہ نہیں ہے، نہ پہلے تھا اور نہ آج ہے، مگر ہر سیاسی جماعت اس بات کے لیے کوشاں رہی کہ وہ دار العلوم دیوبند کے مہتمم اور اس کے اکابر کی

خوشنودی حاصل کر کے ملک کے مسلمانوں کا اعتماد جیت لے۔

یہ بات تسلیم کی جانی چاہئے کہ دار العلوم کے بزرگوں نے اپنی طویل خدمات سے اس ادارے کو جو وقار اور اعتبار عطا کیا تھا حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحبؒ نے اس میں اضافہ ہی کیا ہے، اس میں کسی طرح کی کوئی کمی نہیں آنے دی، ہر معاملے میں ان کی احتیاط اور اصابت رائے قابل تعریف تھی، مختلف ملکی اور بین الاقوامی ایشوز پر ان کی رائے وقتاً فوقتاً میڈیا کے ذریعے عوام تک پہنچتی تھی لیکن کبھی کسی نے اس پر انگلی نہیں رکھی، کسی کو تنقید کا موقع نہیں ملا۔ یہ اس بات کی علامت ہے کہ مسائل پر ان کی نظر گہری تھی اور وہ جرأت کے ساتھ ہر مسئلے پر اظہار خیال کی صلاحیت رکھتے تھے۔

بے پناہ انتظامی صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ وہ انتہائی متقی اور پرہیز گار انسان بھی تھے۔ دار العلوم دیو بند کو انہوں نے خدمت کی جگہ سمجھا اور عبادت سمجھ کر اس کی خدمت انجام دی، نہ اسے ذریعہ شہرت بنایا اور نہ اس سے مالی فوائد حاصل کئے، بلکہ ہر سال اپنی جیب خاص سے دار العلوم دیو بند کی مالی خدمت کرتے رہے۔ مالیات کے باب میں انتہائی محتاط تھے، جائز حدود میں رہ کر وہ دار العلوم دیو بند کا ایک پیسہ بھی اپنی ذات پر استعمال نہیں کرتے تھے، تیس سال تک دار العلوم کے خادم بن کر رہے، مگر اپنا کھایا، اپنا خرچ کیا، جس کمرے میں رہے اس کا کرایہ اور بجلی کا خرچ بھی ماہ بہ ماہ ادا کرتے رہے۔ ان کی شخصیت نہایت دلآویز تھی، انتہائی وضع دار، متواضع، ملنسار، مہمان نواز، با اخلاق انسان تھے، یہ تمام خوبیاں اس وقت رخصت ہوگئیں جب 8 / دسمبر کی شب گیارہ بجے علماء، صلحاء، طلبہ اور عوام کی ایک بڑی تعداد نے ان کے جسد خاکی کو اپنے کاندھوں پر اٹھا کر قبرستان قاسمی تک پہنچایا اور بزرگوں کے پہلو میں لٹا کر یہ کہتے ہوئے باچشم نم رخصت ہوئے۔

جان کر منجملہ خاصانِ میخانہ تجھے
مدتوں رویا کریں گے جام و پیمانہ تجھے

دار العلوم دیو بند کے عظیم فرزند

شیخ الحدیث مولانا سلیم اللہ خاں رحمہ اللہ

یادگارِ اکابر، اُستاذ الاساتذہ، رئیس المحدثین حضرت مولانا سلیم اللہ خاں صاحبؒ اَب اِس دُنیائے فانی میں نہیں رہے، یہ خبر وحشت اثر ۱۶/ جنوری ۲۰۱۷ء کی شب ۱۰ بجے کے قریب پاکستان سے آئی اور دیکھتے ہی دیکھتے پوری دُنیا میں پھیل گئی، جو لوگ بھی سلسلۂ دیوبند سے وابستہ ہیں اور جن لوگوں کو مدارسِ اِسلامیہ اور علومِ دِینیہ سے ذرا بھی تعلق ہے وہ اِس خبر سے بے چین ہو اُٹھے، حالاں کہ نہ یہ خبر غیر متوقع تھی اور نہ تعجب خیز، ایک نہ ایک دِن تو یہ ہونا ہی تھا کیوں کہ موت ہر ذِی نفس کو آنی ہے اور حضرتؒ تو عمر کی اس منزل پر پہنچ چکے تھے جہاں ہر دم جدائی کا دھڑکا لگا رہتا ہے، اس کے باوجود لوگوں کو اس خبر سے ایسا لگا کہ جیسے ان پر کوئی اچانک اُفتاد آپڑی ہو اور وہ کسی ناگہانی حادثہ کا شکار ہو گئے ہوں، دراصل بزرگوں کی وفات کا غم ہوتا ہی ہے بے حد تکلیف دہ اور اذیت ناک، اس یقین کے باوجود کہ ہمارے بڑوں اور بزرگوں کو بھی بالآخر اس دُنیا سے رُخصت ہونا ہے اُن کی وفات غم و اندوہ کا کوہِ گراں ثابت ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ حضرت کی مغفرت فرمائے، اُن کے درجات بلند فرمائے، اُن کی وفات سے اُمت اِسلامیہ کو بالخصوص مدارسِ عربیہ کو جو نقصان پہنچا ہے اس کی تلافی فرمائے۔

شیخ الحدیث حضرت مولانا سلیم اللہ خاںؒ کا تعلق آفریدی پٹھانوں کے خاندان ملک دین خیل سے ہے جو غیر منقسم ہندوستان کے آزاد قبائلی علاقہ میں سکونت پذیر تھا، آج کل یہ علاقہ پاکستان میں ہے اور حضرتؒ کا قبیلہ اس علاقہ کے ''خیبر ایجنسی'' میں واقع چورا میں رہتا تھا، کسی وقت اس قبیلہ کے کچھ افراد مظفر نگر یوپی کے قصبہ حسن پور لوہاری میں آبسے تھے، حضرت ۲۵ دسمبر ۱۹۲۶ء کو اسی قصبہ میں پیدا ہوئے، حسن پور لوہاری جماعت دیوبند کے سرخیل سیّد الطائفہ حضرت حاجی اِمداد اللہ مہاجر مکیؒ کے پیر و مرشد حضرت شیخ میاں جی نور محمد جھنجھانویؒ کا مسکن رہا ہے، اِس لحاظ سے یہ قصبہ تارِیخی اہمیت کا حامل ہے، مولانا سلیم اللہ خاں صاحبؒ نے اِبتدائی تعلیم اسی قصبہ کے دو استاذوں سے حاصل کی جن میں سے ایک کا نام منشی اللہ بندہ ہے، ان سے حضرتؒ نے قرآنِ کریم ناظرہ پڑھا، مغرب کے بعد گھر پر پڑھانے کے لیے تشریف

لاتے تھے، حافظ نہیں تھے، اس کے باوجود روزانہ ایک قرآن کریم ختم کرنے کا معمول تھا، قناعت پسندی اور دنیا سے بے رغبتی میں اپنی مثال آپ تھے، دوسرے استاذ منشی بندہ حسن تھے جن سے اُردو اور فارسی کی تعلیم حاصل کی، یہ بھی پرہیزگار اور متقی انسان تھے، اکثر و بیشتر ذکر واذکار اور نوافل میں مشغول رہتے تھے۔

قرآن کریم اور اُردو فارسی کی تعلیم سے فراغت کے بعد مدرسہ مفتاح العلوم جلال آباد کے مہتمم حضرت مولانا مسیح اللہ خاں صاحبؒ کی خدمت میں بھیج دئے گئے، جلال آباد تھانہ بھون اور حسن پور لوہاری سے چند کلو میٹر کے فاصلہ پر واقع ہے، حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے اس قصبہ میں ایک مدرسہ قائم کیا تھا اور اس کی ذمہ داری اپنے ممتاز خلیفہ حضرت مولانا مسیح اللہ خاں شیروانیؒ کو سونپ دی تھی، مولانا سلیم اللہ خاںؒ نے دو سال چھ ماہ کی مدت میں چار سال کا عربی نصاب یہاں رہ کر مکمل کیا، اکثر کتابیں حضرت مولانا مسیح اللہ خاںؒ سے پڑھنے کی سعادت حاصل کی۔

جلال آباد کے بعد راہ علم کے اس مسافر کی اگلی منزل دیوبند تھی جہاں انھوں نے پانچ سال گزارے اور دارالعلوم دیوبند کے رائج نصاب کے مطابق جملہ فنون؛ منطق، فلسفہ، ادب، اصول، ریاضی، فقہ، کلام، تفسیر اور حدیث کی کتابیں متعدد اساتذۂ فن سے پڑھیں فراغت کے وقت حضرت کی عمر بیس سال تھی۔

حصولِ علم کا شوق بچپن ہی سے تھا، محنتی بھی تھے اور ذہین بھی، اس پر جلال آباد میں حضرت مولانا مسیح اللہ خاں صاحبؒ کی نگرانی اور توجہ، دارالعلوم دیوبند کا صاف ستھرا علمی ماحول اور شیخ الاسلام حضرت مولانا سیّد حسین احمد مدنیؒ اور شیخ الادب والفقہ حضرت مولانا اعزاز علی امروہویؒ جیسے حضرات کی موجودگی، ان سب اسباب نے مل کر علم وعمل، تقویٰ اور بزرگی کا جو پیکر تراشا وہ حضرت مولانا سلیم اللہ خاںؒ کی صورت میں جلوہ گر ہوا۔

مدرسہ مفتاح العلوم جلال آباد میں ایک مرتبہ سالانہ امتحان کے لیے مظاہر علوم سہارن پور کے ناظم، حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے خلیفہ حضرت مولانا اسعد

اللہ صاحبؒ تشریف لائے، انھوں نے دس بارہ طلبہ کی جماعت کا امتحان لیا، دو طالب علموں کے متعلق وہ یہ لکھ کر گئے کہ ''یہ دو بچے بڑے باصلاحیت ہیں، اللہ تعالیٰ ان سے دین کی خدمت لے گا'' ان میں سے ایک بچے کا نام سلیم اللہ تھا جو آگے چل کر اپنے وقت کا عظیم محدث بنا، اور دوسرے بچّے کا نام رفیق احمد تھا، جو بعد میں علامہ رفیق احمد کہلائے اور مدرسہ مفتاح العلوم جلال آباد کے شیخ الحدیث بنے۔

یہ دونوں ساتھی جلال آباد سے دیوبند بھی ساتھ ہی آئے، یہ واقعہ ۱۹۴۲ء کا ہے، دونوں نے ساتھ ہی پڑھا، ایک دوسرے کے ساتھ دوستی بھی رہی اور پڑھنے میں منافست اور مسابقت کا سلسلہ بھی رہا، دونوں ایک دوسرے سے چھپ کر پڑھتے اور ایک دوسرے کے سامنے اس طرح کا مظاہرہ کرتے گویا وہ آج کل پڑھ ہی نہیں رہے ہیں، دونوں ساتھی ایک دوسرے سے نظر بچا کر جنگل کا رخ کرتے اور گھنے درختوں کی شاخوں پر کتابیں لے کر بیٹھ جاتے، دونوں یہ کوشش کرتے کہ اس کے ساتھی کو اس کے مطالعہ اور محنت کی خبر نہ ہو۔

مولانا سلیم اللہ خاںؒ بچپن ہی سے نہایت ذہین تھے، اس پر شوق اور محنت، ان تینوں چیزوں نے ان کی علمی شخصیت کی تشکیل میں بڑا کردار ادا کیا ہے، قدرت نے ان کو بے نظیر حافظہ عطا کیا تھا، ان کی قوتِ حفظ کے واقعات پڑھ کر اور سن کر قرونِ اُولیٰ کے محدثین کے حافظے کے واقعات تازہ ہو جاتے ہیں، ان کے شاگرد رشید مولانا ابن الحسن عباسی نے ایسے ہی دو واقعات لکھے ہیں۔

طالب علمی کے زمانہ میں رمضان کی تعطیلات گزارنے کے لیے دار العلوم دیوبند سے اپنے گھر آئے، خیال ہوا کہ چھٹیوں کے اس وقفہ میں قرآن کریم کے کچھ پارے حفظ کرلوں، رمضان سر پر تھا، مشورہ ہوا کہ روزانہ چوتھائی پارہ یاد کرلیا کرو اور تراویح میں سنا دیا کرو، اس طرح تراویح بھی ہو جائے گی اور رمضان میں تمہیں سات آٹھ پارے بھی یاد ہو جائیں گے، اب جو یاد کرنے بیٹھے تو چوتھائی کے بجائے پورا پارہ یاد ہو گیا، اور اس شان سے یاد ہوا کہ اسی رات تراویح میں سنا بھی دیا، کبھی کبھی سوا پارہ یا ڈیڑھ پارہ بھی یاد کرلیتے، رمضان

کی ستائیسویں شب میں قرآن کریم کی تکمیل ہوگئی، جس نے سنا حیرت میں رہ گیا، علاقہ کے لوگوں کو بالخصوص حفاظ کو جب اس واقعہ کا علم ہوا تو انہیں یقین ہی نہ آیا کہ ایسا بھی ہوسکتا ہے، مگر انکار ممکن نہ تھا کیوں کہ یہ واقعہ ظہور میں آچکا تھا۔ (متاعِ وقت کاروانِ علم، ص: ۲۵۸)

ایسا ہی ایک واقعہ حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کا بھی ہے، سفر حج کے دوران جب بادبانی جہاز میں رمضان کا چاند نظر آیا تو حضرت نے اپنے رفقاء سفر سے فرمایا کہ آج سے تراویح شروع ہوگی، چناں چہ حضرت روزانہ ایک سوا پارہ یاد کرتے اور رات کو تراویح میں سنا دیتے، قدرتی طور پر حضرت نانوتویؒ کو اس واقعہ سے دلی مسرت ہوئی، جب جہاز مکہ پہنچا تو حضرت نے مسقط کا حلوہ خرید کر حاضرین میں تقسیم کیا اور اس طرح اپنی اس دلی مسرت کا اظہار فرمایا جو حفظ قرآن کی دولت ملنے پر حاصل ہوئی تھی۔

اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز واقعہ درسِ نظامی میں شامل منطق کی مشہور کتاب ''سلم العلوم'' کو دس دن میں حفظ کرنے اور بغیر پڑھے اس کا تکرار کرانے اور امتحان دینے کا ہے، دار العلوم دیوبند میں جب مولانا سلیم اللہ خاںؒ داخل ہوئے تو اس سال فن منطق کی کتاب ''میر قطبی'' پڑھی، جلال آباد میں آپ ''قطبی'' پڑھ کر آئے تھے، خواہش یہ تھی کہ اس سال ''سلم العلوم'' بھی پڑھ لیں، لیکن گھنٹوں کی ترتیب اس کی اجازت نہ دیتی تھی، سلم العلوم اپنی پیچیدہ عبارت اور مشکل مباحث کے باعث ہمیشہ طلبہ مدارس کے لیے دردِ سر بنی رہی ہے، اس وقت بھی یہی حال تھا، بہت سے طلبہ اس میں فیل ہوجاتے تھے، ایسے تمام طلبہ کو سالانہ امتحانات کے موقع پر دوبارہ امتحان دینے کا موقع دیا جاتا تھا، بہت سے طلبہ جو کسی دوسرے مدرسے سے سلم العلوم پڑھ کر آتے وہ بھی امتحان میں شریک ہوجاتے تاکہ اگلے سال انہیں وہ کتاب پڑھنی نہ پڑھے، مولانا سلیم اللہ خاں صاحبؒ نے بھی سلم العلوم کا امتحان دینے کی درخواست دی، امتحان میں صرف دس دن باقی تھے، ان دس دنوں میں آپ نے سلم العلوم حفظ کی اور اس کے مباحث اس طرح یاد کیے کہ پورے سال سلم العلوم پڑھنے والے طلبہ کو تکرار بھی کرایا، بلکہ ان طلبہ کو بھی تکرار کرایا جو اس کتاب میں فیل ہوگئے تھے اور اب وہ سند فضیلت حاصل کرنے

کے لیے اس کتاب کے امتحان میں شرکت کی غرض سے آئے تھے، نتیجہ نکلا تو جن دو طالب علموں نے اس کتاب میں سب سے زیادہ نمبر حاصل کیے ان میں ایک مولانا سلیم اللہ خانؒ تھے۔

حضرت مولانا سلیم اللہ خانؒ کی ذہانت کا حال یہ تھا کہ انھوں نے درسِ نظامی کا آٹھ سالہ نصاب ساڑھے چھ سال میں پورا کرلیا، اور دار العلوم میں اس شان سے پڑھا کہ ہر سال انہیں خصوصی انعامات سے نوازا جاتا تھا۔ (متاعِ وقت کاروانِ علم، ص: ۲۶۹)

حضرت مولانا سلیم اللہ خانؒ نے ۱۹۴۷ء میں دار العلوم دیوبند سے سند فراغت حاصل کی، فراغت کے بعد مدرسہ مفتاح العلوم جلال آباد میں خدمت تدریس پر مامور ہوئے جو آپ کا اوّلین مادر علمی بھی تھا، اس مدرسہ میں حضرت مولانا مسیح اللہ خانؒ کی زیر نگرانی تدریسی سفر شروع کیا جو تادم واپسیں جاری رہا، جلال آباد میں آپ نے آٹھ سال تک تدریسی خدمات انجام دیں۔

تقسیم ہند کے بعد ۱۹۵۵ء میں پاکستان تشریف لے گئے، وہاں تین سال دار العلوم الاسلامیہ اشرف آباد ٹنڈو الہ یار سندھ میں درس وتدریس میں مشغول رہے، یہ ادارہ شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کا قائم کیا ہوا تھا، یہاں سے حضرت مولانا مفتی محمد شفیع عثمانی صاحبؒ کے قائم کردہ مدرسہ دار العلوم کورنگی کراچی تشریف لے گئے اور مسلسل دس سال تک وہاں مختلف علوم وفنون کی کتابیں پڑھائیں، ایک سال حضرت مولانا محمد یوسف بنوریؒ کے جامعۃ العلوم الاسلامیہ میں رہے، جہاں بھی رہے درسِ نظامی کے ہر فن کی بڑی اور اہم کتابیں پڑھائیں، ۱۹۶۷ء میں اپنے ادارے جامعہ فاروقیہ کراچی کی بنیاد رکھی، جو آج پاکستان کے بڑے تعلیمی اداروں میں سے ایک ہے، اور بیرون ملک تک اس کی شہرت ہے، پاکستان کا یہ واحد مدرسہ ہے جہاں سے عربی، اُردو اور انگلش تینوں زبانوں میں ماہانہ رسائل شائع ہوتے ہیں، شاہ فیصل کالونی میں اس کی پُرشکوہ عمارت دعوتِ نظارہ دیتی ہے۔

بلاشبہ حضرت مولانا میدانِ تدریس کے شہسوار تھے، جہاں بھی رہے انھوں نے اس

فن کا حق ادا کیا، یہاں تک کہ تعطیلات میں بھی مشتاقان علم کی ایک جماعت کسب فیض کے لیے ان کے اردگرد اس طرح موجود رہتی تھی جس طرح پروانے شمع کے گرد چکر لگاتے رہتے ہیں، درس نظامی میں داخل کوئی کتاب ایسی نہیں ہے جوان کے زیر درس نہ رہی ہو، ایک زمانہ تک انھوں نے مکمل صحاح ستہ اور مشکوٰۃ شریف کی دونوں جلدیں خود پڑھائی ہیں، آج پورے پاکستان میں اور پاکستان سے باہر، ناروے، جرمنی، ساؤتھ افریقہ، سعودی عرب، کویت، قطر، عرب امارات، عمان، انگلینڈ، امریکہ، کناڈا، کوریا، افریقہ، فرانس، ملائیشیا، رنگون ہندوستان، بنگلہ دیش، ایران اور افغانستان میں بھی ان کے ہزاروں شاگرد موجود ہیں، پاکستان میں تو ان کا دائرہ بے حد وسیع ہے، مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی، مولانا مفتی محمد تقی عثمانی، مولانا شمس الحق، مولانا ڈاکٹر محمد حبیب اللہ مختارؒ، ڈاکٹر مفتی نظام الدین شامزئیؒ، مولانا عنایت اللہؒ، مولانا حمید الرحمٰنؒ، مولانا جمشید علی خاںؒ جیسے مشاہیر علماء آپ کے ممتاز تلامذہ میں شامل ہیں۔

دار العلوم دیوبند کے تعلیمی اور تدریسی مزاج کی ان پر گہری چھاپ تھی، اکابرین دیوبند سے ان کو بڑا تعلق تھا جس کا اظہار وہ اپنی درسی اور غیر درسی تقریروں میں کرتے رہتے تھے، دار العلوم میں ان کے قیام کی مدت اگر چہ ساڑھے چار سال ہے، مگر اس کم مدت میں بھی انھوں نے یہاں کے اساتذہ سے بھرپور استفادہ کیا، خود فرماتے ہیں ''میرے محسن استاذ جن کے تلمذ کے طفیل مجھے حدیث شریف سے مناسبت ہوئی اور اس سے تعلق ہوا وہ شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی نور اللہ مرقدہٗ ہیں، حضرت کا ترمذی شریف کا درس روزانہ دو دو اور ڈھائی ڈھائی گھنٹے اس شان سے ہوتا تھا کہ یہاں نظروں کو پھر وہ خوش گوار منظر کہیں دیکھنا نصیب ہی نہیں ہوا، حضرت کے درسِ ترمذی میں حدیث کے فنی مباحث پر سیر حاصل بحث ہوتی تھی، اسناد، جرح وتعدیل اور تطبیق وترجیح کی بحثیں، فقہی کلامی، تاریخی مسائل اور اخلاقی واصلاحی گفتگو بڑے بسط وتفصیل سے فرمایا کرتے تھے، صحاح ستہ اور دیگر کتب برابر میں رکھی رہتی تھیں، حوالے کی ہر بات کو کتاب کھول کر اور اس کی عبارت پڑھ کر بیان فرماتے تھے، طلبہ کے ہر قسم کے سوالات کا نہایت خندہ پیشانی سے تفصیلی جواب عنایت فرماتے، یہی درس ترمذی

احقر کی اس فن سے مناسبت کی بنیاد ہے۔‘‘(کشف الباری:۱/ ۵۸)

دار العلوم دیوبند کی ایک اور رجال ساز شخصیت استاذ الاساتذہ شیخ الادب والفقہ حضرت مولانا اعزاز علی امروہویؒ کے متعلق فرماتے ہیں کہ ’’شیخ الادب والفقہ کا ابوداؤد کا درس بھی معاون بنا، اوران کے درس سے بھی احقر نے بہت کچھ سیکھا، ترمذی شریف کتاب السیر سے آخر تک مع شمائل ترمذی بھی احقر نے حضرت شیخ الادب ہی سے پڑھی۔‘‘(حوالہ سابق)

یہ تو ان کی تدریسی زندگی کی تشکیل وتعمیر اور فن حدیث سے مناسبت کا پہلو ہے، لیکن نو عمری میں ان کی شخصیت جن مقدس اور مبارک ہاتھوں سے بنی سنوری وہ مسیح الامت حضرت مولانا مسیح اللہ خاں شیروانیؒ ہیں، اپنے اس عظیم محسن کے متعلق شیخ سلیم اللہ خاںؒ فرماتے ہیں:

’’میری زندگی میں سب سے زیادہ تبدیلی، دینی جذبات کی پرورش، اخلاق واعمال کے حسن وقبح کا احساس، ان کی اصلاح کی طرف توجہ اور ہمیشہ کے لیے اپنے آپ کو رجال دین میں شامل کرنے کا شوق اور جذبہ حضرت مولانا مسیح اللہ خاں صاحبؒ کی خدمت میں رہ کر پیدا ہوا۔‘‘(حوالہ سابق)

حضرت مولانا سلیم اللہ خاں صاحبؒ کی زندگی کا ایک اہم پہلو وفاق المدارس العربیہ پاکستان سے ان کی وابستگی ہے، اس وفاق کی بنیاد ۱۹۵۹ء میں رکھی گئی ۱۹۸۰ء میں آپ کو اس کا ناظم اعلیٰ بنایا گیا، اور مولانا محمد ادریس میرٹھیؒ کی وفات کے بعد ۱۹۸۹ء میں آپ کو اس کا صدر منتخب کیا گیا، اس منصب پر وہ آخر تک فائز رہے، وفاق المدارس العربیہ دیوبند کے طرز پر چلنے والے مدارس کا پاکستان میں سب سے بڑا تعلیمی بورڈ ہے جو خود مختار ادارے کی حیثیت سے کام کرتا ہے، اس وقت اس وفاق سے دیوبند مکتب فکر کے انیس ہزار پانچ سو چار مدارس اور جامعات منسلک ہیں، ان مدارس میں ایک لاکھ چودہ ہزار چار سو چالیس اساتذہ خدمت تدریس پر مامور ہیں اور تین لاکھ چھ ہزار دو سو اناسی طلبہ وطالبات زیر تعلیم ہیں، وفاق المدارس سے اب تک فارغ التحصیل ہونے والے علماء کی تعداد ایک لاکھ انیس ہزار آٹھ سو بانوے اور عالمات کی تعداد ایک لاکھ پچاس ہزار اٹھائیس اور حفاظ کی تعداد نو لاکھ پچیس ہزار

ایک سو بانوے ہے۔

مولانا سلیم اللہ خاںؒ کے دورِ صدارت میں وفاق المدارس کا دائرۂ عمل وسعت اختیار کرگیا ہے، ملحقہ مدارس کی تعداد میں قابل قدر اضافہ ہوا، نصاب کی پابندی ہوئی، مدارس میں درجہ بندی لازمی ہوئی، پہلے صرف مرحلہ عالمیہ (دورۂ حدیث) کا امتحان وفاق کے تحت ہوتا تھا، اب تمام مراحل کے امتحانات ہونے لگے، وفاق کے انتظامی امور میں بھی مثبت تبدیلیاں آئیں، اس کی کارکردگی بہت بہتر ہوگئی اور اس کی سندیں جامعات کی اعلیٰ سندوں کے مساوی قرار پائیں۔

پاکستان میں مولانا سلیم اللہ خاںؒ جرأت وشجاعت، بے باکی اور حق گوئی کی علامت سمجھے جاتے تھے، حالات کتنے ہی حوصلہ شکن کیوں نہ ہوں مگر وہ پیش آنے والے حالات وواقعات کے سامنے چٹان بن کر کھڑے ہو جاتے تھے۔ مدارسِ عربیہ کو بارہا مشکل حالات سے گزرنا پڑا مگر وہ اپنی دوراندیشی، تدبر اور حوصلہ مندی سے ان مشکل حالات کی دلدل سے مدارس کو نکال کر لے گئے، نائن الیون کے بعد حالات بڑے سخت اور صبر آزما تھے، حکومت پاکستان پر غیر ملکی دباؤ تھا، ذرائع ابلاغ مخالفت میں کھڑے ہوئے تھے، لال مسجد جیسا واقعہ پیش آچکا تھا، سب کی انگلیاں مدرسوں کے نصاب اور نظام پر اٹھ رہی تھیں، ایسے میں مولانا سلیم اللہ خاںؒ نے وفاق کے اسٹیج سے قائدانہ رول ادا کیا، اور حسن تدبر کے ساتھ مدارس کو اس کٹھن دور سے نکالا۔

بعض اوقات ان کے طول طویل تعلیمی اور اصلاحی دورے ہوتے، رات دن جلسوں میں شرکت کرتے، تقریریں کرتے، کانفرنسوں اور سمیناروں کی صدارت کرتے اور جامعہ فاروقیہ پہنچتے ہی بخاری شریف پڑھانے بیٹھ جاتے، جہد مسلسل کا یہ انداز انھوں نے اپنے اُستاذِ گرامی قدر شیخ الاسلام حضرت مدنیؒ سے سیکھا تھا، لوگ انہیں پاکستان میں حضرت مدنیؒ کا عکس جمیل کہا کرتے تھے۔

حضرت مولانا سلیم اللہ خاںؒ تصنیف وتالیف کے میدان کے آدمی نہیں تھے، ان کی

تصانیف وتالیفات ان کے وہ ہزاروں تلامذہ ہیں جو درس وتدریس کے ساتھ تصنیف وتالیف میں بھی لگے ہوئے ہیں، ایسے ہی ان کے دوممتاز شاگردوں نے ان کی تقریر بخاری کو محقق اور مرتب ومدون کرکے ایسا کام کیا ہے جو رہتی دنیا تک خود اُن کا اور ان کے شیخ کا نام زندہ رکھے گا۔

حضرت نے سال ہا سال تک بخاری شریف کا درس دیا ہے، پچیس سال کے مسلسل درس کے بعد یہ درسی تقریریں ٹیپ کی گئیں، تمام اسباق چار سو کیسٹوں میں محفوظ کیے گئے، پھر ان کیسٹوں کو حضرت نے خود سنا، اس کے بعد یہ اسباق تحریر میں لائے گئے، جلد اوّل کی تحقیق اور مراجعت کا کام مولانا نور البشر صاحب اور جلد ثانی کی مراجعت اور تحقیق کا کام مولانا ابن الحسن عباسی کے سپرد کیا گیا، ان دونوں حضرات نے تقریر کے ہر ہر جزء کی مراجعت کی، حوالے تلاش کیے، عنوانات لگائے، اور اب درسی تقریر بائیس جلدوں میں ''کشف الباری'' کے نام سے پاکستان کے ساتھ ساتھ ہندوستان میں بھی چھپ چکی ہے، ہندوستان میں اس کی طباعت کا شرف دار الکتاب دیوبند کو حاصل ہوا ہے، یہ کتاب اپنی گوناگوں خصوصیات کی وجہ سے علمی حلقوں میں بے حد مقبول ہے، حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی نے ''کشف الباری'' کے متعلق لکھا ہے ''جب میں نے پہلی جلد سرسری مطالعہ کی نیت سے اٹھائی تو اس نے مجھے خود مستقل طور پر اپنا قاری بنا لیا، اپنے درس بخاری کے دوران جب فتح الباری، عمدۃ القاری، شرح ابن بطال، فیض الباری، لامع الدراری اور فضل الباری کا مطالعہ کرنے کے بعد کشف الباری کا مطالعہ کرتا تو ظاہر ہوتا کہ اس کتاب میں مذکورہ تمام کتابوں کے مباحث دل نشیں تفہیم کے ساتھ اس طرح یک جا ہو گئے ہیں جیسے ان کتابوں کا لب لباب سمٹ آیا ہو اور اس کے علاوہ بھی بہت سے مسائل اور مباحث اس پر مستزاد ہیں۔'' (کشف الباری: ۱/ ۲۷)

یہ محض ایک شاگرد کا اپنے استاذ کی کتاب کو خراج تحسین نہیں ہے بل کہ ایک بلند پایہ محقق اور محدث کا دوسرے بلند پایہ محقق اور محدث کی کاوشوں کی تحسین وستائش ہے۔

جیسا کہ پہلے بھی عرض کیا گیا کہ مولانا سلیم اللہ خاں شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین

احمد مدنیؒ کے ارشد تلامذہ میں سے ہیں، انہوں نے دارالعلوم دیوبند میں حضرت مدنیؒ کے درسِ حدیث سے پوراپورا استفادہ کیا ہے اوران کے خوان علم سے بھر پور طریقہ پر خوشہ چینی کی ہے، کشف الباری دراصل حضرت مدنیؒ کی درسی خصوصیات کو سمیٹنے اور پھیلانے کی ایک علمی کوشش ہے جسے پاک وہند سمیت دنیا بھر کے حلقوں میں پذیرائی ملی ہے۔

حضرت مولانا سلیم اللہ خانؒ نے حضرت مدنیؒ کے درسِ بخاری کی خصوصیات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے ''کہ حضرت کی تقریر نہایت سلیس، شستہ اوراس کی رفتار بہت دھیمی ہوتی تھی، ایک ایک لفظ واضح بآواز بلند زبان مبارک سے نکلتا تھا، مشکل مقامات نہایت سادہ طرز میں مثالیں دے کر حل فرماتے تھے، جب کسی مسئلہ میں حدیث کی توجیہ بیان فرماتے اور توجیہات متعدد ہوتیں تو ہر ایک توجیہ کو الگ الگ شمار کرتے تھے، کتب حدیث کا مکمل سیٹ آپ کے پاس رکھا ہوتا تھا، تمام فقہاء کے دلائل کو کتاب کھول کر سناتے، کسی امام کی دلیل کو حوالہ کتب کے بغیر نہ چھوڑتے تھے، سند پر حسب ضرورت بحث فرماتے اور علماء کے جرح وتعدیل کے اقوال نقل فرماتے تھے، حدیث کا مفہوم وضاحت کے ساتھ اس طرح سمجھاتے کہ وہ طلبہ کے ذہن نشین ہو جاتا تھا، اگر حدیث پر کوئی اعتراض وارد ہوتا تو اعتراض کی تشریح فرما کر مستند قوی جوابات بیان فرماتے، مشکل مقامات پر اگر ضرورت ہوتی نحوی ترکیب ذکر کرتے تھے اور مشکل الفاظ کے ضمن میں شعراءعرب کا کلام تائید میں پیش کرتے تھے، فرضیت احکام کی تاریخ بیان فرماتے تھے، فرق حقہ اور فرق باطلہ کے عقائد کی دل نشیں تشریح فرماتے اور پھر احقاق حق اور ابطال باطل میں کوئی کسر نہ چھوڑتے تھے، اختلافی مسائل میں ہر امام کے دلائل بیان فرما کر آخر میں مذہب احناف کی حدیث کے ساتھ مطابقت اس طرح بیان کرتے تھے کہ معلوم ہوتا تھا کہ حنفی مذہب احادیث نبویہ کے بالکل مطابق ہے اور امام اعظمؒ کو تفقہ فی الدین میں وہ کامل دست گاہ حاصل ہے جو کسی امام فقہ کو حاصل نہیں ہے، بخاری شریف کے درس میں عقائد وایمان کے مباحث بسط وتفصیل کے ساتھ ارشاد فرماتے تھے، مغازی کے درس کا لطف یہ تھا کہ حضرت عرب کے جغرافیہ سے واقف تھے اس لیے مقامات جہاد کا جغرافیہ بڑی

وضاحت سے بیان فرماتے تھے، احادیث متعارضہ میں تطبیق کا پورا پورا اہتمام ہوتا تھا، خواہ تعارض روایت کرنے والوں کی وجہ سے پیش آیا ہو، یا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول وفعل کا اختلاف ہو، پہلے تطبیق دی جاتی، وہ نہ ہوتو دلائل سے ترجیح کا طریقہ اختیار کیا جاتا، کتاب التفسیر میں مختصر آیت پوری تلاوت فرماتے۔'' (ملخصاً کشف الباری:۱/۹۴، ۹۵)

''کشف الباری'' میں صاحب افادات نے حضرت مدنیؒ کے اسلوبِ درس کی مکمل اِتباع کی ہے اور ساتھ ہی اپنے سال ہا سال کے مطالعہ سے اس اسلوب کو نئی جہتیں دینے کی کوشش بھی کی ہے، پوری کتاب کا کوئی ایک صفحہ کھول لیجیے، علم کا بہتا ہوا دریا نظر آتا ہے، اس میں ترجمۃ الباب کی مفصل تشریح کے ساتھ ساتھ ترجمۃ الباب اور احادیث کے درمیان مطابقت کی نفیس توجیہات بھی ہیں، ماقبل اور مابعد کے تراجم کے ساتھ پیش نظر ترجمۃ الباب کا کیا ربط ہے، متشابہ تراجم میں کیا فرق ہے، اس کتاب میں ان سوالوں کا اور اسی طرح کے دوسرے سوالوں کا جواب بھی ملتا ہے، ساتھ ہی وہ راویوں کا بہ قدر ضرورت تعارف بھی کراتے ہیں، جن راویوں کے ناموں میں اشتباہ پیش آتا ہے اس کی نشان دہی بھی کرتے ہیں، جن راویوں سے بخاری شریف میں صرف ایک یا دو روایات ہیں ان کے نام بھی بتلاتے ہیں اور ان کی روایات کا حوالہ بھی دیتے ہیں، رجال بخاری میں جن حضرات پر محدثین نے کلام کیا ہے اس کا علمی طور پر منصفانہ جائزہ بھی لیتے ہیں، مکرر روایات میں یہ بتلاتے ہیں کہ تکرار سند ومتن کے اتحاد کے ساتھ ہوا ہے یا ان دونوں میں سے کسی اختلاف کے ساتھ، مذاہب فقہاء کے استقصاء کا اہتمام اور ان کی تنقیح، فقہی مذاہب کے بیان کے لیے اصل ماخذ کے حوالے کا اہتمام، مسائل فقہیہ کی آسان طریقہ پر تفہیم وتشریح، فقہاء ومحدثین کے اقوالِ مختلفہ کے درمیان محاکمہ، معلقات کے باب میں یہ بتلانے کا اہتمام کہ مصنف یا کسی دوسرے محدث نے ان کو موصولاً کہاں روایت کیا ہے، آثار موصولہ میں اس بات کی نشان دہی کہ کس محدث نے ان کو موصولاً ذکر کیا ہے، حسب موقع امام بخاری کے اوہام پر تنبیہ، بعض تراجم اور دیگر مواقع پر موجود ابہام کی وضاحت، قال بعض الناس کا مالہ وما علیہ کے ساتھ ذکر، صحیح بخاری میں کہیں باب ہے

ترجمہ نہیں، کہیں ترجمہ ہے حدیث نہیں بلکہ آیت مذکور ہے، کہیں نہ حدیث ہے اور نہ آیت بلکہ صرف ترجمہ مذکور ہے، ایسے مواقع پر تشفی بخش کلام، سند میں تحویل آجانے کی صورت میں یہ اہتمام کہ یہاں جو حدیث مذکور ہے وہ سند اول کی روایت ہے یا سند ثانی کی، نیز اس بات کی تصریح کہ دوسری سند جس کی روایت یہاں مذکور نہیں اس کو مصنف نے کہاں بیان کیا ہے؟

یہ وہ خصوصیات ہیں جو مولانا سلیم اللہ خاںؒ کے درسِ بخاری کو دوسری شروح سے ممتاز کرتی ہیں، اور اس سے حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی کے اس قول کی تائید ہوتی ہے ''اس وقت صحیح بخاری کی جتنی تقاریر اُردو میں دستیاب ہیں ان میں یہ تقریر اپنی نافعیت اور جامعیت کے لحاظ سے سب پر فائق ہے۔''

حضرت کی تقریر کے تحقیقی معیار کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ کہیں کوئی بات بلا حوالہ نہیں کی گئی ہے، کتاب کے آخر میں مآخذ ومراجع کی جو فہرست دی گئی ہیں اس میں ہرفن کی دوسو اکتیس کتابوں کے نام شامل ہیں ان میں بخاری اور دوسری کتب حدیث کی شروح بھی ہیں، فقہاء مذاہب کی کتابیں بھی ہیں، تفسیری ذخیرہ بھی ہے، اسماء رجال کی کتب بھی ہیں، عقائد، سیرت اور تاریخ، اسرار وحکم کون سا فن ایسا ہے جس کی بنیادی کتابیں مراجع ومآخذ کی اس فہرست میں موجود نہیں ہیں۔

مشکوٰۃ شریف کی درسی تقریر بھی ''نفحات التنقیح'' کے نام سے تین جلدوں میں چھپ چکی ہے اور اس خبر سے حدیث کے طلبہ کو یقیناً خوشی ہوگی کہ ان کی تقریر ترمذی بھی دس جلدوں میں تیار ہے، صرف طباعت باقی ہے، اس ضعیفی اور کبرسنی میں بھی وہ ذہنی طور پر پوری طرح مستعد اور چاق چوبند تھے، حالاں کہ جسمانی طور پر معذور ہو چکے تھے، حال ہی میں انھوں نے بیماری اور ضعف کے باوجود تبلیغی جماعت کے قضیے میں جس بیدار مغزی کا ثبوت دیا ہے، اور مولانا محمد سعد سمیت تمام اکابرین دیو بند کو جس کرب اور دل سوزی کے ساتھ خطوط لکھے ہیں اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ اُمت مسلمہ کے احوال سے پوری طرح باخبر رہتے تھے اور پیش آنے والے مسائل کو حل کرنے میں پوری دل چسپی بھی لیتے تھے۔

بچپن ہی سے مولانا سلیم اللہ خاںؒ کا نام سنتے آرہے ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ دیوبند کے پڑھے ہوئے تھے، دیوبند کے قریب ایک بستی کے رہنے والے تھے، جلال آباد میں استاذ تھے، جہاں میرے والد اور دادا دونوں عرصۂ دراز تک مدرّس رہے، یہ رشتہ ہمارے والد محترم حضرت مولانا واجد حسینؒ شیخ الحدیث جامعہ تعلیم الدین ڈابھیل گجرات اور حضرت مولانا سلیم اللہ خاںؒ کی دوستی اور باہمی تعلق کا سبب بنا، دار العلوم دیوبند کے اجلاس صد سالہ کے موقع پر مولانا سلیم اللہ خاںؒ اپنے قافلہ کے ہمراہ ہمارے گھر پر ہی ٹھہرے، ان دنوں ان کو قریب سے دیکھنے اور ان کی خدمت کرنے کا کچھ موقع میسر آیا، حضرت اپنے ساتھ پاکستان سے فتاویٰ عالمگیری، فتاویٰ شامی، بدائع الصنائع، البحر الرائق وغیرہ کے کچھ سیٹ لے کر آئے تھے، جو میں نے اجلاس صد سالہ کے دوران اپنے بک اسٹال پر رکھے، کچھ کتابیں اس وقت فروخت ہوئیں اور کچھ بعد میں، لوہاری کے قاری عزیز الرحمٰن اس تجارت میں ہمارے درمیان واسطہ کا کام کررہے تھے، ان کے انتقال کی خبر سن کر وہ تمام مناظر نگاہوں کے سامنے آگئے، کتنی سادگی تھی اور کس قدر منکسر المزاج تھے، اس کا اندازہ ان چند ملاقاتوں میں ہوا۔

ابھی حال ہی میں حضرت کی ایک کتاب نظر سے گزری جو ''تسہیل الادب'' کے نام سے پاکستان میں چھپی ہے، اس کے پیش لفظ میں حضرت نے اس حقیر کا ذِکرِ خیر کیا ہے اور میری تالیف کردہ کتاب ''معلم العربیہ'' کا حوالہ دیا ہے جو میرے لیے بڑی سعادت کی بات ہے۔

حضرت مولاناؒ کا اِنتقال پاکستان ہی کے لیے نہیں ہندوستان کے اہل علم اور مدارس کے لیے بھی بڑا تکلیف دہ حادثہ ہے، جس کا اِظہار علمی اور دینی حلقوں کی طرف سے مسلسل ہورہا ہے، بلاشبہ حضرت کے اُٹھ جانے سے دینی اور علمی حلقوں میں جو خلاء پیدا ہوا ہے وہ آسانی سے پُر ہونے والا نہیں ہے۔

حزن وملال کا سال

سیرت، حدیث اور تاریخ کی کتابوں میں عامُ الحزن کا ذِکر ملتا ہے، ابھی سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم مکہ مکرمہ ہی میں تشریف فرما تھے، قریش مکہ کے ظلم وستم کا سلسلہ دراز سے دراز تر ہوتا جارہا تھا کہ ہجرت سے تین سال پیشتر اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی دو محبوب ہستیوں نے داغِ مفارقت دیا، ان میں سے ایک آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مشفق چچا حضرت ابوطالب تھے، جنہوں نے اپنی زندگی کے آخری لمحہ تک اپنے عزیز بھتیجے کا سگی اولاد سے بڑھ کر خیال رکھا، اس کے اور زمانہ کے ظلم وستم کے درمیان چٹان بن کر کھڑے رہے، دُوسری شخصیت اُمّ المؤمنین حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کی تھی جنہوں نے اپنی جان و مال سے چمن اِسلام کی آب یاری کی اور جب تک زندہ رہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہر طرح کے غمِ کائنات اور فکرِ حیات سے بے نیاز رکھا، اِتفاق سے یہ دونوں شخصیتیں یکے بعد دیگرے دنیا سے چلی گئیں، قدرتی طور پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں کی جدائی کا بہت زیادہ دکھ محسوس کیا، یہاں تک کہ آپ نے ان دونوں کی وفات کے سال کو رنج وغم کا سال قرار دے کر دنیائے انسانیت کو ایک نئے لفظ سے آشنا کیا، اس وقت سے جب لوگ کسی برس اپنی اجتماعی اور انفرادی زندگی میں پے بہ پے حادثات سے دوچار ہوتے ہیں تو اسے ''عامُ الحزن'' کہتے ہیں، ۲۰۱۷ء کا سال بھی مدارس کے طلبہ وعلماء کے لیے حزن وملال کا سال ہے، کیوں کہ اس سال کئی اہم علمی شخصیتوں نے راہِ آخرت کی مسافرت اختیار کرلی ہے۔

جانا سب کو ہے، کسی کا وقت رحیل آچکا، کوئی اذنِ سفر کے اِنتظار میں ہے، یہ دنیا آنے جانے والوں سے اسی طرح آباد رہے گی، بالآخر فنا ہوجائے گی، بعض جانے والے محفلِ ہست وبود سے کچھ اس طرح خاموشی کے ساتھ اٹھ کر چل دیتے ہیں کہ کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوتی، نہ ان کی یاد میں کوئی آنکھ اشک بار ہوتی ہے، نہ کوئی دل بے قرار ہوتا ہے، بعض لوگ اس طرح رخصت ہوتے ہیں کہ ان کی جدائی کے غم سے آنکھیں ہی نہیں دل بھی روتے ہیں، ان کی وفات کی خبر خرمنِ ہستی پر صاعقہ بن کر گرتی ہے اور دور دور تک لوگ اس کا اثر محسوس کرتے

ہیں، کسی کا آفتابِ زندگی مشرق میں غروب ہوتا ہے تو مغرب میں تاریکی چھا جاتی ہے، شمال میں ڈوبتا ہے تو جنوب میں اس کا اثر دکھائی دیتا ہے، یہ رنج اس وقت اور گہرا ہو جاتا ہے جب جانے والوں کا تعلق علم وعمل کی دنیا سے ہو، موت العالِم موت العالَم (عالِم کی موت عالَم کی موت ہے) کی صحیح تفسیر اس وقت سمجھ میں آتی ہے جب کہیں کسی افق میں کوئی آفتابِ علم غروب ہوتا ہے، موت ایک تلخ سچائی ہے اور ہر ذی نفس کو اس سچائی کا سامنا کرنا ہے، جو لوگ رخصت ہوئے ہیں انہیں جلد یا بہ دیر رخصت ہونا ہی تھا، مگر ان حضرات کے جانے سے جہاں یہ غم ہے کہ یہ لوگ علم وعرفان کی محفلوں سے دفعتاً اُٹھ کر چلے گئے وہاں یہ غم بھی ہے کہ ان کے جانے سے جو جگہیں خالی ہو رہی ہیں ان کو پُر کرنے والا کوئی نہیں ہے، اس لیے ہر ایسا حادثہ وفات **غـمًّا بغمّ** کی تفسیر بن کر رونما ہوتا ہے، بعض مرتبہ یہ خیال آتا ہے کہ کہیں یہ وہ دور تو نہیں آ گیا جس کے متعلق نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تھا: **یذهب الصالحون الاول فالاول ویبقی حفالة کحفالة الشعیر او التمر لا یبالیهم الله بالة.** (بخاری رقم الحدیث: ۶۰۷۰) (نیک لوگ یکے بعد دیگرے اُٹھتے چلے جائیں گے اور جو یا کھجور کے کباڑ کی طرح بے کار لوگ باقی رہ جائیں گے جن کی اللہ کو ذرا پرواہ نہ ہوگی)۔

سال رواں میں متعدد اہل علم اس دنیا سے رخصت ہوئے ہیں، ان میں بہت سے علم وعمل کی دنیا میں شہرتِ دوام کے حامل تھے، دار العلوم دیوبند کے ایک بڑے استاذ کا ایک مقولہ پورے سال سے گردش میں ہے، اور ان دنوں کچھ زیادہ ہی وہ مقولہ نوکِ قلم پر بھی ہے اور نوکِ زبان پر بھی کہ یہ سال علماء کی وفات کا سال ہے، نہ جانے مولانا موصوف نے کس جذبے کے عالم میں یہ بات کہہ دی کہ واقعتاً یہ سال علماء کی وفات کا سال بن گیا، اور ابھی پانچ مہینے باقی ہیں، اللہ سے دُعا ہے کہ وہ حضرات علماء کرام کی عمروں میں برکت عطا فرمائے کہ ان کے وجود سے علم کی دنیا میں رونقیں قائم ہیں۔

وفات العلماء کا یہ غم انگیز سلسلہ حضرت مولانا شیخ عبد الحق اعظمیؒ کے سانحۂ ارتحال سے شروع ہوا، موصوف دار العلوم دیوبند میں شیخ ثانی کے منصب پر فائز تھے اور بخاری شریف

کی دوسری جلد کا درس دیا کرتے تھے، عابدِ شب زندہ دار، سادگی کے پیکر، متواضع اور منکسر المزاج، شیخ الاسلام حضرت مولانا سیّد حسین احمد مدنیؒ کے شاگردِ رشید اور شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا مہاجر مدنیؒ کے مجازِ بیعت، نوے (۹۰) برس کی عمر پائی، جسمانی عوارض کے باوجود آخر وقت تک درس وتدریس سے وابستہ رہے جو چھ دہائیوں کو محیط تھا، دوسرا حادثہ کراچی پاکستان میں پیش آیا، دار العلوم دیوبند کے مایہ ناز فرزند شیخ الاسلام حضرت مدنیؒ کے تلمیذ حضرت مولانا سلیم اللہ خانؒ تقسیم ہند کے بعد لوہاری ضلع مظفرنگر یوپی سے ہجرت کرکے پاکستان چلے گئے تھے، کچھ عرصہ تک مختلف مدارس سے وابستہ رہے، پھر جامعہ فاروقیہ کی بنیاد ڈالی، جواب پاکستان کے بڑے جامعات میں شمار کیا جاتا ہے، ہزاروں شاگرد دنیا بھر کے ملکوں میں پھیلے ہوئے ہیں، ان میں سے بہت سے شاگرد شہرت کے آسمان پر آفتاب وماہتاب بن کر چمک رہے ہیں، پاکستان میں فکر دیوبند سے وابستہ مدارس کی تنظیم ''وفاق المدارس العربیہ'' کے صدر تھے، مولانا کا شمار پاکستان کے ممتاز، جید اور بااثر علماء میں ہوتا تھا، مدارس کی روایات کا تحفظ ان کا مشن تھا، ایک لمبے عرصے تک بخاری شریف کا درس دیتے رہے، ان کے شاگردوں نے یہ درس کتابی شکل میں جمع کیا ہے، ''کشف الباری'' کے نام سے بیس جلدیں چھپ چکی ہیں، اور کئی ہنوز زیرِ طبع ہیں، مولانا مفتی محمد تقی عثانی نے کشف الباری کے متعلق یہ رائے ظاہر کی ہے کہ اس پائے کی کتاب اُردو میں تو کیا عربی میں بھی موجود نہیں ہے، مولانا سلیم اللہ خانؒ نے ۱۶/ جنوری ۲۰۱۷ء کو کراچی میں وفات پائی اور وہیں جامعہ فاروقیہ کے قبرستان میں مدفون ہوئے۔

مولانا عبد الحفیظ مکیؒ انٹرنیشنل ختم نبوت مومنٹ کے امیر تھے، مدینہ منورہ کے ایک قدیم مدرسے میں بخاری شریف کا درس دیا کرتے تھے، حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ کے شاگرد بھی تھے اور ان کے خلیفہ مجاز بھی، نہایت متحرک اور فعال شخصیت تھے، علوم دینیہ کے فروغ کے لیے ہمہ وقت سرگرم عمل رہا کرتے تھے، دعوتی سفر پر افریقہ میں تھے کہ ۱۸/ جنوری ۲۰۱۷ء کو وقت موعود آپہنچا، نمازِ جنازہ مسجد نبوی میں ادا کی گئی اور جنت البقیع میں

دفن ہونے کی سعادت حاصل کی۔

مولانا ریاست علی بجنوریؒ کا شمار بھی دارالعلوم دیوبند کے ممتاز علماء اور فضلاء میں کیا جاتا ہے، حضرت شیخ فخر الدین مرادآبادیؒ کے شاگرد تھے، بل کہ یہ کہا جائے تو زیادہ بہتر ہوگا کہ وہ اپنے استاذ کے علوم ومعارف کے امین اور ترجمان تھے، کئی سال تک اپنے استاذ کے درس بخاری میں شریک رہے، اور ان کے دروس ضبط تحریر میں لاتے رہے، جو ایضاح البخاری کے نام سے دس جلدوں میں چھپ چکے ہیں، اور ابھی ان کی طباعت کا سلسلہ جاری ہے، مولانا ریاست علی بجنوریؒ دارالعلوم دیوبند میں اُستاذِ حدیث تھے، بہترین مدرس، اُردو کے شگفتہ نثر نگار، قادرالکلام شاعر، باغ و بہار طبیعت کے حامل، مہمان نوازی میں بے مثال، فکر وتدبر اور اصابت رائے میں بے نظیر، مولانا کے مفاخر میں یہ بات شامل ہے بلکہ سرفہرست ہے کہ وہ ترانہ دارالعلوم کے خالق ہیں، افسوس ۲۰/ مئی ۲۰۱۷ء کو ہم سے جدا ہو گئے۔

مولانا نسیم احمد غازیؒ مظاہر علوم سہارنپور کے فیض یافتہ تھے اور عرصۂ دراز سے مراد آباد کے معروف ادارے جامع الہدی میں بخاری شریف پڑھا رہے تھے، مفتی مظفر حسین سہارن پوریؒ سے اجازتِ بیعت حاصل تھی، اچھے معلم، ماہر مدرّس، شعلہ بیان مقرر، سنجیدہ مصنف اور محقق، بہترین شاعر، حق گو حق پسند، کئی کتابیں لکھیں، افسوس مولانا بھی چند روز قبل ۸/ جولائی ۲۰۱۷ء کو وفات پا گئے۔

اس سلسلۃ الذہب کی آخری کڑی شیخ یونس جونپوریؒ تھے، جن کی وفات کا حادثہ کل ۱۱/ جولائی ۲۰۱۷ء کی صبح کو سہارن پور میں پیش آیا، شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ کے شاگرد، خلیفہ مجاز اور مظاہر علوم میں ان کے جانشین تھے، چالیس سال تک بخاری شریف کا درس دیتے رہے، حدیث پر بڑی عمیق نظر تھی، اس پائے کا محدث کوئی دوسرا نظر نہیں آتا، وہ بجا طور پر ہمارے زمانہ کے امیر المؤمنین فی الحدیث تھے، فن حدیث میں ان کے تحریری مباحث ”الیواقیت الغالیہ“ کے نام سے کئی جلدوں میں چھپ چکے ہیں، حال ہی میں ”نبراس الساری الی ریاض البخاری“ کے نام سے بخاری شریف پر ان کی تحقیقات کی اشاعت کا

سلسلہ بھی شروع ہوا ہے۔

نام تو اور بھی کئی ہیں، اور ان میں بعض نام نہایت اہم بھی ہیں مگر راقم نے پانچ بزرگوں کا اس لیے انتخاب کیا ہے کہ ان میں کئی باتیں قدرِ مشترک کے طور پر پائی جاتی ہیں، مدارس سے مکمل وابستگی، علوم دینیہ کی اشاعت میں پورا انہماک، زندگی کے آخری لمحات تک درس دینے کا مشغلہ، بخاری شریف کے ساتھ حد درجہ شغف، بلاواسطہ شاگروں کا عدد ہزاروں سے اور بالواسطہ شاگردوں کی تعداد لاکھوں سے متجاوز، علوم حدیث کی تحریری خدمت، یہ وہ خصوصیات ہیں جو ان بزرگوں کو علم وعمل کی تاریخ میں ہمیشہ زندہ رکھیں گی، اور آنے والی نسلیں ان کے نقش قدم پر چلنے کو سعادت تصور کریں گی۔